پاکستان اور بیرونی ممالک
کے معاشرتی اشتراکات اور اختلافات
ابنِ انشا کے سفرناموں میں

(تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل)

مقالہ نگار
ارم ناز
رول نمبر: F-59
رجسٹریشن نمبر: 59-FLL/MSURDU/F09

نگران
ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

International Islamic University
CENTRAL LIBRARY
Islamabad

شعبۂ اردو
کلیۂ زبان و ادب
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Accession No. Th 13886

MS
891.439
ادیب
سفرنامہ

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: ***Irum Naz***

Title of the Thesis: پاکستان اور بیرونی ممالک کے معاشرتی اشتراکات اور اختلافات ابن انشاء کے سفر ناموں میں

Registration No: ***59-FLL/MSUrdu/F09***

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of language & Literature, International Islamic University, Islamabad in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE	
External Examiner: **Dr. Rubina Shahnaz** Head, Department of Urdu NUML, H-9, Islamabad.	***Internal Examiner:*** **Dr. Saira Batool** Assistant Professor Department of Urdu (F.C), IIUI
Supervisor: **Dr. Aziz Ibnul Hassan** Assistant Professor Department of Urdu (Male), IIUI	

****

Chairperson
Department of Urdu

Chairperson Urdu Department
International Islamic University
Islamabad

Dean
Faculty of Language & Literature

Dean
Faculty of Languages & Literature
International Islamic University
Islamabad

صداقت نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ ارم ناز، رجسٹریشن نمبر59-FLL/MSURDU/F09 نے اپنا مقالہ بعنوان **''پاکستان اور بیرونی ممالک کے معاشرتی اشتراکات اور اختلافات ابن انشا کے سفر ناموں میں''** برائے ایم فل اُردو، میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ اس موضوع پر کہیں اس طرح کا کام نہیں ہوا اور میرے علم کی حد تک یہ سرقے سے پاک ہے۔

10.11.2014

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

فہرست ابواب

پیش لفظ

باب اول: اردو سفر نامہ ا۔۴۰

پس منظر، اردو سفر نامے کا آغاز وارتقا: اردو سفر نامے کی ابتدا...... عہد سرسید کے سفر نامے...... سفر نامے کا عبوری دور...... عہد حاضر میں سفر نامہ
ابن انشا سوانحی خاکہ: وطن، بچپن کا زمانہ...... ابتدائی تعلیم...... انشا رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے...... میٹرک کے امتحان میں امتیازی پوزیشن...... بٹھنڈہ میں فکر معاش...... لاہور میں حمید نظامی تک رسائی...... انبالہ چھاؤنی میں عارضی ملازمت...... فاضل ادیب، فاضل منشی اور بی اے کے امتحان میں کامیابی...... دہلی آمد...... آل انڈیا ریڈیو سے پاکستان ریڈیو منتقلی...... ریڈیو پاکستان کے شعبہ خبر کی لاہور سے کراچی منتقلی...... پہلی دستور ساز اسمبلی میں عارضی ملازمت...... پہلی بیوی سے مستقل علیحدگی...... صحافی محمد اختر سے ملاقات...... اعلیٰ تعلیم...... پہلے شعری مجموعے چاند نگر ۱۹۵۵ء کی اشاعت...... عشق...... بطور مترجم خدمات...... نیشنل بک سنٹر اور یونیسکو میں فرائض کی انجام دہی...... یونیسکو میں خدمات...... والد کی وفات...... دوسری شادی...... والدہ کی وفات...... دوسرے شعری مجموعے اس بستی کے اک کوچے میں ۱۹۷۶ء کی اشاعت...... بیماری اور علاج...... وفات
ابن انشا کی دیگر تخلیقی جہات: انشا بطور شاعر...... انشا بطور سفر نامہ گار...... ابن انشا کے سفر ناموں کی جغرافیائی تقسیم

باب دوم: مشرق بعید کے سفر نامے ۴۱۔۱۲۷

وقت...... جغرافیہ...... دریا...... پہاڑ اور چوٹیاں...... متصل مقامات اور حدود اربعہ...... موسم اور آب وہوا...... آبادی...... باشندے...... خوراک...... عادات واطوار...... ادب وآداب...... اخلاقی اقدار...... انداز فکر...... ہوٹل اور سرائیں...... تفریح کے مختلف ذرائع اور تفریحی مقامات...... ذرائع آمدورفت...... علاج معالجہ...... نظام تعلیم...... سیاسی نظام...... عدالتی نظام...... معاشی نظام...... مذہب...... شہر اور دیہات...... سڑکیں...... بازار...... محنت کش طبقہ...... آثار قدیمہ...... جانور...... صحافت...... زبان...... فنون لطیفہ

باب سوم: مشرق وسطیٰ کے سفر نامے ۱۲۸۔۱۸۶

موسم اور آب وہوا...... آبادی...... باشندے...... لباس...... خوراک...... عادات واطوار...... اخلاقی اقدار...... سماجی اقدار...... رہن سہن...... بازار...... ہوٹل، سرائیں اور بھٹیار خانے...... سڑکیں...... محکمہ ڈاک...... معاشی نظام...... ذرائع آمدورفت...... مذہب...... فنون لطیفہ...... زبان

باب چہارم: یورپ اور امریکہ کے سفرنامے ۱۸۷۔۲۵۳

موسم اور آب وہوا......وقت......جغرافیائی عناصر...... باشندے......عادات واطوار......اخلاقی اقدار اور جرائم......سماجی اقدار......خوراک......طرز زندگی......سیاسی نظام......معاشی نظام......تعلیمی نظام......ذرائع آمدورفت......علاج معالجہ......تفریح کے ذرائع......شہر اور دیہات......ہوٹل......بازار......اخبارات......محنت کش طبقہ......حادثات......مذہب......تاریخی ورثہ......آثار قدیمہ......شجرۂ نسب......فنون لطیفہ......زبان

ماحصل ۲۵۴

کتابیات ۲۶۵

پیش لفظ

ایم فل کا مقالہ لکھتے وقت میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ یہ مقالہ تو ڈاکٹریٹ کے مقالے کی طرف پیش قدمی کا پہلا مرحلہ ہے اس لئے یہ مقالہ نہ تو اتنا ضخیم ہوگا اور نہ ہی اتنا مشکل۔ البتہ جب میں نے ''پاکستان اور بیرونی ممالک کے معاشرتی اشتراکات اور اختلافات ابن انشا کے سفرناموں میں'' کے زیرِعنوان مقالے کی تسوید کے کام کا آغاز کیا تو آہستہ آہستہ مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہونے لگی کہ کسی بھی درجے کے تحقیقی وتنقیدی اور علمی کام کو سرانجام دینا آسان کام نہیں ہوتا۔ اس کام میں سب سے اہم اور مشکل مرحلہ مواد کی فراہمی ہوتا ہے۔ مجھے بھی تحقیق کے باقی طالب علموں کی طرح مطلوبہ مواد کی جمع آوری میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن میں نے صبر وتحمل اور برداشت کا دامن ہاتھ سے کبھی نہیں جانے دیا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ مطلوبہ مواد کی تلاش میں کئی کئی دن گزر جاتے لیکن پھر بھی کامیابی حاصل نہ ہوتی اور کئی بار جب میں نا امید ہونے لگی تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے کوئی نہ کوئی راہ نکال دیتا۔

موجودہ دور میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ جیسی حیرت انگیز ایجادات کے باعث دنیا سمٹ کر ایک گلوبل ویلج کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اس دور میں جو شخص دنیا کو جتنا بہتر طور پر جانتا ہے اتنا ہی کامیاب نظر آتا ہے۔ دنیا کو بہتر طور پر جاننے کی خواہش ہی میرے لئے سفرنامے کے بطور موضوع انتخاب کا محرک بنی۔ ایم فل اردو کا مقالہ لکھنے کے لئے جب میرے لئے ابن انشا کے سفرناموں کا موضوع تجویز کیا گیا تو مجھے ان کے سفرنامے دلچسپی اور یکسوئی سے پڑھنے کا موقع ملا۔ انشا بیسویں صدی کے ایک اہم شاعر، کالم نگار، مزاح نگار، مترجم اور سفرنامہ نگار تھے۔ انھوں نے اپنی دفتری مصروفیات کی انجام دہی کی غرض سے دنیا کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ممالک کا سفر کیا اور ان کا احوال سفری کالموں میں بیان کر دیا جو بعد میں ان کے سفرنامے کہلائے۔ انشا نے جن ممالک کا سفر اختیار کیا وہاں ان سے پہلے بھی کئی ادیب، شاعر، صحافی، سیاست دان، ماہر تعلیم اور حکیم جا چکے تھے، ان لوگوں نے بھی ان ممالک کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سفرناموں کا موضوع بنا دیا۔ انشا کے سفرناموں کے موضوعات تو تقریباً وہی تھے جو مذکورہ اشخاص کے تھے لیکن ان کے سفرنامے موضوع کی یکسانیت کے باوجود اسلوب کے تنوع کے باعث عوام وخواص میں بڑی دلچسپی سے پڑھے گئے۔ وہ بیرونی ممالک کی معاشرت کے تقابلی مطالعے ومشاہدے کو ایک سنجیدہ اور تحقیقی انداز میں پیش کرنے کی بجائے ایک مزاح نگار کی طرح بڑے شگفتہ اور مزاحیہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں میری دلچسپی نہ صرف ان کے اسلوب کی ہمہ رنگی کے سبب رہی بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک کی سیاحتوں کا احوال اور ان کی تہذیب ومعاشرت کا تقابلی مطالعہ بھی ان کے سفرناموں کی مقبولیت کی ایک وجہ رہا۔

مقالے کا عنوان ''پاکستان اور بیرونی ممالک کے معاشرتی اشتراکات اور اختلافات ابن انشا کے سفرناموں میں'' (تقابلی مطالعہ) ہے۔ یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔

مقالے کے باب اول میں سفرنامہ کی تعریف، ابتدا، جائے پیدائش، تاریخ، آغاز وارتقاء، انشا کے سوانحی خاکے اور تخلیقی شخصیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پہلے مختلف حوالوں کی مدد سے سفرنامے کی تعریف اور جائے پیدائش پر بات کی گئی ہے اور پھر مختلف ادوار کے سفرناموں کا تعارف کروایا گیا ہے۔ ''عصر حاضر میں سفرنامہ'' کے زیرعنوان اس عہد کے مقبول رجحانات کے زیراثر لکھے جانے والے سفرناموں کا تعارف اور مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد انشا کے سوانحی خاکے اور ان کی فنی وتخلیقی شخصیت کے مختلف پہلوؤں، بطور شاعر، کالم نگار، مزاح نگار، مترجم، بچوں کے ادب کے سلسلے میں ان کی نمایاں کوششوں کا سرسری اور بطور سفرنامہ نگار ان کی شخصیت کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد ان کے پانچوں سفرناموں کا تعارف کروایا گیا اور ان کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ آخر میں راقمہ نے انشا کے سفرناموں کی جغرافیائی حد بندی کو مشرق بعید، مشرق وسطیٰ، یورپ اور امریکہ کے خطوں میں تقسیم کر دیا تاکہ پاکستان اور بیرونی ممالک کی معاشرت کے تقابلی مطالعے کی بہتر طور پر تفہیم ممکن ہو سکے۔

مقالے کا دوسرا باب سب سے طویل باب ہے۔ اس باب میں پاکستان اور مشرق بعید کے ممالک کی معاشرت کے تقابلی مطالعے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس باب میں چین، جاپان، ہانگ کانگ، کوریا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، ملائیشیا، سری لنکا، بھارت، سنگاپور اور کئی دوسرے ممالک کے تقابلی مطالعے کا احوال ملتا ہے۔ انشا نے پاکستان اور مشرق بعید کی معاشرت کا تقابل، موسم اور آب وہوا، وقت، جغرافیے، تاریخ، تہذیب وتمدن، ثقافت، رنگ ونسل، زبان، خوراک، لباس، قیام وطعام، طرز زندگی، مذہب، سماجی اور اخلاقی اقدار، سماجی رویوں، رشتوں کے احترام وشکست وریخت، فنون لطیفہ، سیاسی ومعاشی نظام، ذرائع آمدورفت، بازار، سڑکوں، شہروں اور دیہات اور مادی وروحانی اندازفکر کے حوالے سے تقابل کر کے اشتراک اور اختلاف کی صورتوں کو واضح کیا۔ کئی بار تو انھوں نے ان اشتراکات اور اختلافات کے در پردہ پس منظر اور وجوہات کو سامنے لانے کی کوشش بھی کی تاکہ ہم ان ممالک اور ان میں بسنے والے لوگوں کو بہتر طور پر جان سکیں۔

تیسرے باب میں پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کی معاشرت کے تقابلی مطالعے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ خطہ یوں تو تمام مسلم ممالک پر مشتمل ہے اور پاکستان بھی ایک مسلم ممالک ہے لیکن پھر بھی انشا کو پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے خطے میں بسنے والے لوگوں کے مذہبی اعتقادات میں اشتراک کے ساتھ ساتھ اختلاف کے پہلو بھی نظر آئے، یہ اختلاف انشا کی طرح دیگر مسلم قارئین کے لئے بھی دلچسپی کا باعث بنے۔ مذہب کے علاوہ انھوں نے خوراک، لباس، عادات واطوار، سماجی اور اخلاقی اقدار، موسم اور آب وہوا، معاشی نظام، ڈاک کے نظام، بازار، سڑکوں، بھٹیار خانوں، فنون لطیفہ، زبان اور دیگر حوالوں سے پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کا تقابل بھی کیا اور اس تقابل کے نتیجے میں آنے والے اشتراکات اور

اختلافات کو واضح کیا۔

چوتھے باب میں پاکستان اور یورپ و امریکہ کے تقابلی مطالعے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یورپ اور امریکہ دنیا کے باقی خطوں سے الگ ایک خطہ ہے جس کے باشندوں کا مذہب اور تہذیبی معیارات تقریباً ایک جیسے ہیں۔ انشا نے موسم و آب و ہوا، وقت، جغرافیائی عناصر، رنگ و نسل، عادات و اطوار، طرز زندگی، اخلاقی و سماجی قدروں، تفریحی ذرائع، ذرائع آمد و رفت، مذہب، شہری و دیہاتی زندگی، سیاسی و معاشی نظام، ہوٹل، بازار، خوراک، لباس، قیام و طعام، فنون لطیفہ، زبان اور کئی دیگر حوالوں سے پاکستان، یورپ و امریکہ کا تقابل کیا اور اس تقابل کے نتیجے میں آنے و لے اشتراکات اور اختلافات کو واضح کیا۔

ایم فل (اردو) کا مقابلہ لکھنے کے لئے موضوع کے انتخاب کا وقت آیا تو بہت سے اساتذہ کرام نے میری رہنمائی کی جن میں ڈاکٹر سیدہ محسنہ نقوی (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو AIOU، ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو AIOU)، ڈاکٹر سہیل عباس (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو IIUI)، ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو IIUI) اور (IIUI) شعبۂ اردو کے دیگر تمام اساتذہ کرام بھی شامل ہیں۔ ان تمام اساتذہ کرام نے اپنے علم اور تجربے سے میری بہت رہنمائی فرمائی۔

میں ڈاکٹر طیب منیر کی بھی بہت شکر گزار ہوں جنھوں نے اس مقالے کے ابتدائی مراحل میں میری صحیح رہنمائی کی۔

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن جیسے محنتی اور قابل استاد کو میری رہنمائی کے لئے مقرر کیا گیا۔ انھوں نے صرف رسمی اور روایتی انداز میں میری رہنمائی نہیں کی بلکہ مجھے تحقیق کی نکتہ آفرینیوں، تقابلی مطالعے کے اصول وضوابط اور اسلوب بیان کی کئی باریکیوں اور نزاکتوں سے بھی آگاہ کیا۔ انھوں نے میرے مسودے کی بار بار اصلاح کر کے میری غلطیوں اور فروگزاشتوں کی نشاندہی کی۔ انھوں نے جس طرح سے میری رہنمائی کی اور اپنا قیمتی وقت مجھے دیا اس کے لئے میں ہمیشہ ان کی مشکور رہوں گی۔

میں Pak International College کی انتظامیہ کی بھی تہہ دل سے مشکور ہوں جنھوں نے اضافی ذمہ داریوں سے مجھے ہمیشہ مستثنٰی رکھا اور دوران ملازمت میرے لئے خصوصی طور پر ایسے اوقات کار ترتیب دیئے جن سے مجھے اپنے مقالے کی تکمیل میں بہت سہولت رہی۔

اس کے علاوہ میں خصوصی طور پر محمد رضا نقوی (سینئر کیٹلاگر AIOU)، مرید عباس (سینئر کیٹلاگر AIOU)، امتیاز حسین (سینئر کیٹلاگر، مقتدرہ قومی زبان) اور لائبریرین محمد انور کی تہہ دل سے مشکور ہوں جنھوں نے مطلوبہ مواد کے حصول میں میری بہت مدد کی۔ اس کے علاوہ میں نیشنل لائبریری کی پوری انتظامیہ کی بھی بڑی ممنون ہوں جنھوں نے ایم اے سے ایم فل تک کتابوں کے حصول کے سلسلے میں مجھے کبھی مایوس نہیں کیا۔ میں خرم شہزاد کی بھی بڑی ممنون ہوں جنھوں

نے کمپوزنگ کے دوران جس قدر صبر اور برداشت سے کام لیا وہ قابل تحسین ہے۔

علاوہ ازیں میں اپنے بھائیوں محمد احمد، قاسم علی اور والدہ کی ہمیشہ احسان مند رہوں گی جنھوں نے اعلیٰ تعلیم کے حصول میں میری نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ اس سلسلے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ممکن حد تک دور کرنے کی کوشش بھی کی۔ میں اپنی بھانجی سوہا عرفان کی بھی مشکور ہوں جس نے کام کے دوران مجھے کبھی تنگ نہیں کیا بلکہ کئی بار یہ ننھی سی بچی میرے لئے بڑی مددگار ثابت ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنے والد مرحوم کے بلند درجات کے لئے بھی دعا گو ہوں جنھوں نے مجھ میں علم کا شوق پیدا کیا اور آج میں ان ہی کی خواہش کی تکمیل کے لئے اس درجے کی تعلیم حاصل کر رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

سب سے بڑھ کر میں اللہ پاک کی شکر گزار ہوں جس نے مجھے توفیق بخشی اور اس قابل بنایا کہ آج یہ کام مکمل ہوا ہے۔

ارم ناز

۷ جنوری ۲۰۱۴ء

فہرست ابواب

پیش لفظ

باب اول: اردو سفرنامہ ۱۔۴۰

پس منظر، اردو سفرنامے کا آغاز وارتقا: اردو سفرنامے کی ابتدا...... عہد سرسید کے سفرنامے...... سفرنامے کا عبوری دور...... عہد حاضر میں سفرنامہ

ابن انشا سوانحی خاکہ: وطن، بچپن کا زمانہ...... ابتدائی تعلیم...... انشا رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے...... میٹرک کے امتحان میں امتیازی پوزیشن...... بھٹنڈہ میں فکر معاش...... لاہور میں حمید نظامی تک رسائی...... انبالہ چھاؤنی میں عارضی ملازمت...... فاضل ادیب، فاضل منشی اور بی اے کے امتحان میں کامیابی...... دہلی آمد...... آل انڈیا ریڈیو سے پاکستان ریڈیو منتقلی...... ریڈیو پاکستان کے شعبہ خبر کی لاہور سے کراچی منتقلی...... پہلی دستور ساز اسمبلی میں عارضی ملازمت...... پہلی بیوی سے مستقل علیحدگی...... صحافی محمد اختر سے ملاقات...... اعلیٰ تعلیم...... پہلے شعری مجموعے چاند نگر ۱۹۵۵ء کی اشاعت...... عشق...... بطور مترجم خدمات...... نیشنل بک سنٹر اور یونیسکو میں فرائض کی انجام دہی...... یونیسکو میں خدمات...... والد کی وفات...... دوسری شادی...... والدہ کی وفات...... دوسرے شعری مجموعے اس بستی کے اک کوچے میں ۱۹۷۶ء کی اشاعت...... بیماری اور علاج...... وفات

ابن انشا کی دیگر تخلیقی جہات: انشا بطور شاعر...... انشا بطور سفرنامہ گار...... ابن انشا کے سفرناموں کی جغرافیائی تقسیم

باب دوم: مشرق بعید کے سفرنامے ۴۱۔۱۲۷

وقت...... جغرافیہ...... دریا...... پہاڑ اور چوٹیاں...... متصل مقامات اور حدود اربعہ...... موسم اور آب و ہوا...... آبادی...... باشندے...... خوراک...... عادات واطوار...... ادب وآداب...... اخلاقی اقدار...... اندازفکر...... ہوٹل اور سرائیں...... تفریح کے مختلف ذرائع اور تفریحی مقامات...... ذرائع آمدورفت...... علاج معالجہ...... نظام تعلیم...... سیاسی نظام...... عدالتی نظام...... معاشی نظام...... مذہب...... شہر اور دیہات...... سڑکیں...... بازار...... محنت کش طبقہ...... آثار قدیمہ...... جانور...... صحافت...... زبان...... فنون لطیفہ

باب سوم: مشرقی وسطیٰ کے سفرنامے ۱۲۸۔۱۸۶

موسم اور آب وہوا...... آبادی...... باشندے...... لباس...... خوراک...... عادات واطوار...... اخلاقی اقدار...... سماجی اقدار...... رہن سہن...... بازار...... ہوٹل، سرائیں اور بھٹیار خانے...... سڑکیں...... محکمہ ڈاک...... معاشی نظام...... ذرائع آمدورفت...... مذہب...... فنون لطیفہ...... زبان

باب چہارم: یورپ اور امریکہ کے سفرنامے ۱۸۷۔۲۵۳

موسم اور آب وہوا......وقت......جغرافیائی عناصر......باشندے......عادات واطوار......اخلاقی اقدار اور جرائم......سماجی اقدار......
خوراک......طرز زندگی......سیاسی نظام......معاشی نظام......تعلیمی نظام......ذرائع آمدورفت......علاج معالجہ......تفریح کے ذرائع......شہر
اور دیہات......ہوٹل......بازار......اخبارات......محنت کش طبقہ......حادثات......مذہب......تاریخی ورثہ......آثار قدیمہ......شجرۂ نسب
......فنون لطیفہ......زبان

ماحصل ۲۵۴

کتابیات ۲۶۵

پیش لفظ

ایم فل کا مقالہ لکھتے وقت میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ یہ مقالہ تو ڈاکٹریٹ کے مقالے کی طرف پیش قدمی کا پہلا مرحلہ ہے اس لئے یہ مقالہ نہ تو اتنا ضخیم ہوگا اور نہ ہی اتنا مشکل۔ البتہ جب میں نے ''پاکستان اور بیرونی ممالک کے معاشرتی اشتراکات اور اختلافات ابن انشا کے سفر ناموں میں'' کے زیرِ عنوان مقالے کی تسوید کے کام کا آغاز کیا تو آہستہ آہستہ مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہونے لگی کہ کسی بھی درجے کے تحقیقی و تنقیدی اور علمی کام کو سرانجام دینا آسان کام نہیں ہوتا۔ اس کام میں سب سے اہم اور مشکل مرحلہ مواد کی فراہمی ہوتا ہے۔ مجھے بھی تحقیق کے باقی طالب علموں کی طرح مطلوبہ مواد کی جمع آوری میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن میں نے صبر و تحمل اور برداشت کا دامن ہاتھ سے کبھی نہیں جانے دیا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ مطلوبہ مواد کی تلاش میں کئی کئی دن گزر جاتے لیکن پھر بھی کامیابی حاصل نہ ہوتی اور کئی بار جب میں نا امید ہونے لگی تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے کوئی نہ کوئی راہ نکال دیتا۔

موجودہ دور میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ جیسی حیرت انگیز ایجادات کے باعث دنیا سمٹ کر ایک گلوبل ولیج کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اس دور میں جو شخص دنیا کو جتنا بہتر طور پر جانتا ہے اتنا ہی کامیاب نظر آتا ہے۔ دنیا کو بہتر طور پر جاننے کی خواہش ہی میرے لئے سفر نامے کے بطور موضوع انتخاب کا محرک بنی۔ ایم فل اردو کا مقالہ لکھنے کے لئے جب میرے لئے ابن انشا کے سفر ناموں کا موضوع تجویز کیا گیا تو مجھے ان کے سفر نامے دلچسپی اور یکسوئی سے پڑھنے کا موقع ملا۔ انشا بیسویں صدی کے ایک اہم شاعر، کالم نگار، مزاح نگار، مترجم اور سفر نامہ نگار تھے۔ انھوں نے اپنی دفتری مصروفیات کی انجام دہی کی غرض سے دنیا کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ممالک کا سفر کیا اور ان کا احوال سفری کالموں میں بیان کر دیا جو بعد میں ان کے سفر نامے کہلائے۔ انشا نے جن ممالک کا سفر اختیار کیا وہاں ان سے پہلے بھی کئی ادیب، شاعر، صحافی، سیاست دان، ماہر تعلیم اور حکیم جا چکے تھے، ان لوگوں نے بھی ان ممالک کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سفر ناموں کا موضوع بنا دیا۔ انشا کے سفر ناموں کے موضوعات تو تقریباً وہی تھے جو مذکورہ اشخاص کے تھے لیکن ان کے سفر نامے موضوع کی یکسانیت کے باوجود اسلوب کے تنوع کے باعث عوام و خواص میں بڑی دلچسپی سے پڑھے گئے۔ وہ بیرونی ممالک کی معاشرت کے تقابلی مطالعے و مشاہدے کو ایک سنجیدہ اور تحقیقی انداز میں پیش کرنے کی بجائے ایک مزاح نگار کی طرح بڑے شگفتہ اور مزاحیہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے سفر ناموں میں میری دلچسپی نہ صرف ان کے اسلوب کی ہمہ رنگی کے سبب رہی بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک کی سیاحتوں کا احوال اور ان کی تہذیب و معاشرت کا تقابلی مطالعہ بھی ان کے سفر ناموں کی مقبولیت کی ایک وجہ رہا۔

مقالے کا عنوان ''پاکستان اور بیرونی ممالک کے معاشرتی اشتراکات اور اختلافات ابن انشا کے سفرناموں میں'' (تقابلی مطالعہ) ہے۔ یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔

مقالے کے باب اول میں سفرنامہ کی تعریف، ابتدا، جائے پیدائش، تاریخ، آغاز وارتقاء، انشا کے سوانحی خاکے اور تخلیقی شخصیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پہلے مختلف حوالوں کی مدد سے سفرنامے کی تعریف اور جائے پیدائش پر بات کی گئی ہے اور پھر مختلف ادوار کے سفرناموں کا تعارف کروایا گیا ہے۔ ''عصر حاضر میں سفرنامہ'' کے زیرعنوان اس عہد کے مقبول رجحانات کے زیراثر لکھے جانے والے سفرناموں کا تعارف اور مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد انشا کے سوانحی خاکے اور ان کی فنی وتخلیقی شخصیت کے مختلف پہلوؤں، بطور شاعر، کالم نگار، مزاح نگار، مترجم، بچوں کے ادب کے سلسلے میں ان کی نمایاں کوششوں کا سرسری اور بطور سفرنامہ نگار ان کی شخصیت کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد ان کے پانچوں سفرناموں کا تعارف کروایا گیا اور ان کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ آخر میں راقمہ نے انشا کے سفرناموں کی جغرافیائی حد بندی کو مشرق بعید، مشرق وسطیٰ، یورپ اور امریکہ کے خطوں میں تقسیم کر دیا تا کہ پاکستان اور بیرونی ممالک کی معاشرت کے تقابلی مطالعے کی بہتر طور پر تفہیم ممکن ہو سکے۔

مقالے کا دوسرا باب سب سے طویل باب ہے۔ اس باب میں پاکستان اور مشرق بعید کے ممالک کی معاشرت کے تقابلی مطالعے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس باب میں چین، جاپان، ہانگ کانگ، کوریا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، ملائیشیا، سری لنکا، بھارت، سنگاپور اور کئی دوسرے ممالک کے تقابلی مطالعے کا احوال ملتا ہے۔ انشا نے پاکستان اور مشرق بعید کی معاشرت کا تقابل، موسم اور آب وہوا، وقت، جغرافیے، تاریخ، تہذیب وتمدن، ثقافت، رنگ ونسل، زبان، خوراک، لباس، قیام وطعام، طرز زندگی، مذہب، سماجی اور اخلاقی اقدار، سماجی رویوں، رشتوں کے احترام وشکست وریخت، فنون لطیفہ، سیاسی ومعاشی نظام، ذرائع آمدورفت، بازار، سڑکوں، شہروں اور دیہات اور مادی وروحانی اندازفکر کے حوالے سے تقابل کر کے اشتراک اور اختلاف کی صورتوں کو واضح کیا۔ کئی بار تو انھوں نے ان اشتراکات اور اختلافات کے درپردہ پس منظر اور وجوہات کو سامنے لانے کی کوشش بھی کی تا کہ ہم ان ممالک اور ان میں بسنے والے لوگوں کو بہتر طور پر جان سکیں۔

تیسرے باب میں پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کی معاشرت کے تقابلی مطالعے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ خطہ یوں تو تمام مسلم ممالک پر مشتمل ہے اور پاکستان بھی ایک مسلم ممالک ہے لیکن پھر بھی انشا کو پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے خطے میں بسنے والے لوگوں کے مذہبی اعتقادات میں اشتراک کے ساتھ ساتھ اختلاف کے پہلو بھی نظر آئے، یہ اختلاف انشا کی طرح دیگر مسلم قارئین کے لئے بھی دلچسپی کا باعث بنے۔ مذہب کے علاوہ انھوں نے خوراک، لباس، عادات واطوار، سماجی اور اخلاقی اقدار، موسم اور آب وہوا، معاشی نظام، ڈاک کے نظام، بازار، سڑکوں، بھٹیار خانوں، فنون لطیفہ، زبان اور دیگر حوالوں سے پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کا تقابل بھی کیا اور اس تقابل کے نتیجے میں آنے والے اشتراکات اور

اختلافات کو واضح کیا۔

چوتھے باب میں پاکستان اور یورپ و امریکہ کے تقابلی مطالعے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یورپ اور امریکہ دنیا کے باقی خطوں سے الگ ایک خطہ ہے جس کے باشندوں کا مذہب اور تہذیبی معیارات تقریباً ایک جیسے ہیں۔ انشا نے موسم و آب و ہوا، وقت، جغرافیائی عناصر، رنگ و نسل، عادات واطوار، طرز زندگی، اخلاقی وسماجی قدروں، تفریحی ذرائع، ذرائع آمدورفت، مذہب، شہری و دیہاتی زندگی، سیاسی و معاشی نظام، ہوٹل، بازار، خوراک، لباس، قیام وطعام، فنون لطیفہ، زبان اور کئی دیگر حوالوں سے پاکستان، یورپ و امریکہ کا تقابل کیا اور اس تقابل کے نتیجے میں آنے والے اشتراکات اور اختلافات کو واضح کیا۔

ایم فل (اردو) کا مقابلہ لکھنے کے لئے موضوع کے انتخاب کا وقت آیا تو بہت سے اساتذہ کرام نے میری رہنمائی کی جن میں ڈاکٹر سیدہ محسنہ نقوی (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو AIOU، ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو AIOU)، ڈاکٹر سہیل عباس (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو IIUI)، ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو IIUI) اور (IIUI) شعبۂ اردو کے دیگر تمام اساتذہ کرام بھی شامل ہیں۔ ان تمام اساتذہ کرام نے اپنے علم اور تجربے سے میری بہت رہنمائی فرمائی۔

میں ڈاکٹر طیب منیر کی بھی بہت شکر گزار ہوں جنھوں نے اس مقالے کے ابتدائی مراحل میں میری صحیح رہنمائی کی۔

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن جیسے محنتی اور قابل استاد کو میری رہنمائی کے لئے مقرر کیا گیا۔ انھوں نے صرف رسمی اور روایتی انداز میں میری رہنمائی نہیں کی بلکہ مجھے تحقیق کی نکتہ آفرینیوں، تقابلی مطالعے کے اصول وضوابط اور اسلوب بیان کی کئی باریکیوں اور نزاکتوں سے بھی آگاہ کیا۔ انھوں نے میرے مسودے کی بار بار اصلاح کر کے میری غلطیوں اور فروگزاشتوں کی نشاندہی کی۔ انھوں نے جس طرح سے میری رہنمائی کی اور اپنا قیمتی وقت مجھے دیا اس کے لئے میں ہمیشہ ان کی مشکور رہوں گی۔

میں Pak International College کی انتظامیہ کی بھی تہہ دل سے مشکور ہوں جنھوں نے اضافی ذمہ داریوں سے مجھے ہمیشہ مستثنیٰ رکھا اور دوران ملازمت میرے لئے خصوصی طور پر ایسے اوقات کار ترتیب دیئے جن سے مجھے اپنے مقالے کی تکمیل میں بہت سہولت رہی۔

اس کے علاوہ میں خصوصی طور پر محمد رضا نقوی (سینئر کیٹلاگر AIOU)، مرید عباس (سینئر کیٹلاگر AIOU)، امتیاز حسین (سینئر کیٹلاگر، مقتدرہ قومی زبان) اور لائبریرین محمد انور کی تہہ دل سے مشکور ہوں جنھوں نے مطلوبہ مواد کے حصول میں میری بہت مدد کی۔ اس کے علاوہ میں نیشنل لائبریری کی پوری انتظامیہ کی بھی بڑی ممنون ہوں جنھوں نے ایم اے سے ایم فل تک کتابوں کے حصول کے سلسلے میں مجھے کبھی مایوس نہیں کیا۔ میں خرم شہزاد کی بھی بڑی ممنون ہوں جنھوں

نے کمپوزنگ کے دوران جس قدر صبر اور برداشت سے کام لیا وہ قابل تحسین ہے۔

علاوہ ازیں میں اپنے بھائیوں محمد احمد، قاسم علی اور والدہ کی ہمیشہ احسان مند رہوں گی جنھوں نے اعلیٰ تعلیم کے حصول میں میری نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ اس سلسلے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ممکن حد تک دور کرنے کی کوشش بھی کی۔ میں اپنی بھانجی سوہا عرفان کی بھی مشکور ہوں جس نے کام کے دوران مجھے کبھی تنگ نہیں کیا بلکہ کئی بار یہ ننھی سی بچی میرے لئے بڑی مددگار ثابت ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنے والد مرحوم کے بلند درجات کے لئے بھی دعا گو ہوں جنھوں نے مجھ میں علم کا شوق پیدا کیا اور آج میں ان ہی کی خواہش کی تکمیل کے لئے اس درجے کی تعلیم حاصل کر رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

سب سے بڑھ کر میں اللہ پاک کی شکر گزار رہوں جس نے مجھے توفیق بخشی اور اس قابل بنایا کہ آج یہ کام مکمل ہوا ہے۔

ارم ناز

۷ جنوری ۲۰۱۴ء

باب اول

اردو سفر نامہ

پس منظر

''سفر'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ''مسافت طے کرنے'' یا ''قطع مسافت'' کے ہیں اور سفر نامے سے مراد ایسی چشم دید سفری داستان ہے جو اپنا تحریری وجود بھی رکھتی ہو۔

جب سے انسان نے اس روئے زمین پر قدم رکھا، اسی دن سے اس کے سفر کا آغاز ہو گیا جس نے بعد میں داستانِ سفر کو جنم دیا۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی مسافروں کے بیان کئے گئے قصوں کو سفر نامے کا اولین روپ قرار دیتی ہیں اور اس سلسلے میں اپنی کتاب *اردو سفر نامے انیسویں صدی میں* ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''یوں تو سفر کے ساتھ ہی داستانِ سفر کا وجود بھی ہوا ہوگا، اس لئے کہ سفر سے واپس آنے کے بعد دوست، احباب اور اعزا سے رُوداد سفر کا بیان کرنا فطری بات تھی، لیکن تحریری طور پر اسے کب قلمبند کیا جانے لگا یہ بات تحقیق طلب ہے''[1]

قدیم دور میں یونان اور ہندوستان، دو ہی ایسے خطے تھے جو نہ صرف ترقی کے اعتبار سے بہت آگے تھے بلکہ علم و ادب کے لحاظ سے بھی بہت زرخیز تھے۔ اس لیے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بیشتر علوم کی طرح فنِ سفر نامہ کا آغاز بھی انہی میں سے کسی ایک جگہ ہوا ہوگا، لیکن یونان اور ہندوستان کی ادبی تاریخیں اس سلسلے میں بالکل خاموش ہیں۔ البتہ ڈاکٹر پرویز پروازی، مشہور یونانی مورخ ہیروڈوٹس کو دنیا کا پہلا سفر نامہ نگار قرار دیتے ہیں جس سے اس فن میں یونان کی اولیت ثابت ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر پرویز پروازی یونانی مورخ ہیروڈوٹس کو دنیا کا پہلا سفر نامہ نگار قرار دیتے ہوئے ماہنامہ اوراق میں شائع اپنے ایک مضمون ''سفر نامے کی تاریخ اور اس کا فن'' میں لکھتے ہیں:

> ''مگر وہ شخص ہیروڈوٹس بھی تو تھا جو ۴۸۴ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور زمین کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے اس نے بہت سے سفر اختیار کئے''[2]

قدیم دور کے دستیاب سفر ناموں میں ایک یونانی دانشور، میگستھنیز کا سفر نامہ Indica بہت نمایاں ہے جو تین سو سال قبل مسیح میں لکھا گیا۔ اس سفر نامے میں ہندوستان اور اہل ہندوستان کے بارے میں بہت سی اہم معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ میگستھنیز کے بعد دو چینی سیّاح، فاہیان پانچویں صدی عیسوی میں اور ہیون سانگ ۶۴۱ صدی عیسوی میں

ہندوستان آئے، ان دونوں نے بھی روداد سفر سفرناموں کی صورت میں ہی قلمبند کی۔ ان کے بعد کچھ مسلمان سیاحوں نے بھی سفرنامے لکھے جن میں حکیم ناصر خسرو نے ۱۰۵۲ء میں سفر نامہ زاد المسافرین، ابو ریحان البیرونی نے ۱۰۳۰ء۔۹۹۸ء میں ایک علمی صحیفہ *کتاب الہند*، محمد بن جبیر اندلسی نے ایک سفر نامہ *رحلتہ بن جبیر* اور شیخ ابوعبداللہ المعروف ابن بطوطہ نے ایک سفر نامہ *عجائب الاسفار* کے نام سے لکھا۔ ان مسلم سیّاحوں کے بعد تیرھویں صدی میں اٹلی کے مشہور سیّاح مارکو پولو نے ہندوستان کے سفر کا احوال ایک سفرنامے میں قلمبند کیا۔ اس کے بعد مغل دورِ حکومت میں توزک لکھنے کا رواج ہوا جنھیں نوعیت کے اعتبار سے سفرنامے ہی کی ایک صورت قرار دیا جاسکتا ہے۔ مغل سلاطین میں سے تیمور، بابر اور جہانگیر کے توزک مستند سمجھے جاتے ہیں۔ مغلِ سلاطین کے بعد ہندوستان دریافت کرنے کی غرض سے آنے والے چند یورپی سیاحوں نے بھی سفرنامے لکھے۔ جن میں ایک فرانسیسی سیّاح ڈاکٹر برنیر کا سفر نامہ *وقائع سیاحتِ برنیر* بھی بہت اہم ہے۔ اس نے اس سفرنامے میں ہندوستان کے سفر کی روداد کے ساتھ ساتھ یہاں پر اپنے قیام کا احوال بھی بڑی تفصیل سے قلمبند کیا۔ اس کے علاوہ ایک اطالوی سیّاح منوچی نے بھی ایک سفرنامہ لکھا جسے اس عہد کے نمایاں سفرناموں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

اردو سفرنامے کا آغاز وارتقا

اردو سفرنامے کے آغاز وارتقا کا سفر بہت طویل ہے جسے درج ذیل ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ا۔	اردو سفرنامے کی ابتدا	(۱۸۴۷ء ۔ ۱۸۵۶ء)
۲۔	عہد سرسیّد کے سفرنامے	(۱۸۵۷ء ۔ ۱۹۰۰ء)
۳۔	سفرنامے کا عبوری دور	(۱۹۰۱ء ۔ ۱۹۴۰ء)
۴۔	عصرِ حاضر میں سفرنامہ	(۱۹۴۱ء ۔ ۲۰۱۰ء)

ا۔ اردو سفرنامے کی ابتدا: (۱۸۴۷ء ۔ ۱۸۵۶ء)

ہندوستان میں سفرنامہ لکھنے کی روایت بہت قدیم ہے ڈاکٹر انور سدید کے مطابق یہ روایت تقریباً تین سو سال پرانی ہے۔ البتہ اس قدیم روایت میں بھی کسی باقاعدہ اردو سفرنامے کا سراغ نہیں ملتا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس دور میں جو سفرنامے لکھے گئے وہ زیادہ تر فارسی زبان میں تھے، اردو زبان میں سفرنامہ لکھنے کی روایت کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ اردو سفرنامے کی روایت کا آغاز سفرنامہ *عجائبات فرنگ* ۱۸۴۷ء سے ہوا جس کے بعد اردو سفرناموں کی ایک بڑی تعداد منظرِ عام پر آئی۔

ڈاکٹر قدسیہ قریشی نے اس عہد میں لکھے گئے سفرناموں کو موضوع کے اعتبار سے درج ذیل اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

یورپی ممالک کے سفرنامے:

یہ سفرنامے لندن، روس، جاپان، امریکہ اور افریقہ کے سفر پر مبنی تھے۔

مذہبی سفرنامے:

ان سفرناموں میں حج اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کا احوال رقم کیا گیا تھا۔

مشرقی ممالک کے سفرنامے:

یہ سفرنامے مصر، شام، ایران، عراق، قسطنطینہ، چین اور سری لنکا کے سفر پر مبنی تھے۔

مقامی سفرنامے:

ان سفرناموں میں ہندوستان اور اس کے مقامی علاقوں کے سفر اور اس کے تجربات اور مشاہدات کو موضوع بنایا گیا تھا۔

اس ابتدائی دور میں لکھے گئے چند اہم سفرنامے درج ذیل ہیں۔

یوسف خان کمبل پوش ، عجائباتِ فرنگ (تاریخِ یوسفی)

یوسف خان کمبل پوش نے ۱۸۳۷ء میں انگلستان کا سفر اختیار کیا اور سفر سے واپسی پر اپنے تجربات اور مشاہدات کو سفرنامہ *عجائباتِ فرنگ* ۱۸۴۷ء میں بیان کر دیا۔ اس سفرنامے کا ایک نام *تاریخِ یوسفی* بھی ہے۔ اس سفرنامے کو اردو کا پہلا سفرنامہ تسلیم کیا گیا ہے اور یہی اس سفرنامے کی سب سے نمایاں خوبی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اس سفرنامے کے بارے میں اپنی کتاب *اردو ادب میں سفرنامہ* میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''اس سفرنامے سے پہلے تا حال کوئی ایسا سفرنامہ دریافت نہیں ہوا جس میں رودادِ سفر اردو میں لکھی گئی ہو اور سفر بھی مصنف نے خود اختیار کیا ہو چنانچہ یوسف خان کمبل پوش کے سفرنامے *عجائباتِ فرنگ* کو جس کا ایک عنوان ''تاریخِ یوسفی'' بھی ہے، بجا طور پر اردو کا پہلا سفرنامہ تسلیم کیا گیا ہے۔'' [۳]

اس سفرنامے میں سفرنامہ نگار کا سفر کسی مقصدیت کے تابع نظر نہیں آتا بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ صرف جہاں نوردی کا ارادہ رکھتا ہو۔ البتہ اس نے احوالِ سفر کے ساتھ ساتھ انیسویں صدی کے انگلستان کی بھرپور عکاسی کرنے کی کوشش کی اور ایک منفرد اسلوبِ بیان بھی اختیار کیا۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی اس سفرنامے کے اسلوب کو منفرد قرار دیتے ہوئے اسے قدیم اردو اور قافیہ پیمائی کا ایک نادر نمونہ قرار دیتی ہیں۔ یہ سفرنامہ پہلی بار دہلی سے اور دوسری بار لکھنؤ سے متعدد ترامیم اور

اضافوں کے ساتھ شائع ہوا۔

سیّد فدا حسین ، تاریخِ افغانستان

یہ سفر نامہ ۱۸۵۲ء میں لکھا گیا، اس سفر نامے کا شمار ابتدائی سفر میں دوسرے نمبر پر ہوتا ہے۔ سفر نامہ نگار فدا حسین برطانوی فوج میں سپاہی تھے۔ جب انگریزی فوج نے کابل پر حملے کا ارادہ کیا تو انھوں نے بھی انگریزی فوج کے ہمراہ غزنی کا رُخ کیا جہاں انھیں ایک جنگی مہم میں حصہ لینا تھا۔ اس جنگی مہم کے اختتام پر جب وہ واپس ہندوستان لوٹے تو انھوں نے اس طویل سفر کے تجربات، مشاہدات اور جنگی مہم کے احوال کو سفر نامہ *تاریخ افغانستان* میں رقم کر دیا۔ سفر نامہ نگار چونکہ ایک سپاہی تھا اس لیے اس نے بحیثیت سپاہی زیادہ تر جنگی مہم اور اس کی تفصیلات ہی کو سفر نامے کا موضوع بنایا البتہ حقیقت نگاری کے عنصر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے تجربات و مشاہدات کو بے کم و کاست بیان کرنے کی کوشش کی۔ تاہم ان کے ہاں ایک توانا اسلوب کی کمی نے کامل ابلاغ کے سلسلے میں نہ صرف رکاوٹیں پیدا کیں بلکہ نا تمامیت کے احساس کو بھی ابھارا۔

مرزا ابوطالب خان اصفحان ، سفرِ فرنگ

سفر نامہ *سفرِ فرنگ* کا شمار اردو کے ابتدائی سفر ناموں میں تیسرے نمبر پر ہوتا ہے۔ اس سفر نامے کے بارے میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اپنی کتاب *اردو سفر نامے کی تاریخ* میں لکھتے ہیں:

> ''اردو کا تیسرا اقدیم ترین سفر نامہ، سفرِ فرنگ، از میرزا ابوطالب خان اصفحان (آغازِ سفر ۱۸۵۶ء) ہندوستانی مزاج لیے ہوئے ہے۔'' [۴]

مسیح الدین علوی ، سفیرِ اودھ

مسیح الدین نے سفیرِ اودھ کے نام سے ایک سفر نامہ لکھا جس کا شمار اردو کے قدیم سفر ناموں میں چوتھے نمبر پر ہوتا ہے۔ جب اودھ کے نواب واجد علی شاہ کو ۱۸۵۶ء میں حکومت برطانیہ نے معزول کر دیا تو مسیح الدین علوی نے بطورِ سفیر انگلستان کا سفر کیا تا کہ واجد علی شاہ کی بحالی ممکن ہو سکے۔ انھوں نے تقریباً ساڑھے سات سال تک کا عرصہ لندن میں گزارا اور ۲۳ دسمبر ۱۸۶۵ء کو وہ ہندوستان لوٹے۔ البتہ یہاں آنے سے پہلے انھوں نے ارضِ حجاز میں واقع مقاماتِ مقدسہ کی زیارت بھی کی اور اس سارے سفر کا احوال سفر نامہ *سفیرِ اودھ* میں قلمبند کر دیا۔ اس سفر نامے کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ سفر نامہ نگار، مسیح الدین علوی نے نہ تو انگلستان کو کھوجنے اور دریافت کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی وہاں کے سماجی اور معاشرتی حالات کی عکاسی کو چنداں اہمیت دی گئی بلکہ ان کے اظہارِ بیان کا محور صرف اور صرف ان کا اپنا خاندانی حسب و نسب ہی رہا۔

۲۔ عہدِ سرسیّد کے سفرنامے: (۱۸۵۷ء ۔ ۱۹۰۰ء)

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہندوستان کے لوگوں میں سیاحت، خصوصاً یورپی ممالک کی سیاحت کے رجحان کو خوب فروغ ملا۔ جس سے ایک طرف تو ہندوستان کے لوگوں کو انگلستان اور اہلِ انگلستان کے بارے میں جاننے کا موقعہ در آیا اور دوسری طرف فنِ سفرنامہ کو بھی پھلنے پھولنے کا موقعہ ملا۔

اس دور میں لکھے گئے چند اہم سفرنامے درج ذیل ہیں:

سرسیّد احمد خان ، مسافرانِ لندن ، سفرنامۂ پنجاب

سرسیّد احمد خان کا شمار اردو کے اہم سفرنامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنا پہلا سفرنامہ *مسافرانِ لندن* کے نام سے لکھا۔ اس سفرنامے میں انھوں نے اپنے سفرِ لندن (۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۱ء) کا حوال درج کیا۔ اس سفرنامے کا شمار یورپی ممالک کے سفرناموں میں ہوتا ہے۔ سرسیّد کے پیش نظر اس سفر کا محرک محض سیر و سیّاحت نہ تھا بلکہ وہ چند علمی مقاصد کے حصول اور ملک و قوم کی اصلاح اور بہبود کے خیال سے لندن گئے تھے۔ یہ سفرنامہ درحقیقت ملک و قوم کی بدحالی کے اسباب جاننے اور انھیں منظرِ عام پر لانے کے سلسلے کی ایک ادبی کوشش تھی۔ اس اصلاحی مقصد کے لیے انھوں نے زیادہ تر تقابلی طریقے سے کام لیا اور جابجا اہلِ ہندوستان اور اہلِ انگلستان کا تقابل کر کے اپنی قوم کی بدحالی اور تنزّلی کے اسباب سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ البتہ سفرنامہ نگار کے خطیبانہ اسلوب اور تنقیدی لب و لہجے کی تلخی نے سفرنامے کے فطری حسن کو گہنا کر رکھ دیا پھر بھی سفرنامے میں منطقی ربط اور مجموعی تاثر کی خوبی موجود ہے جسے ڈاکٹر انور سدید بھی اس سفرنامے کی نمایاں خوبی قرار دیتے ہیں۔

سرسید نے دوسرا سفرنامہ *سفرنامۂ پنجاب* کے نام سے لکھا۔ انھوں نے علی گڑھ کالج کی چندہ مہم کے سلسلے میں لدھیانہ، امرتسر، جالندھر، گورداسپور، پٹیالہ اور لاہور تک کا سفر کیا اور اس سفر کا احوال سفرنامۂ پنجاب میں قلمبند کر دیا۔ یہ سفر انھوں نے خالصتاً علمی مقاصد کی غرض سے اختیار کیا تھا۔ یہ سفرنامہ چونکہ اندرونِ ہند میں واقع شہروں کے سفر پر مبنی تھا اس لیے اس سفرنامے کا شمار مقامی سفرناموں کی ذیل میں کیا جاتا ہے۔ اس سفرنامے کو سرسیّد نے خود تحریر نہیں کیا تھا بلکہ ان کے دوست مولوی سید اقبال علی نے اسے تحریر کیا تھا اور شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے اسے مرتب کیا تھا۔

ایڈورڈ ہنری پارمر، ہنری پارمر کا سفرنامہ

اس دور میں جہاں ہندوستان سے تعلق رکھنے والے سیّاحوں اور قلمکاروں نے بہت سے سفرنامے سپردِ قلم کیے

وہیں ایڈورڈ ہنری پارمر نامی ایک انگریز نے بھی ایک سفر نامہ *سفر نامۂ پارمر* کے نام سے لکھا۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق اس سفر نامے کی انفرادیت اس اعتبار سے ہے کہ یہ کسی غیر ملکی کا اردو زبان میں پہلا سفر نامہ ہے۔ اس سفر نامے کو اودھ اخبار لکھنؤ سے قسط وار شائع کیا گیا۔

ہنری پارمر یوں تو ایک انگریز تھا لیکن اسے عربی، فارسی اور اردو زبان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ اردو زبان پر اس کی دسترس محض سطحی نوعیت کی نہ تھی بلکہ وہ مختلف الفاظ کے معنی، ان کے مترادفات اور ان کے درمیان موجود باریکیوں اور ان کے طریقۂ استعمال سے بھی پوری طرح واقف تھا۔ ہنری پارمر نے اردو زبان دانی سے متعلقہ تمام باریکیوں اور مہارتوں کو اس سفر نامے میں بڑی خوبی اور سلیقے سے برتا۔

مولانا جعفر تھانیسری ، *کالا پانی*

مولانا جعفر تھانسیری نے *کالا پانی* کے عنوان سے ایک سفر نامہ لکھا۔ مولانا تحریکِ مجاہدین کے ایک جانثار کارکن تھے اور یہ تحریک ہندوستان میں برطانوی تسلط کا خاتمہ چاہتی تھی۔ انگریز سرکار نے مولانا کی مجاہدانہ سرگرمیوں کو روکنے کے لیے پہلے تو انھیں پھانسی دینے کا حکم صادر کیا لیکن بعد میں اسی سزا میں تخفیف کر کے اسے حبسِ دوام میں تبدیل کر دیا۔ مولانا نے ۱۷ سال اور ۱۰ ماہ تک کا عرصہ اسی سزا میں گزارا اور ۱۸۸۳ء کو وہ واپس اپنے وطن پانی پت لوٹے۔ دوران قید انھیں کسی ایک جگہ نہیں رکھا گیا بلکہ ہندوستان کی مختلف جیلوں میں رکھا گیا اور اس دوران وہ جن تجربات، مشاہدات اور غیر معمولی تاثرات سے گزرے ان کا احوال انھوں نے سفر نامہ *کالا پانی* میں درج کر دیا۔

ڈاکٹر انور سدید کالا پانی کو باقاعدہ سفر نامہ تو قرار نہیں دیتے البتہ ان کے نزدیک اس میں سفر نامے کے صرف چند عناصر موجود ہیں۔

محمد حسین آزاد ، *سیرِ ایران*

محمد حسین آزاد نے ۱۸۸۵ء میں ایران کا سفر اختیار کیا اور اس سفر کے دوران پیش آنے والے تجربات اور مشاہدات کو انھوں نے سفر نامہ *سیرِ ایران* میں بیان کر دیا۔ انھوں نے دورانِ سفر پیش آنے والے تجربات، مشاہدات اور معلومات کو روزنامچے کے انداز میں قلمبند کیا۔ آزاد نے ان معلومات کو پہلی مرتبہ جولائی ۱۸۸۶ء کو انجمن پنجاب کے ہال میں ایک لیکچر کے دوران بیان کر دیا۔ یہ سفر نامہ آزاد نے نہ تو خود تحریر کیا تھا اور نہ ہی اس کا مسودہ ابتدائی حالت میں موجود تھا بلکہ محمد طاہر نبیرہ نے ان کے لیکچر اور روزنامچے کے چند دستیاب اوراق سے یہ سفر نامہ مرتّب کیا اور خود ہی اس کا نام *سیرِ ایران* رکھ دیا۔

آزاد نے یہ سفر خالصتاً علمی مقاصد کے لیے اختیار کیا تھا۔ البتہ انھوں نے علمی مقاصد کے ساتھ ساتھ ایران اور اہلِ ایران کے بارے میں مفید معلومات بھی فراہم کیں اور ماضی کو کرید نے کی کوشش بھی کی۔ اس سفر نامے کی نمایاں خوبی اس کا منفرد اسلوب ہے ڈاکٹر انور سدید سفر نامہ *سیرِ ایران* کے منفرد اسلوب کے بارے میں اپنی کتاب *اردو ادب میں سفر نامہ* میں لکھتے ہیں:

''یہ سفر نامہ محض معلوماتی نہیں بلکہ ادبی لحاظ سے بھی ایک حقیقی شہ پارہ ہے اور عہد سرسیّد کے سفر ناموں میں اپنی ایک منفرد شان رکھتا ہے۔'' ۵

نواب محمد عمر خان ، *زادِ سفر، زادِ غریب*

نواب محمد عمر نے لاتعداد سفر نامے سپردِ قلم کئے بقول ڈاکٹر انور سدید انھیں عہدِ سرسیّد کے زود نویس سفر نامہ نگار ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے ان کے دو سفر نامے *زادِ سفر* اور *زادِ غریب* باقی سفر ناموں کے مقابلے میں زیادہ مشہور ہیں۔ اولذکر سفر نامے کا شمار مقامی سفر ناموں میں ہوتا ہے جو کلکتہ، لکھنؤ اور حیدر آباد کی سیّاحت کا احوال بیان کرتا ہے اور *زادِ غریب* میں رودادِ حج کے علاوہ عراق، ایران، مصر اور شام کی سیّاحت کا احوال بھی درج کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سفر نامہ نگار نے قارئین کو عرب ممالک کی تاریخ اور جغرافیہ سے متعارف کروانے کی کوشش بھی کی ہے۔ تاہم ڈاکٹر انور سدید کی ان کے سفر ناموں کے بارے میں رائے یہ ہے کہ انھوں نے ایک سیاح کے فرائض کو پسِ پشت ڈال کر زیادہ تر اخذ و استفادے سے کام لیا ہے اور عربی اور انگریزی رسائل سے حاصل شدہ معلومات ہی کو اپنے سفر ناموں کا حصہ بنایا ہے۔

مولانا شبلی نعمانی ، *سفر نامہ مصر و روم و شام*

مولانا شبلی نعمانی نے ۱۸۹۲ء میں مصر، روم اور شام کا سفر اختیار کیا اور اس سفر کا احوال سفر نامہ مصر و روم و شام میں درج کر دیا۔ مولانا نے یہ سفر خالصتاً علمی مقاصد کی غرض سے اختیار کیا تھا دراصل وہ اپنی کتاب الفاروق کے لیے علمی مواد کے متلاشی تھے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اسے ایک علمی سفر نامہ قرار دیتے ہوئے اپنی کتاب *اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ* میں لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی نعمانی کا ''سفر نامہ روم، مصر و شام'' پہلی مرتبہ ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔ اس خالصتاً علمی نوعیت کے سفر نامے کا آغاز ۲۶ اپریل ۱۸۹۶ء کو علی گڑھ سے قسطنطنیہ کے سفر کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس سفر کے دوران عرب دنیا کے کتب خانوں اور درس گاہوں کی سیر کے ساتھ ساتھ علماء سے ملاقاتوں کے سلسلے قابلِ مطالعہ ہیں'' ۶

مولانا شبلی، طرزِ بیاں میں یوں تو زیادہ تر خطیبانہ اسلوب ہی کو پیش نظر رکھتے تھے لیکن اس سفر نامے میں انھوں نے

اپنے مخصوص طرزِ بیاں سے ہٹ کر زیادہ تر سادہ اور رواں اسلوب ہی کو اپنایا۔

لالہ بیج ناتھ ، *انگلینڈ اور انڈیا*

لالہ بیج ناتھ نے سفر نامہ *انگلینڈ اور انڈیا* میں فرانس، اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور سیلون کی سیاحت کا احوال رقم کیا ہے اس سفر نامے کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سفر نامہ نگار نے ان ممالک کی عکاسی میں خاصا متوازن رویہ اپنایا اور جہاں ان ممالک کے مثبت زاویوں کو پیش کیا وہیں ان کے منفی زاویوں کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں انھوں نے ان ممالک کے خوبصورت مناظر، بلند و بالا عمارات اور چکا چوند ترقی کا جا بجا تذکرہ کیا وہیں اس معاشرے کے اخلاقی تنزل کی بھرپور انداز میں عکاسی بھی کی ہے۔ یہ سفر نامہ پہلی بار ۱۸۹۷ء میں انگریزی زبان میں شائع ہوا اور بعد میں اسے اردو میں بھی شائع کیا گیا۔

۳۔ سفر نامے کا عبوری دور (۱۹۰۱ء ۔ ۱۹۴۰ء)

قیامِ پاکستان سے پہلے کا دور نہ صرف سیاسی لحاظ سے بہت ہنگامہ خیز دور گردانا جاتا ہے بلکہ اسے اردو سفر نامے کی ترقی کے اعتبار سے بھی بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔

اس دور میں لکھے گئے چند اہم سفر نامے درج ذیل ہیں:

منشی محبوب عالم ، *سفر نامہ یورپ*

منشی محبوب عالم ایک کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ پیسہ اخبار کے مدیر ہونے کے ساتھ ساتھ علمی، ادبی اور سماجی حلقوں میں بھی اپنا ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے 'سفر نامہ یورپ' میں اپنے فرانس، مصر، روم اور شام کے سفر کا احوال درج کیا ہے۔ اس سفر نامے کو انھوں نے اپنی ڈائری اور خطوط کی مدد سے مرتب کیا۔ انھوں نے بحیثیتِ صحافی، اظہارِ بیان کے بجائے معلومات اور کوائف کی فراہمی ہی کو زیادہ اہمیت دی جس سے نا صرف سفر نامے کا مجموعی تاثر بُری طرح متاثر ہوا بلکہ اس کا فطری حسن بھی ان کی زود نویسی کی نظر ہو گیا۔ تاہم اس سفر نامے کو اس دور کا ایک نمایاں سفر نامہ شمار کیا جاتا ہے۔

مولوی عبدالرحمٰن امرتسری ، *سفر نامہ بلادِ اسلامیہ*

مولوی عبدالرحمٰن امرتسری نے ۱۸۹۸ء میں مصر، شام، ترکی اور روم کا سفر اختیار کیا اور اس سفر کا احوال سفر نامہ *بلادِ اسلامیہ* میں رقم کر دیا۔ انھوں نے اس سفر کے دوران ان ممالک کے معاشروں کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا اور اس مشاہدے سے حاصل شدہ سماجی و معاشرتی معلومات اور کوائف کو اپنے سفر نامے کا حصہ بنا دیا۔

شیخ عبدالقادر ، *مقامِ خلافت* ، *سیاحت نامۂ یورپ*

شیخ عبدالقادر، ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک نامور ادیب اور دانشور تھے اور ''مخزن'' کے مدیر بھی تھے۔ انھوں نے دو سفر نامے *مقامِ خلافت* اور *سیاحت نامۂ یورپ* کے نام سے لکھے۔ ان میں سے اولذکر سفر نامے کا شمار مشرقی سفر ناموں میں ہوتا ہے اور دوسرے کا شمار یورپی ممالک کے سفر ناموں میں۔ سفر نامہ *مقامِ خلافت* میں سفر نامہ نگار نے ترکی کے سفر (۱۹۰۶ء) کی روداد قلمبند کرنے کے علاوہ وہاں کے سیاسی، سماجی اور تعلیمی معلومات اور کوائف کو بھی اپنے سفر نامے کا حصہ بنایا۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق سفر نامہ نگار نے اس سفر نامے میں اظہار بیان میں زیادہ تر سادہ اور رواں اسلوب سے کام لیا اور تکنیکی اعتبار سے خطوط کی تکنیک سے بھرپور استفادہ کیا۔

قاضی عبدالغفار ، *نقشِ فرنگ*

قاضی عبدالغفار نے تحریکِ خلافت کے وفد کے ہمراہ انگلستان کا دورہ کیا اور اس سفر کا احوال سفر نامہ *نقشِ فرنگ* میں بیان کر دیا۔ یہ سفر خالصتاً سیاسی مقاصد کے پیشِ نظر اختیار کیا گیا تھا۔ اسی لیے اس سفر نامے میں سفر نامہ نگار نے نہ تو حالاتِ سفر کو چنداں اہمیت دی اور نہ اپنے تجربات، مشاہدات اور جذبات کا کھل کر اظہار کیا۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق اس سفر نامے میں صرف سیاسی وقائع نگاری کو اہمیت دی گئی ہے۔ البتہ سفر نامہ نگار نے اپنے منفرد اسلوب سے قارئین کو بے حد متاثر کیا جو لطافت اور خطابت کے حسین امتزاج سے تشکیل پاتا ہے۔

بیگم حسرت موہانی ، *سفرِ حجاز، سفرِ عراق*

بیگم حسرت موہانی نے دنیا کے مختلف ممالک کا سفر اختیار کیا اور ان میں سے اکثر کا احوال سفر ناموں کی صورت میں قلمبند کر دیا۔ ان کے سفر ناموں میں *سفرِ حجاز* اور *سفرِ عراق* زیادہ مشہور ہیں۔ اولذکر سفر نامے کا شمار مذہبی سفر ناموں میں ہوتا ہے جس میں دورانِ حج پیش آنے والے تجربات و مشاہدات کو بیان کیا گیا ہے اور *سفرِ عراق* میں عراق کی سیاحت کا احوال درج کیا گیا ہے۔ اس سفر نامے میں سفر نامہ نگار نے بحیثیت عورت خواتین کی زندگی کے عام معمولات، مشاغل اور دلچسپیوں کو زیادہ اہمیت دی ہے۔

عہدِ حاضر میں سفر نامہ: (۱۹۴۱ء۔۲۰۱۰ء)

اردو سفر نامہ اپنے ارتقا کی منازل طے کرتے ہوئے جب عہدِ حاضر میں داخل ہوتا ہے تو یکسر ایک نئی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس عہد کے سفر نامے نے اشیاء اور مظاہر کے ظاہری احوال کے ساتھ ساتھ تخیل کی رنگ آمیزی، گمشدہ ماضی کی بازیافت اور جذبات نگاری جیسے عناصر کو بھی پیشِ نظر رکھا۔ اس عہد کے سفر نامہ نگاروں نے ان مذکورہ عناصر کے

ساتھ ساتھ درج ذیل چند نمائندہ رجحانات کو بھی پیش نظر رکھا اور کئی اعلیٰ پائے کے سفرنامے سپردِ قلم کیے۔

1۔ خطوط کی مدد سے مرتب کئے جانے والے سفرنامے

عہد حاضر میں سب سے پہلے خطوط کو سفر نامے کا روپ دینے کا رجحان بھی فن سفر نامہ کا حصہ بنا۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے اس رجحان کی حامل تمام کوششوں کو عہدِ حاضر میں اردو سفرنامے کا آغاز قرار دیا ہے۔ اس رجحان کی حامل چند نمایاں کاوشیں درج ذیل ہیں۔

حمزہ فاروقی (مرتب) *سفر نامۂ اقبال*

حمزہ فاروقی نے علامہ اقبال کے خطوط اور روزناموں کو *سفر نامۂ اقبال* کے نام سے مرتب کیا۔ انھوں نے ۱۹۳۱ میں انگلستان، فلسطین، فرانس اور اطالیہ کا سفر اختیار کیا اور دورانِ سفر بہت سے خطوط اور روزنامچے تحریر کئے۔ حمزہ فاروقی نے انہی خطوط اور روزناموں کو پیشِ نظر رکھ کر ایک سفر نامہ ترتیب دیا جس کے لئے انھوں نے *سفرنامۂ اقبال* کا نام تجویز کیا۔

سیّد سلیمان ندوی ، *بریدِ فرنگ*

سیّد سلیمان ندوی نے ۱۹۲۰ء میں کئی یورپی ممالک کا سفر اختیار کیا۔ اس سفر میں وہ تنہا نہیں تھے بلکہ مولانا محمد علی جوہر اور سیّد حسین جیسے رفقاء بھی ان کے ہمراہ تھے۔ انھوں نے اس سفر کا تذکرہ اپنے کئی خطوط میں بھی کیا جنھیں بعد میں *بریدِ فرنگ* کے نام سے مرتب کیا گیا۔ ان خطوط میں بھی سفر نامے کے کچھ بنیادی عناصر کسی حد تک موجود تھے اس لئے ان کا شمار بھی کسی حد تک مکتوباتی کوششوں پر مبنی سفر ناموں میں کیا جا سکتا ہے۔

آغا محمد اشرف ، *لندن سے آداب عرض*

آغا محمد اشرف نے اپنے خطوط کو لندن سے *آدابِ عرض* کے عنوان سے شائع کیا جو بعد میں ان کے سفر نامے کہلائے۔ انھوں نے انگلستان، افریقہ اور سری لنکا کا سفر اختیار کیا اور دورانِ سفر ان ممالک کو ایک سیاح کی نظر سے دیکھنے کی کوشش بھی کی۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق آغا محمد اشرف نے ایک منظم سفر نامہ لکھنے کی بجائے صرف چند مضامین سے اپنا سفر نامہ ترتیب دیا ہے۔ یوں اس طرز پر سفر نامہ تحریر کر کے انھوں نے فن سفر نامہ کی روایت سے انحراف کیا ہے۔

۲۔ علمیت اور ادبیت کے رجحان پر مبنی سفر نامے

عہدِ حاضر میں مکتوباتی رجحان کے حامل سفر ناموں کے بعد علمی اور ادبی رجحان کے حامل سفر ناموں نے اپنی جگہ بنائی

شروع کی۔اس عہد کے نامور سفرنامہ نگاروں نے اس رجحان کو اپنایا اور کئی اعلیٰ پائے کے سفرنامے تحریر کئے۔ اس سلسلے کی چند نمایاں کاوشیں درج ذیل ہیں:

اختر ریاض الدین ، دھنک پر قدم ، سات سمندر پار

بیگم اختر ریاض الدین نے لندن، نیویارک، ماسکو، میکسیکو، جاپان اور ہوائی کا سفر اختیار کیا اور ان ممالک کے سفر کا احوال اپنے سفرناموں میں قلمبند کر دیا۔انھوں نے دورانِ سفر اشیاء اور مظاہر پر صرف سرسری نگاہ نہیں ڈالی بلکہ بڑی باریکی اور گہرائی سے ان تمام اشیاء و مظاہر کا مشاہدہ کیا اور پھر انھیں اپنے سفرناموں کا حصہ بنا دیا۔ڈاکٹر انور سدید ان کی قوتِ مشاہدہ کو سراہتے ہوئے ماہنامہ اوراق کے ایک مضمون *اردو سفرنامے کے نئے اور پرانے نام* میں لکھتے ہیں:

> ''اختر ریاض الدین نے ''دھنک پر قدم'' اور ''سات سمندر پار'' میں منظر پر جامد نظر ڈالنے کی بجائے اُسے تخلیقی آنکھ سے دیکھا اور یوں فطرت کی سادگی سے تخلیق کی شعریت کی طرف مراجعت کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مرد سفرنامہ نگار بالعموم منظر کی قوس وقزح کو بکھیرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اختر ریاض الدین چھوٹی چھوٹی جزئیات کو چنتی ہیں اور ان سے منظر کو یوں مرتّب کرتی ہیں کہ اُلجھا ہوا اُون کا گولا ایک خوبصورت قوسِ قزح میں ڈھل جاتا ہے'' ؎

کسی بھی تخلیق کار کی شخصیت کا عکس اس کی تخلیق میں ضرور موجود ہوتا ہے، اختر ریاض الدین چونکہ ایک خاتون سفرنامہ نگار تھیں اس لئے ان کے سفرناموں میں بھی زیادہ تر نسوانی زاویوں ہی کا تذکرہ ملتا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے موزوں اور مناسب الفاظ کے استعمال سے اپنے سفرناموں میں کامل ابلاغ کا وصف بھی پیدا کیا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی ، ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ۱۹۶۲ء میں انگلستان کا سفر اختیار کیا اور اس سفر کا احوال سفرنامہ ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک میں درج کر دیا۔ وہ ایک مشہور محقق اور نقاد تھے، یہ سفر انھوں نے صرف چند علمی مقاصد کی غرض سے ہی اختیار کیا تھا البتہ ان علمی مقاصد کے ساتھ ساتھ انھوں نے لندن شہر کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔انھوں نے اظہارِ بیان میں لندن شہر کے مثبت و منفی، دونوں ہی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھا۔ڈاکٹر مرزا حامد بیگ سفرنامہ *ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک* کے بارے میں ماہنامہ اوراق کے ایک مضمون ''اردو سفرنامے کے نئے اور پرانے نام'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ہاتھ بلاشبہ مقصد کی ڈوری سے بندھے ہوئے ہیں اور وہ پاسبانِ عقل سے کسی مقام پر بھی علیحدگی اختیار نہیں کرتے تاہم انہوں نے لندن کی تہذیبی، سماجی اور مجلسی زندگی کا جو مرقعہ پیش کیا ہے وہ مناظر اور واقعات کا بیانیہ ہی انہیں بلکہ اس میں زندگی کا حُسن بھی موجود ہے اور یہ

قاری کے لیے جذباتی حرارت بھی پیدا کرتا ہے"[8]

مولانا عبدالحامد بدایونی ، تاثراتِ روس، تاثراتِ چین

مولانا عبدالحامد بدایونی جمیعت العلمائے پاکستان کے قائد تھے۔ انھوں نے دینِ اسلام کی تبلیغ کی غرض سے ۱۹۵۵ء میں چین اور ۱۹۵۷ء میں روس کا سفر اختیار کیا۔ چین کے سفر کا احوال انھوں نے سفر نامہ *تاثراتِ چین* میں رقم کیا اور روس کے سفر کا احوال سفر نامہ *تاثراتِ روس* میں قلمبند کر دیا۔ *تاثراتِ روس* میں انھوں نے سفر نامہ نگار کی بجائے زیادہ تر ایک مبلّغ دین کے فرائض سرانجام دیئے اور روس کو دریافت کرنے کی بجائے زیادہ تر وہاں کی مذہبی زندگی کے مختلف زاویوں کو پیش کیا۔ سفر نامہ *تاثراتِ چین* میں انھوں نے چین میں قیام کے دوران مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے عام معمولات اور جمیعت کی تبلیغی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔

محمد حمزہ فاروقی ، آج بھی اس دیس میں ، زمان و مکان اور بھی

محمد حمزہ فاروقی نے دو سفر نامے *آج بھی اس دیس میں* اور *زمان و مکان اور بھی* کے عنوان سے لکھے۔ اولذکر سفر نامہ، اردن، شام، لبنان، ترکی، آسٹریا، یوگوسلاویہ، ایران اور افغانستان کے سفر پر مبنی ہے جبکہ دوسرا سفر نامہ اسپین کے سفر کے تجربات و مشاہدات کو بیان کرتا ہے۔ حمزہ فاروقی نے زیادہ تر سفر علمی مقاصد کی غرض سے اختیار کیے تھے اسی لیے ان کے سفر ناموں میں علمیت کا اظہار کثرت سے ملتا ہے۔ البتہ ان کا اسلوب ان کے خیالات، تاثرات اور تجربات کی مکمل ترجمانی نہیں کر سکا جس کے سبب قارئین کو ایک تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا ، بیس دن انگلستان میں

ڈاکٹر وزیر آغا نے لندن کا سفر اختیار کیا اور اس سفر کے دوران پیش آنے والے تجربات اور مشاہدات کو سفر نامہ *بیس دن انگلستان میں* بیان کر دیا۔ اس سفر نامے میں لندن شہر کو ایک سیاح کی نظر سے دیکھنے اور دریافت کرنے کا جذبہ جابجا کارفرما دکھائی دیتا ہے اور وہاں پر منعقد کی جانے والی علمی و ادبی سرگرمیوں کا بیان بھی کثرت سے ملتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ایک نامور علمی و ادبی شخصیت ہیں، ایک ادیب کے لیے اس کے ہمعصر ادبا اور دیگر علمی و ادبی تقریبات اور سرگرمیاں بڑی کشش رکھتی ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی لندن شہر میں اپنے ہمعصر ادیبوں سے ملاقاتیں کیں اور وہاں پر منعقد ہونے والی علمی و ادبی محافل میں شرکت کی جس کا بیان اس سفر نامے میں جابجا ملتا ہے البتہ اس سفر نامے کو پڑھ کر یہ احساس بھی ابھرتا ہے کہ شاید سفر نامہ نگار نے خود اپنی ہی ذات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید سفر نامہ *بیس دن انگلستان میں* کو ایک منفرد سفر نامہ قرار دیتے ہیں اور اس سلسلے ہوئے ماہنامہ اوراق میں شائع اپنے ایک مضمون

''اُردو سفر نامے کے نئے اور پرانے نام'' میں لکھتے ہیں کہ:

''خالصتاً ادبی سفر ناموں میں وزیر آغا کا سفر نامہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں منظر کو پیش کرنے کی بجائے ادیب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ وزیر آغا کا سفر نامہ درحقیقت ایک طویل ملاقات ہے اور یہ ادب کے فکری زاویے کو روشنی بخشتا ہے۔ اس سفر نامے میں پہلی مرتبہ دلّی اور بمبئی کے اہم ادیبوں کو کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور ان کی ادبی زندگی کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے'' 9

۳۔ محبت وعقیدت کے جذبے کے ترجمان سفر نامے

مسلمانانِ عالم سرزمینِ حجاز اور مقاماتِ مقدسہ سے جو محبت وعقیدت رکھتے ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ عہدِ حاضر میں بھی گذشتہ ادوار کی طرح سرزمینِ حجاز اور مقاماتِ مقدسہ سے محبت وعقیدت کا جذبہ قائم رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں گذشتہ ادوار سے بھی زیادہ بڑی تعداد میں مذہبی سفر نامے لکھے گئے۔

اس سلسلے کی چند نمایاں کاوشیں درج ذیل ہیں:

مولانا ضیاء القادری ، *دیارِ نبی*

مولانا ضیاء القادری ایک سچے عاشق رسولؐ تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء میں حج کی سعادت حاصل کرنے کی غرض سے ارضِ حجاز کا سفر اختیار کیا۔ انھوں نے اپنے سفر کا آغاز بدایون سے کیا اور کراچی سے ہوتے ہوئے وہ اپنے ابدی وروحانی وطن یعنی ارضِ حجاز پہنچے۔ انھوں نے اس سفر کی روداد اور حج کے دوران پیش آنے والے تجربات، مشاہدات، روحانی کیفیات اور جذب ومستی کو بڑے شاعرانہ انداز میں سفر نامہ *دیارِ نبی* میں قلمبند کر دیا۔ یہ سفر نامہ سفر نامہ نگار کی محبت وعقیدت، خلوص، احترام اور شدتِ جذبات کا ترجمان ہے۔ سفر نامہ نگار نے اظہارِ بیان میں یوں تو نثر کی بجائے نظم کو اختیار کیا لیکن اس اندازِ بیاں میں بھی سہل ممتنع کی کیفیت پیدا کر کے اس منظوم سفر نامے کو چار چاند لگا دیئے۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق اس سفر نامے کا تاریخی نام اصل *سفر نامہ ضیا* ہے اور اسے اردو کے حج ناموں میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔

نسیم حجازی ، *پاکستان سے دیارِ حرم تک*

نسیم حجازی نے ایک سرکاری وفد کے ہمراہ ایران، ترکی اور حجازِ مقدس کا سفر اختیار کیا اور اس سفر کا احوال سفر نامہ *پاکستان سے دیارِ حرم تک* میں بیان کر دیا۔ یہ سفر نامہ پہلے پہل تو روز نامہ کوھستان میں مضامین کی صورت میں شائع ہوا اور بعد میں اسے چند ترامیم اور اضافوں کے ہمراہ کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔ اس سفر نامے میں سفر نامہ نگار کے ہاں ایک فطری سیاح کی سی کھوج اور دریافت کا جذبہ تو دکھائی نہیں دیتا البتہ بعض سیاسی لیڈران کا تذکرہ ملتا ہے جس سے یہ سفر

نامہ ایک تاریخی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید مرصع نثر کو اس سفر نامے کی نمایاں خوبی قرار دیتے ہیں۔

شورش کاشمیری ، شب جائے کہ من بودم

شورش کاشمیری ۵ نومبر ۱۹۶۹ء کو سرزمین حجاز روانہ ہوئے اور فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد ۱۸ نومبر ۱۹۶۹ء کو وطن واپس لوٹے۔ انھوں نے اس ارضِ مقدس میں گزارے گئے چودہ دنوں کا احوال سفر نامہ شب جائے کہ من بودم میں بیان کر دیا۔ شورش جب ارضِ حجاز پہنچے اور بیت اللہ شریف اور روضہ ءرسولؐ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ انھوں نے اپنے جذبات اور مشاہدات کے علاوہ یورپی اقوام کے ارضِ حجاز پر تسلط کو بھی اپنے سفر نامے کا موضوع بنایا اور مسلمانوں کی بدحالی پر گہرے غم و تاسف کا اظہار کیا ہے۔ شورش کاشمیری نے اپنے دلی جذبات کو گہرے شاعرانہ انداز میں بیان کیا اور خوبصورت تشبیہات کے استعمال سے اس سفر نامے کے حسن اور تاثر کو اور بھی دو چند کر دیا۔

ممتاز مفتی ، لبّیک

ممتاز مفتی نے حج کی سعادت حاصل کی اور اس مبارک سفر کے دوران پیش آنے والے تجربات، مشاہدات اور جذباتی اتار چڑھاؤ کو سفر نامہ لبّیک میں بیان کر دیا۔ انھوں نے اپنے علاوہ دیگر حجاج کرام کے تجربات و مشاہدات کو بھی اس سفر نامے کا موضوع بنایا۔ انھوں نے اظہارِ بیان میں ایک بالکل نئی راہ اختیار کی جو اظہار میں کسی قسم کی پابندی کو قبول نہیں کرتی، ڈاکٹر انور سدید اظہار بیان میں ان کی اسی آزاد خیالی کے سبب سفر نامہ لبّیک کو ایک متنازعہ سفر نامہ قرار دیتے ہیں۔

۴۔ افسانوی طرز کے سفر نامے

دورِ حاضر میں سفر نامے کو افسانے کے قریب لانے کا رجحان بھی اردو سفر نامے کی روایت کا حصہ بنا۔ اس رجحان کو اپنانے اور پروان چڑھانے والوں میں مستنصر حسین تارڑ کا نام سرِ فہرست ہے ان کے علاوہ اشفاق احمد اور کئی دیگر سفر نامہ نگاروں نے بھی اس رجحان کو کسی حد تک پروان چڑھایا۔ تاہم مستنصر حسین تارڑ کی کوششیں اس سلسلے میں زیادہ نمایاں ہیں جن کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ ، نکلے تری تلاش میں، اندلس میں اجنبی، خانہ بدوش، ہنزہ داستان، پیار کا پہلا شہر، کے ٹو کہانی، سنولیک، یاک سرائے، سفر شمال کے، ماسکو کی سفید راتیں

مستنصر حسین تارڑ ایک نامور ادیب، افسانہ نگار اور سفر نامہ نگار ہیں۔ ان کی شخصیت کے ان تینوں پہلوؤں کی جھلک ان کے سفر ناموں میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ یوں تو انھوں نے بہت سے سفر نامے لکھے لیکن ان کے دو طویل

سفرنامے نکلے تری تلاش میں اور اندلس میں اجنبی زیادہ مشہور ہوئے۔ان کے دیگر سفرناموں میں پیار کا شہر ۱۹۸۳ء کے ٹو کہانی ۱۹۹۷ء،سنولیک ۲۰۰۰ء، یاک سرائے ۲۰۰۰ء،سفر شمال کے ۲۰۰۳ء اور ماسکو کی راتیں ۲۰۰۸ء شامل ہیں۔تاہم پیا کا پہلا شہر ایک متنازعہ سفرنامہ ہے کیوں کہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ سفرنامہ،سفرنامے کی بجائے افسانے سے زیادہ قریب تر ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفرناموں میں جہاں اشیاء و مظاہر کو قابل توجہ سمجھا وہیں اپنے جذبات و احساسات سے بھی صرف نظر نہیں کیا۔انھوں نے سفرنامے کو افسانوی رنگ ڈھنگ سے آشنا کیا اور بطور افسانہ نگار اپنے سفرناموں میں حسن و لطافت اور کردار نگاری کے زاویوں کو بھی بطورِ خاص اہمیت دی۔انھوں نے قارئین کی دلچسپی کے لیے سفرنامے میں طنز و مزاح کے عنصر کی موجودگی کو بھی ضروری جانا۔اور یوں اختراعات اور اضافوں سے اردو سفرنامے کے دامن کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا۔

۵۔ تاریخی،جغرافیائی اور فلسفیانہ معلومات کے حامل سفرنامے

عہد حاضر کے سفرنامے میں ایک نئے رجحان نے اپنی جگہ بنانا شروع کر دی اور ایسے سفرنامے زیادہ لکھے جانے لگے جن میں تاریخی،جغرافیائی اور علمِ فلسفہ کی معلومات کو سفرنامے کا حصہ بنایا جانے لگا۔عہدِ حاضر کے بہت سے سفرنامہ نگاروں نے اس رجحان کو اپنا کر کئی اعلیٰ پائے کے سفرنامے سپردِ قلم کیے۔

اس سلسلے کی چند نمایاں کوششیں درج ذیل ہیں:

سیّد وجاہت علی ، *میں نے کمال کا ترکی دیکھا*

سیّد وجاہت علی نے سفرنامہ *میں نے کمال کا ترکی دیکھا* میں ترکی کے سفر کا احوال قلمبند کیا ہے۔اس سفرنامے میں سفرنامہ نگار نے ترکی کو دریافت کرنے اور اپنے تجربات و مشاہدات اور جذبات کو بیان کرنے کی بجائے صرف تاریخ، جغرافیے اور فلسفے کی معلومات اور کوائف سے سفرنامے کے صفحات کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔البتہ ان کے جاندار اسلوب نے قارئین کو کسی حد تک متاثر کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔

حکیم محمد سعید ، *یورپ نامہ*

حکیم محمد سعید ایک نامور طبیب تھے،انھیں علمِ طب سے بے حد لگاؤ تھا۔انھوں نے ۱۹۵۶ء میں دنیا کے مختلف ممالک کا سفر اختیار کیا تا کہ علم طب کی جدید معلومات اور دیگر امور و وسائل سے آگاہی حاصل کر سکیں۔اس مقصد کے تحت انھوں نے ترکی، یوگوسلاویہ اور سوئٹزرلینڈ کا سفر اختیار کیا اور اس سفر کا احوال سفرنامہ *یورپ نامہ* میں درج کر دیا جو دو جلدوں

پر مشتمل ہے۔ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی رائے میں حکیم صاحب نے حالاتِ سفر تاریخی، جغرافیائی، ثقافتی اور طبی حقائق کے پس منظر میں لکھے ہیں اس لیے ان کے سفر ناموں کو تاریخ اور تنقید کی کتابیں تو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن سفر نامے ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۶۔ معاشرتی، نفسیاتی، روحانی اور وطن پرستی کے رجحان پر مبنی سفر نامے

عہد حاضر میں سماجی، نفسیاتی، صوفیانہ اور پاکستانی اندازِ فکر کے حامل سفر نامے لکھنے کا رجحان بھی اردو سفر نامے کی روایت کا حصہ بنا۔ اس رجحان کو اپنانے والوں میں ممتاز احمد خان، عبداللہ ملک، قدرت اللہ شہاب اور عطاالحق قاسمی کے نام قابل ذکر ہیں۔

ذیل میں چند نمایاں کاوشوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

عبداللہ ملک ، *ارضِ جنت سوویت یونین*

عبداللہ ملک صحافت کے پیشے سے منسلک تھے۔ انھوں نے روس کا سفر اختیار کیا اور اس سفر کا احوال سفر نامہ *ارضِ جنت سوویت یونین* میں درج کر دیا۔ انھوں نے اظہارِ بیان میں ایک سفر نامہ نگار کی بجائے زیادہ تر ایک صحافی کے انداز فکر اور طرزِ بیان ہی کو پیش نظر رکھا۔ سفر نامہ نگار چونکہ اشتراکی نظریے کے حامی تھے یہی وجہ ہے کہ روس کے لئے ان کے جانبدارانہ طرزِ فکر کا احساس سفر نامہ میں کئی جگہوں پر کیا جا سکتا ہے۔

ممتاز احمد خان ، *جہاں نما*

ممتاز احمد خان نے ایران، عراق، ترکی، ہالینڈ، جرمنی اور فرانس کے سفر کا احوال سفر نامہ *جہاں نما* میں رقم کر دیا۔ انسانی معاشرہ ان کے لیے ایک دلچسپ موضوع تھا اسی لیے انھوں نے معاشرے میں ہونے والے تغیرات اور ان کے اثرات کو بطورِ خاص اپنے سفر نامے کا موضوع بنایا۔ البتہ انھوں نے اس سنجیدہ موضوع کو بھی اپنے دلنشین اسلوب میں یوں پیش کیا کہ موضوع کی سنجیدگی بھی قارئین پر گراں نہیں گزرتی۔

قدرت اللہ شہاب ، *اے بنی اسرائیل، تو ابھی راہ گزر میں ہے*

قدرت اللہ شہاب نے صوفیانہ اندازِ فکر کے حامل کئی سفر نامے سپرد قلم کیے۔ ان کے سفر ناموں کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید رائے دیتے ہوئے اپنی کتاب *اردو ادب میں سفر نامہ* میں لکھتے ہیں:

> ''قدرت اللہ شہاب نے سفر نامے میں میلوڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی زیادہ کاوش کی ہے۔ جس سے سفر نامے کا حسن دب گیا ہے اور جذباتیت نمایاں ہوگئی ہے۔'' [۱۰]

۷۔ اختصار پسندی کے رجحان پر مبنی سفرنامے

دورِ حاضر میں جہاں اور بہت سے رجحانات اردو سفرنامے کی روایت کا حصہ بنے وہیں اختصار پسندی کے رجحان کے حامل سفرناموں نے بھی اپنی جگہ بنانی شروع کردی۔ ڈاکٹر محمد اجمل، انتظار حسین، رام لعل اور کئی دوسرے سفرنامہ نگاروں نے مختصر سفرنامے لکھ کر اس رجحان کو پروان چڑھایا۔

اس سلسلے کی چند نمایاں کاوشیں درج ذیل ہیں:

انتظار حسین ، *زمین اور فلک اور*

انتظار حسین نے سفرنامہ *زمین اور فلک اور* میں بھارت کے اسفار کی یاداشتوں کو محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ سفرنامہ نگار چونکہ ایک علمی و ادبی شخصیت تھے اس لیے انھوں نے اپنے قارئین کو ہندوستان کی تہذیب و ثقافت سے متعارف کروانے کے ساتھ ساتھ وہاں کی ادبی زندگی کے مختلف زاویوں سے متعارف کروانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس سفرنامے کو مختصر سفرناموں میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

جوگندر پال ، *پاکستان کی یاترا*

جوگندر پال بھارت کے نامور شاعر تھے۔ انھوں نے ۱۹۸۲ء میں پاکستان کا سفر اختیار کیا۔ یہ سفر انھوں نے ایک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے اختیار کیا تھا۔ سفرنامہ *پاکستان کی یاترا* میں انھوں نے سفرِ پاکستان کی روداد قلمبند کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں پر اپنے قیام کا احوال اور ان علمی و ادبی شخصیات کا تذکرہ بھی کیا جن سے دوران قیام ان کی ملاقات ہوئی۔ جوگندر پال چونکہ ایک شاعر تھے اس لیے انھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات اور تاثرات کے بیان میں زیادہ تر شاعرانہ اندازِ بیاں ہی کو ترجیح دی۔

۸۔ خوب صورت طرزِ تحریر کے حامل سفرنامے

دورِ حاضر میں خوب صورت طرزِ تحریر میں داستانِ سفر رقم کرنے کا رجحان بھی اردو سفرنامے کی روایت کا حصہ بنا۔ اس دور کے بہت سے سفرنامہ نگاروں نے اس رجحان کو شعوری طور پر اپنایا اور کئی اعلیٰ پائے کے سفرنامے تحریر کیے۔

اس سلسلے کی چند نمایاں کوششیں درج ذیل ہیں:

محمد اختر مونگا ، *پیرس ۲۰۵ کلومیٹر*

محمد اختر مونگا نے سفرنامہ *پیرس ۲۰۵ کلومیٹر* میں مشرق وسطیٰ اور یورپی ممالک کی سیاحت کا احوال رقم کیا ہے۔

دورانِ سفر وہ جن تجربات اور مشاہدات سے گذرے ان کو انھوں نے بہت ہی خوبصورت لفظوں میں بیان کر دیا۔ تاہم انھوں نے کسی بھی ملک کو بطورِ سیّاح کی طرح دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ زیادہ تر معلومات اخذ اور استفادے سے ہی حاصل کیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق اس سفرنامے پر سرقے کا الزام بھی ثابت ہو چکا ہے۔

صغرا مہدی ، *مشاہداتِ ابن بطوطی*

صغرا مہدی نے انگلستان کا سفر اختیار کیا اور اس سفر کے دوران پیش آنے والے تجربات، مشاہدات اور یاداشتوں کو بڑے خوب صورت طرز بیاں سفرنامہ *مشاہداتِ ابن بطوطی* میں رقم کر دیا۔ اس سفرنامے میں انگلستان کو دریافت کرنے کی کوشش تو دکھائی نہیں دیتی البتہ قاری ان کے دلکش اسلوب بیان سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔

۹۔ طنز و مزاح کے رجحان پر مبنی سفرنامے

دورِ حاضر میں بہت سے نئے رجحانات اردو سفرنامے کی روایت کا حصہ بنے اور کچھ عرصہ قبولِ عام کا درجہ پانے کے بعد رفتہ رفتہ اپنی قدر و قیمت کھونے لگے۔ طنزیہ اور مزاحیہ سفرنامہ لکھنے کا رجحان بھی اردو سفرنامے کی روایت کا حصہ بنا۔ یہ رجحان دراصل علمی اور ادبی رجحان کے حامل سفرناموں کے ردّ عمل کے طور پر سامنے آیا۔ اس رجحان کے حامل سفرنامہ نگاروں نے سفر کو خوشی و مسرت کا وسیلہ بنایا اور اس دوران پیش آنے والے مصائب اور مشکلات میں بھی ہنسی اور مذاق کے پہلو تلاش کئے۔ اس رجحان کے حامل سفرنامہ نگاروں نے فنِ سفرنامہ میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے طنز و مزاح کو وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔ اس مطالعے کا موضوع چونکہ ابنِ انشا کے سفرنامے ہیں جو اسی رجحان کے نمائندہ ہیں۔ انشا نے نہ صرف خود اپنے سفرناموں میں اس رجحان کو اپنایا بلکہ نئے لکھنے والوں کے لیے بھی اس رجحان کو قابلِ تقلید بنایا۔

اس رجحان کی حامل چند نمایاں کاوشیں درج ذیل ہیں:

جمیل الدین عالی ، *دنیا میرے آگے، تماشا میرے آگے*

جمیل الدین عالی ایک نامور ادیب، شاعر، کالم نگار اور سفرنامہ نگار ہیں۔ انھوں نے *دنیا میرے آگے* اور *تماشا میرے آگے* کے عنوان سے دو سفرنامے لکھے۔ اولذکر سفرنامے میں فرانس، برطانیہ، روس، مصر، لبنان، ایران اور دہلی کے سفر کی یاداشتوں کو محفوظ کیا گیا ہے اور دوسرے سفرنامے میں جرمنی، اٹلی، سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ اور امریکہ کے سفر کا احوال درج کیا گیا ہے۔ یہ دونوں سفرنامے پہلے پہل کالموں کی صورت میں چھپے اور بعد میں کتابی صورت میں شائع کیا گئے۔ ان سفرناموں میں تاریخی، تہذیبی، جغرافیائی اور سیاسی معلومات کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کے عنصر کو بھی کثرت سے برتا

گیا ہے۔ جمیل الدین عالی کے ہاں طنز کی کاٹ اور نشتریت کہیں کہیں مزاح کے عنصر پر بھی غالب آجاتی ہے۔ انھوں نے یوں تو شاعرانہ اندازِ بیان سے ہی کام لیا لیکن ان کے ہاں یہ انداز سہل ممتنع کی کیفیت لئے ہوئے ہے۔

ابن انشا ، چلتے ہو تو چین کو چلیے، دنیا گول ہے، ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں، نگری نگری پھرا مسافر، آوارہ گرد کی ڈائری

ابن انشا ایک مشہور شاعر، کالم نگار، مترجم اور سفر نامہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر اختیار کیا اور ان کا احوال اپنے پانچ مشہور سفر ناموں *چلتے ہو تو چین کو چلیے*، *دنیا گول ہے*، *ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں*، *آوارہ گرد کی ڈائری*، *نگری نگری پھرا مسافر* میں قلمبند کر دیا۔ یہ سفر نامے پہلے تو کالموں کی صورت میں کراچی کی اخبارات میں چھپے اور بعد میں کتابی صورت میں شائع کیے گئے۔ انشا نے یہ سفر چونکہ سرکاری فرائض کی انجام دہی کی غرض سے اختیار کیے تھے اس لیے ان کے ہاں اشیاء و مظاہر کو کھوجنے اور دریافت کرنے کا جذبہ مفقود دکھائی دیتا ہے۔ تاہم انھوں نے پاکستان اور بیرونی ممالک کی معاشرت کا تقابل کر کے اختلافی صورتحال کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اس مقصد کے لئے کبھی وہ مزاح اور کبھی طنزِ لطیف سے کام لیتے ہیں۔ ان کے سفر ناموں کی نمایاں خوبی ان کا منفرد اسلوب ہے جو سادگی و روانی اور شگفتگی اور بے ساختگی کے حسین امتزاج سے تشکیل پاتا ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک، ان کے اسلوب بیاں کو سراہتے ہوئے اپنی کتاب *اندازِ نظر* میں لکھتے ہیں:

> ''صحافتی اندازِ نظر کی بجائے فکری تازگی اور ادبی رکھ رکھاؤ بدرجہ اتم موجود ہے۔ ابنِ انشا کا گھرے بیٹھے طرز کا حامل شگفتہ و شاداب اندازِ بیان اور انسان دوستی کا رچا ہُوا شعور اس پر مستزاد ہے'' [11]

کرنل محمد خان ، بسلامت روی، بجنگ آمد

کرنل محمد خان نے سوئٹزرلینڈ، انگلستان، فرانس، جرمنی اور ترکی کا سفر کیا اور حالاتِ سفر سفر نامہ *بسلامت روی* میں بیان کر دیئے۔ انھوں نے *بجنگ آمد* کے نام سے بھی ایک سفر نامہ لکھا لیکن ڈاکٹر انور سدید اسے سفر نامے کی بجائے رپورتاژ قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں بذلہ سنجی کا مادہ فطری طور پر موجود تھا یہی وجہ ہے کہ وہ اشیاء اور مظاہر کا احوال بڑے ہلکے پھلکے اور شگفتہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے کبھی وہ رعایتِ لفظی سے کام لیتے ہیں اور کبھی صورت واقعہ سے۔ سفر نامہ *بسلامت روی* کے کئی ایڈیشن منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ یہ سفر نامہ پہلی بار جون ۱۹۷۵ء، دوسری مرتبہ اگست ۱۹۷۵ء، تیسری مرتبہ فروری ۱۹۷۶ء اور چوتھی مرتبہ اگست ۱۹۷۷ء میں طبع ہوا۔

غلام الثقلین نقوی ، لاہور سے لاڑووال تک

غلام الثقلین نقوی نے لاہور سے لاڈو وال تک کا سفر اختیار کیا اور اس سفر کی یاداشتوں کو سفر نامہ *لاہور سے لاڈو وال تک* میں محفوظ کر دیا۔ سفر نامہ نگار نے سفر کے مصائب اور مشکلات پر رونے دھونے کی بجائے خود اس پر ہنسنے اور دوسروں کو ہنسانے کا حوصلہ پیدا کیا۔ ڈاکٹر انور سدید اس سفر نامے کو سفر نامے کی پیروڈی قرار دیتے ہیں یوں یہ سفر نامہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک منفرد سفر نامہ ہے۔

الغرض اردو ادب میں سفر نامہ تا حال ایک نومولود صنفِ ادب تصور کی جاتی ہے۔ اس صنف نے وقت کے ساتھ ساتھ بہت ترقی کی ہے اور بہت سے نئے رجحانات اور عناصر نے اس کے دامن کو وسیع کیا ہے لیکن اب بھی اسے نئی وسعتوں اور جہتوں سے آشنا کرنے کی ضرورت موجود ہے۔

ابنِ انشا (سوانحی خاکہ)

ابن انشا کا شمار اردو ادب کی اہم شخصیات میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقی کاوشوں سے نہ صرف عوام و خواص کو متاثر کیا بلکہ تحقیق و تنقید سے دلچسپی رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی جانب متوجہ بھی کیا۔ جن محققین اور ناقدین نے ان کی شخصیت اور فن کو اپنے تحقیقی اور تنقیدی مطالعوں کا موضوع بنایا ان میں سے چند ایک کے نام اور کارہائے نمایاں درج ذیل ہیں۔

۱۔ *ابنِ انشا کی زندگی اور تصانیف*، محمد سلیم ملک، شعبہ اردو، کراچی یونیورسٹی۔ کراچی ۱۹۷۵ء

۲۔ *ابنِ انشا کی مزاح نگاری*، شبانہ چوہان، شعبہ اردو، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان ۱۹۸۱ء

۳۔ *اردو صحافت میں ابنِ انشا کا حصہ*، نباہت شیریں، شعبہ صحافت، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۸۳ء

۴۔ *ابنِ انشا احوال و آثار*، ڈاکٹر ریاض احمد ریاض، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۸ء

۵۔ *ابنِ انشا شخصیت اور فن*، اے حمید، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء

اس باب کو تحریر کرتے ہوئے یوں تو ہم نے سب کتابوں سے استفادہ کیا مگر خصوصیت سے آخری دو کو ماخذ بنایا گیا ہے۔

ابنِ انشا ایک قد آور علمی اور ادبی شخصیت تھے۔ ایسی شخصیات کا وجود تعمیر و تشکیل کے ایک طویل عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جس میں بہت سے داخلی اور خارجی عوامل کلیدی کردار ادا کرتے ہیں اور ان کی شخصیت کے نمایاں رخ متعین کر کے انھیں بالآخر ایک مخصوص شخصی قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ انشا کی شخصیت کے در پردہ بھی یقیناً ماحول، وراثت، تعلیم و تربیت اور سیاسی، سماجی، تہذیبی اور مذہبی پس منظر جیسے داخلی اور خارجی عوامل کارفرما رہے ہوں گے۔ جنھوں نے ایک عام سے انسان کو ایک قد آور علمی و ادبی شخصیت بنا دیا۔

انشا کا عرصہءحیات تقریباً اکیاون برس پر محیط تھا جس میں بہت سی اہم تبدیلیاں اور موڑ آئے جنھوں نے ان کی زندگی کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ ذیل میں ان کی زندگی میں آنے والے موڑ اور تبدیلیوں کو ذیل میں مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔

وطن، بچپن کا زمانہ:

کسی بھی شخص کی زندگی میں اس کے وطن اور بچپن کے حالات و واقعات کا بہت عمل دخل ہوتا ہے۔ انشا کی زندگی پر بھی ان کے آبائی وطن اور بچپن کے حالات و واقعات کا بہت گہرا اثر تھا۔ اے حمید کے مطابق ابنِ انشا کا اصل نام ''شیر محمد'' تھا اور وہ ضلع لدھیانہ کی تحصیل پھلور کے ایک گاؤں ''تھلہ'' میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد چوہدری منشی کا تعلق ایک راجپوت گھرانے سے تھا۔ انشا کی تاریخ پیدائش کیا ہے، اس کا صحیح علم تو انشا کو بھی نہ تھا لیکن وہ ۱۵ جون ۱۹۲۷ء ہی کو اپنا تاریخِ پیدائش بتاتے تھے۔ تاہم ہمیں ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں کچھ اشارے اے حمید کی کتاب *ابنِ انشا شخصیت اور فن* سے ملتے ہیں جس میں انشا کے شعری مجموعے چاند نگر طبع اول کا دیباچہ شامل ہے۔ اس دیباچے میں وہ اپنی شاعری کی غرض و غایت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یہ دراصل زندگی کے خاکے ہیں جو میں نے ان اٹھائیس برس میں بسر کی ہے'' [۱۲]

اس دیباچے کے آخر میں انھوں نے شعری مجموعے چاند نگر کا سن اشاعت ۱۵ جون ۱۹۵۵ء لکھا ہے یوں ہم، چاند نگر کے سنہ اشاعت اور درجہ بالا حوالے سے بآسانی ان کی عمر کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

انشا کے والدین کے ہاں تین لڑکے، شیر محمد (انشا)، سردار احمد، ریاض احمد اور چار لڑکیاں عصمت آرا، نادرہ خاتون، حمیدہ بانو اور بلقیس پیدا ہوئیں۔ انشا اپنے والدین کی پہلوٹھی کی اولاد تھے اس لیے وہ والد اور والدہ کی محبت اور لاڈ پیار کے زیادہ مستحق ٹھہرے۔

ابتدائی تعلیم:

انشا کے والد، چوہدری منشی خان ایک باشعور انسان تھے انھیں علم سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ انھوں نے خود بھی واجبی تعلیم حاصل کی اور اپنے بچوں کی تعلیم میں بھی خصوصی دلچسپی لی، انھوں نے ننھے شیر محمد (ابنِ انشا) کو تقریباً ساڑھے پانچ سال کی عمر میں گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل کروا دیا۔ انشا نے پرائمری کا امتحان اول پوزیشن میں پاس کیا اور پھر مزید تعلیم کے لیے گاؤں سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر واقع ایک قصبے ''اپرہ'' کے مڈل سکول میں داخل ہو گئے اور یہاں سے ورنیکلر مڈل کا امتحان پاس کیا۔ انھوں نے آٹھویں جماعت تک انگریزی زبان نہیں پڑھی تھی لیکن ہائی سکول میں داخلے کے لیے انگریزی زبان سے واقفیت لازمی قرار دی گئی تھی۔ چنانچہ وہ لدھیانہ کے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہو گئے تاکہ انگریزی زبان سیکھ کر ہائی سکول میں داخلے کے اہل ہو سکیں۔ انھوں نے انگریزی زبان کے علاوہ یہاں فارسی اور ہندی

زبان بھی بطور اختیاری مضمون کے پڑھیں۔ یوں انگریزی زبان سے واقفیت کے بعد وہ ہائی سکول میں داخلے کے اہل قرار دے دیئے گئے۔

انؔشا کی فطرت میں شاعری کا ملکہ شروع ہی سے موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بہت کم عمری میں ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنی ابتدائی شاعری کا باقاعدہ آغاز لدھیانہ ہائی سکول ہی سے کر دیا تھا۔ اے حمید کے مطابق انھوں نے اپنی ابتدائی کوششوں میں سب سے پہلے جو تخلص اختیار کیا وہ ''مایوس صحرائی'' تھا۔ اس کے بعد اپنے شفیق استاد مولوی برکت علی کے مشورے سے انھوں نے ''قیصر'' تخلص رکھ لیا۔ زمانہ طالبعلمی کے دوران انھوں نے جو شاعری بھی کی وہ زیادہ تر ''شیر محمد'' کے نام سے ہی کی۔ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے اپنا قلمی نام ''ابنِ انؔشا'' رکھ لیا جو بعدازاں اس قدر مشہور ہوا کہ آج تک ہم انھیں صرف ''ابنِ انؔشا'' کے نام ہی سے جانتے ہیں۔

انؔشا رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے:

ہر ماں کی طرح انؔشا کی والدہ کے دل میں بھی اپنے بیٹے کی شادی کا ارمان تھا۔ جب انؔشا نویں جماعت کے امتحان سے فارغ ہوئے تو ان کی والدہ نے ان کی شادی لدھیانہ کے ایک خلجی خاندان میں کر دی، یہ واقعہ مارچ ۱۹۴۱ء کا تھا۔ انؔشا کے سسر عطا محمد خلجی کی پانچ بیٹیاں اور دو بیٹے تھے، انؔشا کی شادی ان کی دوسری بیٹی ''عزیزہ بی بی'' سے ہوئی تھی جن سے ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئے۔ ان میں سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی بچپن میں ہی وفات پا گئے۔ انؔشا کی شادی کے بعد ان کی والدہ اور زوجہ کی باہمی چپقلش کے سبب گھریلو ماحول اکثر کشیدہ رہا بلکہ خود انؔشا بھی ان گھریلو مسائل کے باعث ذہنی کرب اور اذیت کا شکار رہے۔

میٹرک کے امتحان میں امتیازی پوزیشن:

انؔشا نے ۱۹۴۲ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ انھوں نے اپنے سکول میں پہلی پوزیشن اور پنجاب میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ محکمۂ تعلیم نے ان کے لئے وظیفے کا اعلان بھی کیا لیکن انؔشا اپنی مالی مشکلات کے سبب اپنے تعلیمی سلسلے کو پھر بھی جاری نہ رکھ سکے۔

بٹھنڈہ میں فکرِ معاش کی کوشش:

شادی کے بعد انؔشا کو اپنی نئی ذمہ داریوں کا احساس ہونے لگا۔ انھوں نے چند دن تک تو لدھیانہ میں قیام کیا لیکن پھر جلد ہی روزگار کی تلاش کی غرض سے بٹھنڈہ کا سفر اختیار کیا۔ یہاں انھوں نے ملازمت کی تلاش کے لیے بہت کوشش کی اور در در کی خاک چھانی لیکن پھر بھی انھیں اس مقصد میں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ مسلسل ناکامی اور بے کسی سے وہ دلبرداشتہ ہو کر مایوسی کا شکار ہو گئے۔

لاہور میں حمید نظامی تک رسائی:

انشا نے اپنے مالی مسائل کے حل کے لیے پہلے تو خود انتھک کوشش کی لیکن جب وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہوئے تو پھر انھوں نے کسی ہمدرد اور خیر خواہ کی مدد لینا مناسب سمجھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے انھوں نے روزنامہ نوائے وقت کے چیف ایڈیٹر حمید نظامی کو ایک خط لکھا اور اپنے تمام حالات اور مصائب و مشکلات سے آگاہ کر کے اس سلسلے میں رہنمائی اور مدد کے لیے درخواست کی۔ حمید نظامی نے جواب میں انھیں تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا اور اپنی مکمل رہنمائی اور مدد کا یقین دلایا۔ انھوں نے انھیں لاہور آنے کا مشورہ دیا۔ انشا ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے لاہور پہنچ گئے جب وہ یہاں آ گئے تو حمید نظامی نے انھیں اسلامیہ کالج میں داخل کروا دیا اور رہائش کے لیے اخبار کے دفتر کا ایک کمرہ بھی دے دیا تا کہ ان کی مشکلات کو کسی حد تک کم کیا جا سکے۔ انشا نے حمید نظامی کے مشورے پر نہ صرف تعلیمی سلسلے کا دوبارہ آغاز کیا بلکہ وہ لاہور کی علمی و ادبی محفلوں میں بھی شرکت کرنے لگے۔ اس دوران ان کی کچھ ادبی تحریریں نیرنگ خیال، مخزن، عالمگیر اور ہزاومستان میں بھی شائع ہوئیں۔ البتہ لاہور قیام کے دوران وہ معاشی مسائل کے بوجہ زیادہ تر بے یقینی اور بدحالی کا شکار رہے اس لئے کچھ عرصہ بعد بالآخر تنگ آ کر وہ لدھیانہ واپس چلے گئے۔

انبالہ چھاؤنی میں عارضی ملازمت:

انشا نے لدھیانہ آ کر سکون کا سانس لیا اور کچھ روز انھوں نے ہنسی خوشی سے گزار دیئے۔ سسرال کی محبت اور خاطر داری نے ان کے دل و دماغ میں موجود بے یقینی اور مایوسی کے احساس کو کسی قدر کم کر دیا لیکن چند دن بعد پھر غمِ روزگار نے انھیں بے چین کر دیا۔ چنانچہ اُنھوں نے دوبارہ ہمت باندھی اور ۱۹۴۳ء میں انبالہ کا رخ کیا۔ بہت کوشش کے بعد انھیں انبالہ چھاؤنی میں ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر میں عارضی کلرک کی ملازمت مل گئی۔ کچھ عرصہ تو وہ اس ملازمت سے منسلک رہے لیکن بعد میں انھوں نے یہ ملازمت بھی چھوڑ دی۔

فاضل ادیب، فاضل منشی اور بی اے کے امتحان میں کامیابی:

انشا کو اپنے والد کی طرح علم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔ انھوں نے اپنے تعلیمی سلسلے کا دوبارہ آغاز کیا اور فاضل ادیب اور فاضل منشی کا امتحان کامیابی سے پاس کر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان بطور پرائیویٹ امیدوار کے درجۂ اول میں پاس کیا۔ اسی دوران انھوں نے تحریر و تصنیف کے سلسلے کو بھی جاری رکھا اور مشہور روسی مُصنّف یوجین چرخوف کے ناول کا ترجمہ مجبور کے نام سے کیا۔

دہلی آمد:

دہلی میں امپیریل کونسل آف اگیریکلچرل نام کا ایک ادارہ تھا جو انگریزی میں انڈین فارمنگ کے نام سے ایک اخبار شائع کرتا تھا۔اس اخبار میں زرعی امور و مسائل کے بارے میں تحریریں اور مضامین شائع کیے جاتے تھے۔اس ادارے نے انڈین فارمنگ کے انگریزی ایڈیشن کے ساتھ ساتھ اس کا اردو اور ہندی ایڈیشن شائع کرنے کا فیصلہ بھی کیا۔اس مقصد کے لیے انھیں کچھ اہل قلم کو ضرورت تھی۔ انؔشا نے بھی یہاں ملازمت کے حصول کی کوشش کی جس میں انھیں کامیابی ہوئی۔ ان کے مطابق وہ جنوری یا فروری ۱۹۴۷ء تک اس ملازمت سے وابستہ رہے اور اس دوران انھوں نے اس ادارے کے لیے بہت سی تحریریں اور مضامین بھی لکھے جو کسی وجہ سے شائع نہ ہو سکے۔

آل انڈیا ریڈیو سے پاکستان ریڈیو منتقلی:

انؔشا نے آل انڈیا ریڈیو اور پاکستان ریڈیو اسٹیشن میں بھی اپنی خدمات سرانجام دیں۔ دراصل ہوا یوں کہ آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر پطرس بخاری نے نوجوان نسل کو متعارف کرانے کی ٹھان لی اور اس سلسلے میں بہت سے نوجوانوں کو قسمت آزمائی کا موقعہ بھی دیا۔ انؔشا نے بھی کئی نوجوانوں کو طرح یہاں قسمت آزمائی کی اور وہ اس اسامی کے لیے منتخب ہو گئے، یوں اس طرح انؔشا آل انڈیا ریڈیو کا حصہ بن گئے۔ یہاں کام کرتے ہوئے انھیں ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ تقسیم ہند کا واقعہ پیش آ گیا۔ جس سے ایک بڑے پیمانے پر لوگوں کی منتقلی کے عمل کا آغاز ہو گیا۔قیام پاکستان کے بعد آل انڈیا ریڈیو کے جن مسلمان ملازمین نے پاکستان منتقلی کا ارادہ ظاہر کیا انھیں ریڈیو پاکستان منتقل کر دیا گیا۔ انؔشا نے بھی پاکستان منتقلی کا ارادہ ظاہر کیا تھا اس لیے انھیں بھی ریڈیو پاکستان منتقل کر دیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد انھوں نے اپنے اہل خانہ سمیت پاکستان ہجرت کی اور لاہور کو اپنا مسکن بنایا۔ یہاں آ کر انھوں نے ریڈیو پاکستان لاہور کے شعبۂ خبر میں بطور مترجم اپنی خدمات سرانجا م دینی شروع کر دیں۔

ریڈیو پاکستان کے شعبۂ خبر کی لاہور سے کراچی منتقلی:

۱۹۴۹ء میں ریڈیو پاکستان کا شعبۂ خبر لاہور سے کراچی منتقل ہوا تو انؔشا کو بھی باقی ملازمین کی طرح اپنے فرائض کی سر انجام دہی کے لیے کراچی جانا پڑا۔ انھوں نے اگست ۱۹۴۹ء سے وہاں اپنے سرکاری فرائض سرانجام دینے شروع کر دیئے۔

پہلی دستور ساز اسمبلی میں عارضی ملازمت:

ریڈیو پاکستان کی ملازمت سے بھی انؔشا معاشی طور پر آسودہ حال نہ ہو سکے۔ چنانچہ انھوں نے کسی اچھی ملازمت کے حصول کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ ۱۹۵۰ء میں انھیں پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کی سکیرٹریٹ

میں عارضی سینئر ٹرانسلیٹر کی ملازمت مل گئی۔ ڈاکٹر ریاض احمد اس ملازمت کو ان کے لیے مالی آسودگی کا ایک وسیلہ قرار دیتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنی کتاب *ابن انشا احوال و آثار* میں لکھتے ہیں کہ

> ''اگست ۱۹۵۰ء میں انہیں ملک کی پہلی دستور ساز اسمبلی کی سیکرٹیریٹ میں عارضی سینئر ٹرانسلیٹر کی ملازمت ملی اور سکیل کے علاوہ تنخواہ میں بھی لگ بھگ چالیس/۴۰ روپے کا اضافہ ہوگیا'' ۱۳؎

پہلی بیوی سے مستقل علیحدگی:

انشا کی والدہ اور بیوی کے درمیان تعلقات یوں تو شروع ہی سے کشیدہ رہے لیکن اس تناؤ اور کشیدگی نے بالآخر طول پکڑ لیا۔ بیگم انشا گو کہ ایک صابر شاکر اور کم گو خاتون تھیں لیکن پھر بھی وہ روز روز کے لڑائی جھگڑوں سے تنگ آ چکی تھیں۔ انھوں نے اس ذہنی اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لئے میکے جانے کا فیصلہ کر لیا اور ۱۹۵۱ء میں وہ اپنے میکے چلی گئیں۔ انشا کو جب اس ساری صورتحال کی اطلاع ملی تو انھوں نے خود حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کی لیکن بیگم انشا جو انشا کی والدہ سے مکمل طور پر خائف ہو چکی تھیں اب کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہ تھیں۔ لہٰذا اب انھوں نے مشترکہ گھر میں رہنے سے انکار کر دیا اور الگ گھر کا مطالبہ کر دیا۔ انشا نے اس مطالبے کو اپنی والدہ کی ناراضگی کے پیشِ نظر قبول نہ کیا کیوں کہ وہ اپنی والدہ کو ناراض کر کے اپنی بیوی کا مطالبہ نہیں مان سکتے تھے۔ یوں اس مطالبے کے مسترد ہوتے ہی انشا اور بیگم انشا کے راستے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے یعنی ان میں مستقل علیحدگی ہو گئی۔

صحافی محمد اختر سے ملاقات:

کراچی میں قیام کے دوران انشا کی ملاقات ایک صحافی محمد اختر سے ہوئی جو مشہور انگریزی اخبارات ڈان اور ٹائمز سے منسلک تھے۔ یہ ملاقات جلد ہی گہرے دوستانہ تعلقات میں بدل گئی اور یوں محمد اختر کی صورت میں انشا کو ایک مخلص، ہمدرد اور غمخوار دوست مل گیا۔

محمد اختر سے ملاقات سے پہلے تک انشا اکثر کرب اور اضطراب کی کیفیت سے دوچار رہتے تھے کیونکہ ان کے لیے اپنی پہلی بیوی سے علیحدگی کا صدمہ کسی سانحے سے کم نہ تھا۔ لیکن محمد اختر جیسے غمخوار دوست کو پا کر انھیں ان تمام دکھوں اور تکالیف کا احساس کسی قدر کم ہونے لگا۔ ان کی پریشان حال زندگی میں صحافی محمد اختر تازہ ہوا کا ایک جھونکا ثابت ہوئے۔ بقول ڈاکٹر ریاض احمد، انشا ان کی دوستی اور رفاقت میں اپنی زندگی کے غموں اور تلخیوں کو بھلانے لگے تھے۔ محمد اختر نے نہ صرف ان کی ذاتی زندگی پر خوشگوار اثرات مرتب کیے بلکہ ان کے تحریری و تصنیفی سلسلوں کو آگے بڑھانے میں بھی مدد دی۔ انھوں نے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے ان کی کئی تحریریں اور مضامین روزنامہ ڈان اور ٹائمز میں چھپوانے میں ہر قسم کی ممکنہ امداد فراہم کی۔ یوں صحافی محمد اختر کی دوستی سے انشا کو نہ صرف قلبی اطمینان حاصل ہوا بلکہ ان کی ذاتی زندگی

بھی ایک نئی ڈگر پر چل نکلی۔ لیکن یہ خوشی بھی انؔشا کو راس نہ آئی اور ایک دن محمد اختر اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث وفات پا گئے ۔ یہ سانحہ ۲۰ نومبر ۱۹۵۷ء کو پیش آیا جب ان کی عمر صرف ۳۲ سال تھی۔ انشاؔ کو ان کی موت سے بے حد صدمہ پہنچا بلکہ کافی عرصہ تک وہ اس غم کو بھلا نہ سکے۔ کیوں کہ محمد اختر ان کی پریشان حال زندگی میں ایک مضبوط سہارا ثابت ہوئے تھے لیکن ان کی وفات سے یہ سہارا بھی عارضی ثابت ہوا۔ اب زندگی کی تپتی دھوپ میں انؔشا ایک بار پھر تنہا اور پریشان حال رہ گئے ۔ انھوں نے محمد اختر کے نام سے ایک کتاب *اختر کی یاد میں* مرتب کی اور ان کی یاد میں ایک نوحہ بھی لکھا جس میں انھوں نے اپنے دوست کے لئے اپنی دلی کیفیات کا اظہار بڑے دل گداز انداز میں کیا۔ اس نوحے ''اے دور نگر کے بنجارے'' میں انؔشا نے صحافی محمد اختر کے لیے اپنی دلی کیفیات اور جذبات کا اظہار جس انداز میں کیا ہے وہ اس نوحے کے درج ذیل اشعار میں ملاحظہ کیجئے:

''ہر سال رُتوں کی گردش سے جب بیس دسمبر آئے گی
یہ اشک چھما چھم برسیں گے، ہر آہ گھٹا بن جائے گی
تم عرش کے ایک فرشتے تھے، بس فرش کی چوکھٹ چوم گئے
تم تیس برس تک دنیا میں معصوم رہے معصوم گئے
ہم یاد کی روشن شمعوں سے اس جی میں اُجالا رکھیں گے
اور سینے میں آبادی کا ساماں نرالا رکھیں گے
تم اجنبی اجنبی راہوں میں جب تھک جاؤ اک کام کرو
اس دل میں آن قیام کرو، اسے سینے میں بسرام کرو'' [۱۴]

اعلیٰ تعلیم

انؔشا کو شروع ہی سے تعلیم حاصل کرنے بے حد شوق تھا۔ اس کا کچھ اندازہ تو ہمیں ان کے شاندار تعلیمی ریکارڈ کو دیکھ کر بھی ہوتا ہے۔ البتہ کئی بار مالی مشکلات کے سبب انھیں اپنے تعلیمی سلسلے کو منقطع کرنا پڑا لیکن جب حالات ذرا بھی بہتر ہوئے تو انھوں نے اپنے تعلیمی سلسلے کا دوبارہ آغاز ضرور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۵۱ء میں اردو کالج کراچی میں ایم اے اردو کی کلاسوں کا آغاز کیا گیا تو انؔشا نے بھی ایم اے اردو میں داخلہ لے لیا۔ حسب روایت اس بار بھی انھوں نے محنت اور کوشش کو اپنا شعار بنایا اور ایم اے اردو میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ ایم اے کے بعد انھوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے لئے اپنی کوششوں کا آغاز کر دیا۔ چنانچہ تحقیق کے لئے انھیں ''اردو نظم کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ'' کا عنوان دیا گیا اور مولوی عبدالحق کو ان کا نگران مقرر کیا گیا لیکن وہ اپنی دیگر مصروفیات کے بوجہ اس تحقیقی کام کو مکمل نہ کر سکے۔ یوں انؔشا کی

ڈاکٹریٹ کی تعلیم کا خواب ادھورا رہ گیا۔

پہلے شعری مجموعے چاند نگر ۱۹۵۵ء کی اشاعت

انشا فطری طور پر شاعری کا میلان رکھتے تھے۔انھوں نے شاعری کا آغاز یوں تو بہت ہی چھوٹی عمر سے کر دیا تھا جو زیادہ تر ان کی ابتدائی کوششوں پر مبنی ہے۔لیکن ان کا پہلا شعری مجموعہ چاند نگر کے نام سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔اس شعری مجموعے کو ادب اور شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں نے بے حد پذیرائی بخشی ۔اے حمید انشا کے پہلے شعری مجموعے چاند نگر کے بارے میں اپنی کتاب *ابن انشا ___ یادیں باتیں* میں لکھتے ہیں:

''ابن انشا کی طبع زاد نظموں اور غزلوں کی پہلی کتاب'' چاند نگر'' مکتبہ اردو نے ۱۹۵۵ء میں طبع کی'' ۱۵

عشق:

کوئی بھی صاحب قلم اپنی ذات اور اپنے قلم کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتا۔انشا کی شاعری، دیگر ادبی تخلیقات اور خطوط سے نہ صرف ان کی گھریلو زندگی کی تفصیلات ملتی ہیں بلکہ ان کے ایک عشق کے بارے میں بھی چند اشارے ملتے ہیں۔جس سے یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے زندگی میں ایک بار عشق ضرور کیا تھا۔ ڈاکٹر ریاض کے مطابق اس عشق کا آغاز دفتر کے فون پر غیر رسمی بات چیت سے ہوا۔لیکن بعد میں اس نے انھیں ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا۔ان کے مطابق جس لڑکی سے انشا کو محبت ہوئی تھی اس کا نام تو انھیں معلوم نہ تھا لیکن انھوں نے خود ہی اس کا نام ''چاند'' رکھ لیا تھا۔یہ لڑکی پہلے سے شادی شدہ تھی لہٰذا اس سلسلے میں انشا کی تمام کوششیں بے کار گئیں۔عشق میں ناکامی کے بعد وہ اکثر رنجیدہ رہنے لگے بلکہ کئی بار تو انھوں نے دلبرداشتہ ہو کر خودکشی کرنے کی کوشش بھی کی جسے ان کے دوستوں اور خیر خواہوں نے بڑی مشکل سے ناکام بنا دیا۔ان کی شاعری میں بھی عشق میں ہونے والی مایوسی اور ناکامی کا بیان جا بجا ملتا ہے اس سلسلے میں ان کے شعری مجموعے ''اس بستی کے اک کوچے میں'' کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

''اس شخص نے یوں کون سا میداں نہیں مارا
بس عشق کی بازی میں ہوئی مات عزیزو
اُس میں بھی رہا ہاتھ یہ شیرازہ سخن کا
عُشّاق کے مطلب کی غزلیات عزیزو'' ۱۶

بطور مترجم خدمات:

انشا نے ادارہ مطبوعات فرینکلن میں بطور مترجم خدمات بھی سرانجام دیں۔انھوں نے مشہور امریکی مصنف

او ہنری کی چھ سو میں سے ۲۰ کہانیوں اور جان سٹیفن بک کے ناول The moon is down کا ترجمہ کیا اور بچوں کے لیے کچھ کتابیں بھی لکھیں۔ انھوں نے پاکستان کی علاقائی زبانوں کی شاعری کے تراجم کے علاوہ *اندھا کنواں* کی چند کہانیاں بھی شائع کیں۔

نیشنل بک سینٹر اور یونیسکو میں فرائض کی انجام دہی:

انشا کو ۱۹۶۲ء میں نیشنل بک سینٹر کا مرکزی ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ انھوں نے اس ادارے کی ترویج اور ترقی کے لیے کئی اقدامات کیے جن میں قیمتی اور نادر کتب کی اشاعت اور کتاب میلوں اور نمائشوں کا انعقاد بھی شامل ہے۔

انشا نے یونیسکو میں بھی اپنی خدمات سرانجام دیں۔ انھیں یونیسکو میں پاکستان کی جانب سے نمائندگی کا اعزاز بھی ملا۔ اس کے علاوہ انھوں نے افغانستان، سری لنکا، انڈونیشیا اور فلپائن میں یونیسکو کے سفیر کی حیثیت سے بھی خدمات سرانجام دیں۔ اس ادارے میں ملازمت کے دوران انھیں دنیا کے مختلف ممالک کے سفر کا موقع بھی ملا جس کا احوال انھوں نے اپنے پانچ مشہور سفرناموں میں قلم بند کیا۔

والد کی وفات:

انشا کے والد چوہدری منشی خان لاہور میں ۱۹۶۸ء میں وفات پا گئے، یوں انشا، باپ جیسی شفیق اور مہربان ہستی سے محروم ہو گئے۔

دوسری شادی:

اے حمید کے مطابق پہلی بیوی سے علیحدگی کے تقریباً سترہ سال بعد انشا کی والدہ نے انھیں دوبارہ شادی کے لیے رضامند کر لیا۔ انشا کے قریبی دوست قدرت اللہ شہاب اور ان کی اہلیہ عفت شہاب کی کوششوں سے ان کی شادی ۱۹۶۹ء میں مری کے ایک کشمیری خاندان کی خاتون ''شکیلہ بانو'' سے ہو گئی۔ اس شادی سے انشا کی زندگی پر خوشگوار اثرات مرتب ہوئے۔ دوسری زوجہ سے ان کے دو بیٹے سعدی اور رومی پیدا ہوئے۔

والدہ کی وفات:

انشا کی والدہ جوان سے بے حد محبت کرتی تھیں وہ بھی بالآخر ان کا ساتھ چھوڑ گئیں اور ۱۹۷۰ء میں وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ یوں انشا والد کے ساتھ ساتھ والدہ کی شفقت سے بھی محروم ہو گئے۔

دوسرے شعری مجموعے اس بستی کے اک کوچے میں ۱۹۷۶ء کی اشاعت:

انشا کا پہلا شعری مجموعہ ''چاند نگر'' ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا اس کے بعد ایک طویل مدت تک ان کا کوئی شعری مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا۔ ۱۹۷۶ء میں ان کا دوسرا شعری مجموعہ اس بستی کے اک کوچے میں کے نام سے شائع ہوا۔ یہ شعری مجموعہ ان کی وفات سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے شائع ہوا۔

بیماری اور علاج:

جو شخص بھی اس دنیا میں آئے اسے بالآخر اس جہانِ فانی سے کوچ کر جانا ہے انشا کو لاحق بیماری جو ان کی موت کا سبب بنی اس کا آغاز کیسے ہوا؟ اس سلسلے میں اے حمید اپنی کتاب ابنِ انشا۔ یادیں باتیں میں لکھتے ہیں کہ:

''ابنِ انشا کو کبھی کبھی گلے کی شکایت ہو جایا کرتی تھی۔ لاہور میں، میں نے اسے اکثر نیم گرم پانی کے غرارے کرتے یا گلے میں گلسرین لگاتے دیکھا تھا۔ اُسے زیادہ اہمیت اس لیے نہ دی کہ گلے کی شکایت تو مجھے بھی ہو جایا کرتی تھی۔ ویسے مجھے یاد ہے، ایک بار میں نے اُس سے پوچھا تھا۔''

''تمھیں گلے تو نہیں پڑ گئے۔ میرا مطلب ہے ٹانسلو تو نہیں ہیں؟''

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں پیارے'' [۱۷]

انشا کو یہ مرض تقریباً بیس اکیس برس سے لاحق تھا لیکن انھوں نے پہلی بار اگست ۱۹۷۲ء میں سول اینڈ ملٹری ہسپتال راولپنڈی سے اپنا معائنہ کروایا۔ اس ہسپتال میں ان کا Biopsy کا ٹیسٹ کیا گیا جس کے بعد انھیں HODGKIN کا مرض تشخیص کیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے نیول ہسپتال میں بھی معائنہ کروایا وہاں بھی ہاجکن کا مرض ہی تشخیص ہوا۔ انشا اس بیماری کے علاج کے سلسلے میں پاکستان کے علاوہ روس، ٹوکیو اور لندن بھی گئے لیکن زندگی کی امید انھیں کہیں بھی نظر نہ آئی۔

وفات:

انشا نے اپنی بیماری کے آخری ایام لندن میں گزارے۔ ڈاکٹر ریاض کے مطابق دسمبر ۱۹۷۷ء میں ان کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی۔ پہلے وہ دی رائل مارسیڈن ہسپتال میں داخل کیے گئے اور بعد میں انھیں ATKINSOIX MORLEY HOSPITAL WIMBELDON منتقل کر دیا گیا۔ وفات سے پہلے ہی ان پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ ڈاکٹروں نے ان کی زندگی بچانے کے لیے انھیں ایک انجیکشن لگایا جس سے ان کی حالت مزید بگڑ گئی۔ بالآخر وہ گیارہ جنوری ۱۹۷۸ء بروز بدھ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ۱۲ جنوری جمعرات کی رات ان کا جسد خاکی لندن

Accession No. TH13886

سے کراچی لایا گیا جہاں ان کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔

ابنِ انشا کی دیگر تخلیقی جہات

ابنِ انشا کا شمار اردو ادب کی اہم شخصیات میں ہوتا ہے۔ یوں تو انھوں نے شاعری، ترجمہ نگاری، کالم نگاری اور سفر نامہ نگاری جیسے تخلیقی میدانوں میں اپنے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے لیکن ان کی تخلیقی شخصیت کے دو رخ زیادہ نمایاں ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ انشا بطورِ شاعر

۲۔ انشا بطورِ سفر نامہ نگار

انشا بطورِ شاعر

انشا اپنے عہد کے نمایاں شاعروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں فن اور فکر، دونوں اعتبار سے ایک منفرد راہ اختیار کی۔ وہ ترقی پسند تحریک کے خیالات اور تصورات کے حامی ہونے کے ساتھ ساتھ رومانوی تحریک کے طرزِ احساس سے بھی متاثر تھے۔ البتہ ان کی ابتدائی شاعری پر رومانوی طرزِ احساس کے اثرات زیادہ غالب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے فنی اعتبار سے بھی ایک منفرد اسلوب اپنایا جس میں ہندی اور فارسی زبان کے الفاظ کثرت سے برتے گئے۔ ڈاکٹر ریاض احمد انھیں اردو کی شعری روایت میں غزلِ جدید اور جدید تر کے درمیان ایک کڑی سمجھتے ہیں۔ انشا کی شاعری نے وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی کروٹیں لیں جنھیں چار مراحل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جو درج ذیل ہیں:

شاعری کا پہلا مرحلہ:

انشا کی شاعری کا پہلا مرحلہ ان کے طالب علمی کے زمانے کی ابتدائی کوششوں پر مبنی ہے۔ اس دور میں ان کا رجحان زیادہ تر اظہار کی جانب رہا کیوں کہ اس دور میں ان کی سوچ اور فکر اتنی پختہ نہیں تھی کہ معاشرے کے اہم اور سنجیدہ مسائل کو نظم کر سکتی۔ لہٰذا اس دور کی شاعری میں ان کے ہاں عام موضوعات کو نظم کرنے کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے فارسی زبان کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اس کے بعد ایک طویل مثنوی بھٹنڈہ اور ایک نظم عید پر کے عنوان سے لکھی۔ پھر انھوں مزید دو نظمیں لکھیں جو ان کے پہلے شعری مجموعے چاند نگر میں شامل ہیں۔ ان نظموں کے نام اور سنہ اشاعت کے سلسلے میں وہ اپنے پہلے شعری مجموعے "چاند نگر" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

سائے سے، ۱۹۴۴ء ۱۸

انتظار کی رات، ۱۹۴۵ء ۱۹

اس کے بعد بھی انھوں نے کچھ نظمیں لکھیں جن میں ، وہ دریچے ، فروگزاشت اور لوگ پوچھیں گے، شامل ہیں۔ڈاکٹر ریاض احمد کے مطابق ۱۹۴۸ءتک ان کا مطبوعہ کلام صرف سات اشعار پر مشتمل تھا۔

شاعری کا دوسرا مرحلہ (شعری مجموعے چاند نگر ۱۹۵۵ء کی اشاعت)

انشا کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ شاعر بنے نہیں بلکہ پیدا ہوئے تھے تو غلط نہ ہوگا۔ یوں تو انھوں نے نوعمری کے زمانے ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن ان کی شاعری کا باقاعدہ آغاز ان کے پہلے شعری مجموعے چاند نگر کی اشاعت سے ہوا۔ان کا یہ شعری مجموعہ پہلی بار ۱۹۵۵ء کے وسط میں شائع ہوا جسے شعر وادب سے دلچسپی رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد نے بے حد سراہا۔۲۰۰۹ء تک اس شعری مجموعے کے کل ۲۱ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔اس شعری مجموعے میں کل ۲۲ مختصر نظمیں شامل ہیں جن میں، چاند کے تمنائی، غمِ رایگاں، ایسی راتیں بھی کتنی گزری ہیں، لوگ پوچھیں گے، سائے سے، انتظار کی رات، وہ دریچے، اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے، انشا نے پھر عشق کیا، فروگزاشت، اداس رات کے آنگن میں، واپسی، صبا کا ایک جھونکا، ڈھلتی رات، پچھلے پہر کے سناٹے میں، خزاں کی ایک شام، چل سو چل اور سرائے شامل ہیں۔اس کے علاوہ اس شعری مجموعے میں ''ریختہ'' کے عنوان سے ۱۹ غزلیات اور ۷ طویل نظمیں بھی شامل ہیں جن میں، بغداد کی ایک رات، شنگھائی، مضافات، امن کا آخری دن، افتاد، کوجے کی لڑائی اور کوریا کی خبریں شامل ہیں۔اس شعری مجموعے میں ان کا نمایاں فکری رخ بھی سامنے آتا ہے کیوں کہ اس مجموعے کی زیادہ تر نظمیں رومانوی طرزِ احساس کی نمائندہ ہیں۔اس شعری مجموعے کی پہلی مختصر نظم کا نام ''چاند کے تمنائی'' ہے۔اس نظم میں بھی انشا نے اپنے دلی جذبات اور احساسات کی ترجمانی بڑے رومانوی انداز میں کی ہے۔اس نظم کے درج ذیل اشعار میں ملاحظہ کریں:

''شہرِ دل کی گلیوں میں
شام سے بھٹکتے ہیں
چاند کے تمنائی
بے قرار سودائی
دل گداز تاریکی
جان گداز تنہائی
رُوح و جاں کو ڈستی ہے
شہرِ دل کی گلیوں میں'' [۲۰]

شاعری کا تیسرا مرحلہ (دوسرے شعری مجموعے اس بستی کے اِک کوچے میں ۱۹۷۶ء کی اشاعت)

انشا کی شاعری کا تیسرا مرحلہ ان کے دوسرے شعری مجموعے اس بستی کے اک کوچے میں پر محیط ہے۔ یہ شعری مجموعہ پہلی بار اگست ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا اور جولائی ۲۰۰۷ء تک اس کے مجموعے کے کل ۲۵ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس شعری مجموعے میں کل ۴۲ مختصر نظمیں، ۲۷ غزلیں اور ۳ طویل نظمیں شامل ہیں۔ بقول انشا یہ شعری مجموعہ ان کے ذاتی جوگ بجوگ سے عبارت ہے، وہ اس شعری مجموعے کی ایک نظم ''دِل اِک کُٹیا دشت کنارے'' کے آغاز میں کہتے ہیں:

''دُنیا بھر سے دُور یہ نگری
نگری دُنیا بھر سے نرالی
اندر ارمانوں کا میلہ
باہر سے دیکھو تو خالی
ہم ہیں اس کٹیا کے جوگی
ہم ہیں اس نگری کے والی'' ۲۱

انشا نے بچوں کے لیے بھی شاعری کی جسے بچوں کے ادب میں ایک منفرد اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس سلسلے کی تین کتابیں درج ذیل زمانی ترتیب سے شائع ہوئیں۔

۱۔	*بلو کا بستہ اور دوسری نظمیں*	۱۹۵۷ء
۲۔	*قِصہ دُم کٹے چوہے کا*	۱۹۷۵ء
۳۔	*میں دوڑتا ہی دوڑتا*	۱۹۷۵ء

شاعری کا چوتھا مرحلہ (تیسرے شعری مجموعے دلِ وحشی ۱۹۸۵ء کی اشاعت)

انشا کی شاعری کا چوتھا مرحلہ ان کے تیسرے اور آخری شعری مجموعے دلِ وحشی کی اشاعت پر مبنی ہے۔ یہ شعری مجموعہ انشا کی وفات کے بعد پہلی بار جولائی ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا اور جولائی ۲۰۰۹ء تک اس کے کل ۳۱ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس شعری مجموعے میں انھوں نے اپنے ذاتی جذبات واحساسات کے ساتھ ساتھ انسانی معاشرے کے اہم مسائل اور مشکلات کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اس مجموعے میں انشا کے مختلف ادوار میں کہے گئے اشعار کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ مجموعہ مختلف قسم کے تجربات واحساسات کے مرقع ہے۔ اس مجموعے کی ایک نظم ''کیسا بلنکا'' میں ان کی شاعری کا ایک نیا رخ ملاحظہ کیجئے۔

''پھر گولیاں چل چل اُدب گئیں ـــــ اے کیسا بلنکا

تری سڑکیں خون میں ڈوب گئیں ___ اے کیسابلنکا
مقتل ہے کہ گھاتی اطلس کی ___ اے کیسابلنکا
گل رنگ ہے ماٹی اطلس کی ___ اے کیسابلنکا
بڑے لشکر لشکر ہتھیارے ___ اے کیسابلنکا
لئے توپیں، ٹینک اور طیارے ___ اے کیسابلنکا'' ۲۲

انشا نے بچوں کے لئے بھی شاعری کی جسے بچوں کے ادب میں ایک منفرد اور نمایاں مقام حاصل ہے۔اس سلسلے کی تین کتابیں درج ذیل زمانی ترتیب سے شائع ہوئیں۔

ا۔	بلّو کا بستہ اور دوسری نظمیں	۱۹۵۷ء
۲۔	قصہ دم کٹے چوہے کا	۱۹۷۵ء
۳۔	میں دوڑتا ہی دوڑتا	۱۹۷۵ء

انشا بطور سفر نامہ نگار

انشا کی شخصیت کا دوسرا نمایاں رخ بطورِ سفر نامہ نگار کے ہمارے سامنے آتا ہے۔ان کی سفر نامہ نگاری درحقیقت ان کی کالم نگاری ہی پر مبنی ہے۔انھوں نے ۱۹۵۵ء میں اپنی کالم نگاری کا آغاز کیا اور سب سے پہلے روز نامہ امروز کے کالم ''حرف و حکایت'' میں کالم لکھے۔اس کے بعد انھوں نے ملک کے مقبول روز ناموں اور ہفت روزوں میں لاتعداد کالم تحریر کئے جن میں روز نامہ انجام میں ''یہ باتیں انشاجی کی' ہفت روزہ اخبار خواتین میں '' آپ سے کیا پردہ؟'' روز نامہ جنگ کے میگزین اخبارِ جہاں میں ''باتیں انشاجی کی'' کے عنوان سے، امروز کے اتوار ایڈیشن میں ''بقلم خود' اور روز نامہ جنگ کراچی میں ''دخل در معقولات'' کے عنوان سے کالم لکھے۔انھوں نے کالم لکھتے ہوئے ادبی رنگ ڈھنگ اور طنز و مزاح کے عنصر کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا۔ان کے کالم کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔جن کی کل تعداد چھ ہے۔ہم ان کتابی مجموعوں کو بآسانی دو گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

کتابیں:

ا۔	اردو کی آخری کتاب	(جولائی ۱۹۷۱ء)
ب۔	خمارِ گندم	(ستمبر ۱۹۸۰ء)

سفر نامے:

ا۔	چلتے ہو تو چین کو چلئے	(اگست ۱۹۶۷ء)

ب۔ آوارہ گرد کی ڈائری (جولائی ۱۹۷۱ء)
ج۔ دنیا گول ہے (جون ۱۹۷۲ء)
د۔ ابن بطوطہ کے تعاقب میں (اپریل ۱۹۷۴ء)
نگری نگری پھرا مسافر (بعداز وفات ۱۹۸۹ء لیکن یہ سفرنامہ ان کے کالموں پر مشتمل نہیں ہے)

کتابیں:

اس گروہ میں شامل دونوں کتابیں زیادہ تر طنزیہ اور مزاحیہ مواد پر مشتمل ہیں۔ذیل میں ان دونوں کتابوں کا مختصراً جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

''اردو کی آخری کتاب'' پہلی بار جولائی ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں مشہور کارٹونسٹ بی اے نجمی کے سو سے زائد کارٹون شامل تھے۔ڈاکٹر ریاض کے مطابق یہ کتاب مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب اردو کی پہلی کتاب کی پیروڈی ہے۔مولانا آزاد نے تو اپنی کتاب میں مختلف علوم کے بارے میں بڑے عالمانہ انداز میں اظہار خیال کیا تھا لیکن انشا نے بحیثیت مزاح نگار اردو کی آخری کتاب میں مختلف علوم کا مضحکہ اڑایا۔انھوں نے اس کتاب میں ابتدائی سائنس، تاریخ، ریاضی، الجبراء، جیومیٹری، جغرافیہ، گرائمر جیسے علوم اور جانوروں، پرندوں، مناظرِ فطرت اور شیخ سعدی جیسی عالم وفاضل اور بزرگ ہستی کو بھی اپنے طنز و مذاح کا نشانہ بنایا۔

خمارِ گندم انشا کی دوسری ایسی کتاب ہے جس میں طنز و مزاح کے عناصر کو کثرت سے برتا گیا ہے۔یہ کتاب ان کی وفات کے بعد پہلی بار ستمبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی اور اگست ۲۰۰۷ء تک اس کتاب کے کل انیس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔اس کتاب میں انھوں نے انسانی زندگی کے اہم موضوعات اور مسائل پر بڑے طنزیہ و مزاحیہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے اور تحریف نگاری کو مزاح کے وسیلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔اس کتاب میں کارٹون شامل نہیں کیے گئے۔

سفرنامے

اردو سفرنامے کی روایت میں جن سفرنامہ نگاروں نے طنزیہ اور مزاحیہ رجحان کو اپنایا ان میں ایک نمایاں نام ''ابن انشا'' کا بھی ہے۔ان کے کالموں کے باقی چار مجموعوں کا تعلق ان کے سفرناموں سے ہے۔جنھیں وہ سفری کالم بھی کہا کرتے تھے۔انھوں نے ایک سرکاری ملازم کی حیثیت سے دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر اختیار کیا، ایک تخلیق کار کی طرح اپنی یاداشتوں کو محفوظ کیا اور ایک صحافی کی طرح انھیں ملکی اخبارات میں کالموں کی صورت میں شائع کر دیا اور یہی کالم شائع ہو کر بعد میں ان کے سفرنامے کہلائے۔انشا نے اپنے تمام سفرناموں میں دلچسپ اور خوبصورت کارٹونوں کا اضافہ بھی کیا جس سے نہ صرف تحریر کے تاثر کو بڑھانے میں مدد ملی بلکہ اسی وجہ سے یہ سفرنامے قارئین کو زیادہ دلچسپ بھی معلوم ہوئے۔

ذیل میں ان کے سفرناموں کا مختصر اً جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

چلتے ہو تو چین کو چلیے (اگست ۱۹۶۷ء)

انشا نے ۱۹۶۶ء میں عوامی جمہوریہ چین کا سفر اختیار کیا اور اس سفر کا احوال سفرنامہ چلتے ہو تو چین کو چلیے میں رقم کر دیا۔ اس سفر میں ان کے ہمراہ کئی اور ادیب بھی شامل تھے۔ یہ سفرنامہ پہلی بار اگست ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ انشا شروع ہی سے چین اور چینی عوام سے بے حد محبت اور لگاؤ رکھتے تھے۔ اس سفرنامے میں انھوں نے زیادہ تر چین اور چینی عوام ہی کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے چینی قوم کو ایک مثالی قوم قرار دیا ہے جس نے نہ صرف مادی اعتبار سے بہت ترقی کی ہے بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی خود کو ایک قوم ثابت کیا ہے۔ اس سفرنامے میں انھوں نے نہ صرف خود، چین اور اہل چین کے بارے میں جاننے کی کوشش کی ہے بلکہ دیگر سیاحوں اور ادیبوں کو بھی اپنے قریبی ہمسائے چین کے سفر کی جانب راغب کیا ہے۔ انھوں نے جابجا پاکستانی قوم اور چینی قوم کا تقابل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ چینی قوم ہر اعتبار سے پاکستانی قوم سے بدرجہا بہتر ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان دونوں اقوام نے حال ہی میں آزادی حاصل کی ہے، پاکستانی قوم نے ۱۹۴۷ء میں غیرملکی استبداد سے آزادی حاصل کی اور چینی عوام نے ۱۹۴۹ء میں ایک طویل عرصہ کی خونریزی کے بعد آزادی حاصل کی۔ ان دونوں اقوام میں فرق یہ ہے کہ چینی قوم نے تو تھوڑے ہی عرصے میں اپنی انتھک محنت اور کوشش سے اپنے ملک کو ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا کر لیا لیکن ہمارا ملک پاکستان، ابھی تک ایک پسماندہ ملک ہے۔ انشا پاکستانی قوم کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم لوگ نہ صرف ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہیں بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی بہت پستی کا شکار ہیں۔ انھوں نے جب پاکستانی اور چینی قوم کا تقابل کیا تو تقابلی صورتحال کے نتیجے میں آنے والے تضاد کے لیے نصیحتوں کا دفتر نہیں لگایا بلکہ صرف ایک مسکراہٹ میں ہی سب کچھ سمیٹ لیا۔ ڈاکٹر ریاض احمد کے مطابق یہ سفرنامہ پاکستان اور چین کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی ایک ادبی کوشش ہے البتہ انشا نے اس ادبی کوشش کو اپنے شگفتہ و رواں اسلوب اور زیدی کے دلچسپ کارٹونوں سے مزید دلچسپ اور پُراثر بنا دیا ہے۔

آوارہ گرد کی ڈائری (جولائی ۱۹۷۱ء)

انشا کو نیشنل بک سینٹر اور بین الاقوامی ادارے یونیسکو میں ملازمت کا موقع بھی ملا۔ ان اداروں کی جانب سے تفویض کردہ فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں انھیں دنیا کے مختلف ممالک کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ سفرنامہ آوارہ گرد کی ڈائری میں ان کے دسمبر ۱۹۶۳ء سے دسمبر ۱۹۶۷ء تک کے سفر کا احوال درج ہے۔ اس سفر کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ پہلے وہ یونیسکو کی طرف سے ایران اور سری لنکا کے سفر پر روانہ ہوئے جہاں انھوں نے دسمبر ۱۹۶۳ء سے جنوری ۱۹۶۴ء تک کا عرصہ سیر و سیاحت میں گزارا اور پھر تہران میں بچوں کے ایک میلے میں شرکت کی۔ اس کے بعد اقوام متحدہ نے انھیں یورپ اور مشرق

وسطیٰ میں کتابوں کی تقسیم اور اشاعت کے ایک مطالعاتی فیلوشپ کے لیے منتخب کیا۔ چنانچہ وہ اس فرض کی انجام دہی کے سلسلے میں لندن روانہ ہو گئے۔ اس دوران انھوں نے جرمنی، فرانس، ہالینڈ، سوئٹزر لینڈ، پراگ اور وارسا میں منعقدہ مختلف سیمیناروں اور جلسوں میں شرکت کی اور مصر، قاہرہ، لبنان اور بیروت کے وہ ادارے بھی دیکھے جہاں نشر و اشاعت کا کام کیا جاتا تھا۔ اس سفرنامے میں سفر نامہ نگار نے ان ممالک کو دریافت کرنے کی بجائے زیادہ تر ان ممالک کے مختلف اداروں، ہوٹلوں اور ان سے وابستہ افراد کے کوائف ہی کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ یہ سفر نامہ تکنیکی اعتبار سے تو ایک اعلیٰ پائے کا سفر نامہ نہ بن سکا البتہ سفر نامہ نگار نے اپنے سادہ اور شگفتہ اسلوب سے قارئین کو کسی قدر متاثر کیا۔ اس سفر نامے میں جمشید انصاری اور ڈیوڈ لینگڈن کے کارٹونوں کے علاوہ کچھ تصویری نقوش بھی شامل ہیں۔ اس سفر نامے کا پہلا ایڈیشن جولائی ۱۹۷۱ء میں منظرِ عام پر آیا اور اب تک سفر نامے کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

دنیا گول ہے (جون ۱۹۷۲ء)

اس سفر نامے میں انشا نے فلپائن، انڈونیشیا، سنگاپور، ملائشیا، بنکاک، ہانگ کانگ، افغانستان، ترکی، جاپان، کوریا، لندن اور پیرس کے علاوہ امریکہ کی دو ریاستوں ہوائی اور سان فرانسسکو کی سیاحت کا احوال بھی قلمبند کیا ہے۔ اس طویل سفر کے دوران بھی انشا نے کسی شہر یا ملک کو دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ زیادہ تر اپنے قیام وطعام کی تفصیلات ہی کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے اس سفر نامے میں بھی مزاح نگار کے فرائض تو پوری طرح نبھائے لیکن بطور سفر نامہ نگار اپنے فرائض سے زیادہ تر پہلو تہی کی ہے۔ یہ سفر نامہ پہلی بار جون ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا اور جون ۲۰۰۱ء تک اس کے کل گیارہ ایڈیشن منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اس سفر نامے میں جمشید انصاری کے کارٹون بھی شامل ہیں تاہم یہ سفر نامہ بھی تکنیکی اعتبار سے ایک اعلیٰ پائے کے سفر نامے کی خصوصیات سے محروم رہا۔

ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں (اپریل ۱۹۷۴ء)

یہ سفر نامہ پہلی بار اپریل ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا اور مئی ۱۹۹۱ء تک اس سفر نامے کے تیرہ ایڈیشن منظر عام پر آ چکے ہیں۔ یہ سفر نامہ بھی نجمی اور جمشید کے دلچسپ کارٹونوں سے مزین ہے۔ اس سفر نامے میں انشا نے سب سے پہلے جرمنی اور لندن کے سفر کا احوال درج کیا جس میں حسب روایت انھوں نے زیادہ تر ہوٹلوں اور غسل خانوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد جاپان کے سفر کا احوال رقم ہے اس دوران بھی ان کی توجہ جاپان اور اہل جاپان کے بارے میں کھوجنے اور دریافت کرنے کی بجائے زیادہ تر اپنے ملک اور اس کے سیاسی حالات تک ہی محدود رہی۔ اس سفر میں ان کی اگلی منزل فلپائن تھی جہاں وہ دسمبر ۱۹۷۲ء میں پہنچے۔ وہاں ان کا قیام زیادہ تر منیلا میں رہا جہاں انھوں نے گوتم بدھ کے بہت سے مندر بھی دیکھے۔ اس سفر نامے کے آخر میں سری لنکا کے سفر ۱۹۶۴ء اور ایران کے سفر ۱۹۶۳ء کا احوال بھی درج کیا گیا۔ ان دونوں ممالک کے سفر کے

دوران انھوں نے اپنی قوتِ مشاہدہ سے بھرپور کام لیا اور سری لنکا کے شہر کولمبو اور ایران کے شہر شیراز کے بارے میں کافی تفصیلات اور اہم معلومات فراہم کیں ہیں۔ سفرنامے کا یہی حصہ تکنیکی اعتبار سے سب سے زیادہ معیاری اور معلوماتی ہے کیوں کہ اس حصے میں سفرنامہ نگار نے ان ممالک کو بحیثیت سیاح دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سفرنامے میں خامی یہ ہے کہ اس میں سفرنامے کی بجائے روزنامچے کا سا انداز نمایاں ہے۔

نگری نگری پھرا مسافر:

انشا کا آخری سفرنامہ *نگری نگری پھرا مسافر* کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ پہلی بار جون ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا اور جولائی ۲۰۰۹ء تک اس کے کل دس ایڈیشن منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اس سفرنامے کے بارے میں انشا کے بھائی محمود ریاض بتاتے ہیں کہ یہ انشا کا آخری سفرنامہ ہے جسے انھوں نے خود مرتب کیا اور کتابت کروایا لیکن وہ اسے اپنی زندگی میں شائع نہ کرواسکے۔ البتہ ان کی وفات کے بعد میں نے اور بی اے نجمی نے مل کر اسے شائع کرانے کی کوشش کی۔ اور یوں یہ سفرنامہ پہلی بار جون اسے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ اس سفرنامے کے عنوان کے بارے میں وہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب انشا علاج کے سلسلے میں آخری بار لندن گئے اور پھر کبھی واپس نہ آئے تو مجھے میرا جی کا یہ شعر یاد آیا جس پر میں نے اس سفرنامے کا نام رکھ دیا:

نگری نگری پھرا مسافر
گھر کا رستہ بھول گیا

اس سفرنامے میں جاپان، روس اور لندن کی سیاحت کا احوال رقم کیا گیا ہے۔ اس سفرنامے میں بھی انھوں نے ظریفانہ اسلوب سے کام لیتے ہوئے اپنے قارئین کی دلچسپی کو قائم رکھا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا سفرنامہ *نگری نگری پھرا مسافر* کے موضوع اور اسلوبِ بیان کو سراہتے ہوئے اس سفرنامے کے دیباچے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''زیرِنظر سفرنامہ جس کا زیادہ حصہ جاپان جیسے ترقی یافتہ صنعتی ملک کے بارے میں ہے ان کے دیگر سفرناموں سے کسی طرح بھی کم تر مقام کا حامل نہیں ہے۔ وہ ٹوکیو کا ذکر کریں یا کیوٹو کا۔ کسی ہوٹل میں فروکش ہوں، یا کسی دفتر میں جائیں، ان کی نظر ہر جگہ دلچسپی کے پہلو فوراً تلاش کر لیتی ہے۔ اور پھر انہیں ایسا اندازِ بیان بھی سہولت سے میسر آجاتا ہے۔ جس سے واقعات اور زیادہ خوشگوار بن جاتے ہیں۔ ہمارے جدید مزاحیہ ادب میں ایک طرف شفیق الرحمن کی تحریریں ہیں جو وفورِ مزاح کے باوجود ایک خاص ذہنی سطح کے قاری کو اچھی لگتی ہیں، جبکہ دوسری طرف مشتاق احمد یوسفی کی تصانیف ہیں۔ جن کے مزاح سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک خاص پختگی اور وسعتِ مطالعہ کی ضرورت ہے'' ۲۳

ابن انشا کے سفر ناموں کی جغرافیائی تقسیم

ابن انشا نے اپنی سرکاری مصروفیات کی انجام دہی کی غرض سے دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر اختیار کیا۔ یہ سفر صرف چند ممالک تک ہی محدود نہ تھا بلکہ دنیا کے طول وعرض پر پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جس میں بہت سے خطے اور براعظم بھی شامل ہیں۔ انھوں نے دورانِ سفر نہ صرف احوالِ سفر کو پیش نظر رکھا بلکہ بیرونی ممالک کے طرزِ معاشرت کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی۔ دنیا بھر کی سیّاحت کے دوران ان پر یہ حقیقت بھی کھلی کہ دنیا کے مختلف ممالک نہ صرف جغرافیائی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ ان ممالک میں بسنے والے لوگ بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ کیوں کہ یہ لوگ ایک دوسرے سے رنگ ونسل، مذہب، قومیت اور طرزِ معاشرت کے اعتبار سے بہت مختلف ہیں۔ انھوں نے نہ صرف بیرونی ممالک کے طرزِ معاشرت کا مطالعہ ومشاہدہ کیا بلکہ ان کا تقابل پاکستان کی معاشرت سے بھی کیا اور ان میں موجود اشتراکات اور اختلافات کو بہت سادہ ورواں اسلوب میں بیان کر دیا۔ البتہ یہ سادگی اور روانی مزاح اور شگفتگی کا گہرا عنصر لیے ہوئے ہے۔

انشا نے اپنے سفر ناموں میں پاکستان اور بیرونی ممالک کی معاشرت کے بارے میں جو اظہارِ خیال کیا ہم ان کا تقابلی مطالعہ کریں گے۔ اس مطالعے میں ہم انسانی زندگی کے چند نمایاں زاویوں ہی کو پیش نظر رکھیں اور اس حوالے سے پاکستان اور بیرونی ممالک کا تقابل کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کریں گے تاکہ ہم پاکستان اور بیرونی دنیا کو بہتر طور پر جان سکیں۔ اس تقابلی مطالعے کے تحت ہم پاکستان اور بیرونی ممالک کی تاریخ، جغرافیہ، تہذیب وتمدن، ثقافت، مذہب، رنگ ونسل، زبان، لباس، طرزِ زندگی، عادات واطوار، قیام وطعام، اخلاقی وسماجی اقدار، سماجی رویوں، رشتوں کا احترام، شکست وریخت اور مادی وروحانی زاویہ ہائے نظر کا تقابل کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کریں گے۔ یوں اس تقابلی مطالعے سے نا صرف وہ مسافر اور سیاح رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں جو مستقبل میں ان ممالک کے سفر کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اور ایسے قارئین کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں جو ان ممالک کے بارے میں جاننے کی آرزو تو رکھتے ہوں لیکن کسی وجہ سے وہاں جانے کے قابل نہ ہوں۔ بلکہ یہ تقابلی مطالعہ تو ان لوگوں کو بھی دعوتِ مطالعہ دیتا ہے جو ان ممالک میں جا چکے ہوں اور انھوں نے بھی ان ممالک کے بارے میں معلومات اور کوائف حاصل کیے ہوں۔ اس طرح وہ اپنی اور انشا کی معلومات کا تقابل کر کے اپنے اور انشا کے اندازِ نظر کا فرق جان سکتے ہیں۔

انشا کے سفر ناموں میں پاکستان اور بیرونی ممالک کی معاشرت کے تقابلی مطالعے کے لیے ان کے سفر ناموں کی جغرافیائی تقسیم بہت ضروری ہے۔ گو کہ اس جغرافیائی تقسیم کو کسی طور بھی حتمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیوں کہ سفر نامہ نگار نے

اظہارِ خیال کرتے ہوئے خود کو کسی جغرافیائی حدود کا پابند نہیں رکھا اور کسی ایک خطے کے تقابلی مطالعے میں کئی دیگر خطوں کے ممالک کو بھی شامل کر لیا۔ پھر بھی ان کے سفرناموں میں پاکستان اور بیرونی ممالک کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات سے آگاہی حاصل کرنے اور ان کی بہتر تفہیم کے لیے ان کے سفرناموں کو کسی حد تک جغرافیائی حدود میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

۱۔ مشرقِ بعید کے سفرنامے

۲۔ مشرقِ وسطیٰ کے سفرنامے

۳۔ یورپ اور امریکہ کے سفرنامے

حوالہ جات

۱۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفرنامے انیسویں صدی میں، لکھنؤ، نصرت پبلشرز، ۱۹۸۷ء، ص ۲۳،۲۴

۲۔ پرویز پروازی، ڈاکٹر، سفرنامہ کی تاریخ اور اس کا فن، مشمولہ ماہنامہ اوراق، شمارہ، جون، جولائی، ۱۹۸۹ء، مدیر، ڈاکٹر وزیر آغا، لاہور، دفتر اوراق چوک اردو بازار، ص، ۲۵۶

۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء، ص، ۱۱۸

۴۔ حامد بیگ، مرزا، ڈاکٹر، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء، ص، ۳۸

۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء، ص، ۱۵۷

۶۔ حامد بیگ، مرزا، ڈاکٹر، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء، ص، ۴۱

۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو سفرنامے کے نئے اور پرانے نام، مشمولہ ماہنامہ اوراق، سالنامہ جنوری۔فروری، مدیر، ڈاکٹر وزیر آغا، لاہور، دفتر اوراق چوک اردو بازار، ص، ۲۶۶

۸۔ ایضاً ص، ۲۶۷

۹۔ ایضاً ایضاً

۱۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء، ص، ۳۷۶

۱۱۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، انداز نظر، لاہور، التحریر، ۱۹۸۰ء، ص، ۱۷۸

۱۲۔ اے حمید، ابن انشاء شخصیت اور فن، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، دسمبر ۱۹۹۸ء، ص، ۱۰۱

۱۳۔ ریاض احمد، ڈاکٹر، ابن انشا احوال و آثار، طبع اوّل، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۸ء، ص، ۱۵۸

۱۴۔ ابن انشا، دل وحشی، طبع ۱۳، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۹ء، ص، ۱۶۱، ۱۶۲

۱۵۔ اے حمید، ابن انشا۔یادیں باتیں، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء، ص، ۲۵

۱۶۔ ابن انشا، اس بستی کے اک کوچے میں، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۷ء، ص، ۱۱۹

۱۷۔ اے حمید، ابن انشا۔یادیں باتیں، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء، ص، ۸۵، ۸۶

۱۸۔ ابن انشا، چاند نگر، طبع ۲۱، لاہور، لاہور اکیڈمی، جولائی، ۲۰۰۹ء، ص، ۴۰، ۴۱

۱۹۔ ایضاً ص، ۴۲، ۴۳، ۴۳

۲۰۔ ایضاً ص، ۱۵

۲۱۔ ابن انشا، اس بستی کے اک کوچے میں، طبع ۲۵، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۷ء، ص، ۲۰

۲۲۔ ابن انشا، دل وحشی، طبع ۱۳، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۹ء، ص، ۱۴۴

۲۳۔ ابن انشا، نگری نگری پھرا مسافر، طبع دہم، لاہور، لاہور اکیڈمی، جولائی، ۲۰۰۹ء، ص، ۶

باب دوم

مشرق بعید کے سفرنامے

ا۔ مشرقِ بعید کے سفرنامے:

انشا کی سیاحت کا بیشتر حصہ مشرقِ بعید کی سیاحت پر مبنی تھا اس لئے ان کے سفرناموں میں ہمیں چین، جاپان، ہانگ کانگ، کوریا، تھائی لینڈ، بنگلہ دیش، بھارت، انڈونیشیا اور ملائیشیا کا تذکرہ بار بار ملتا ہے۔ مشرقِ بعید کے تمام ممالک یوں تو ایک ہی نطۂ ارض سے تعلق رکھتے ہیں لیکن پھر بھی ان ممالک کے معاشرت کے درمیان انھیں بہت سے اشتراکات اور اختلافات بھی نظر آئے۔ انھیں یہ جان کر بہت حیرانی ہوئی کہ مختلف خطوں کے لوگوں میں اختلاف کا پایا جانا ایک یقینی بات ہوتی ہے لیکن ایک ہی خطے کے لوگوں میں بھی کئی حوالوں سے اختلافات موجود ہوتے ہیں۔ انھوں نے پاکستان اور مشرقِ بعید کی معاشرت میں جو اشتراکات اور اختلافات محسوس کیے انھیں کسی سنجیدہ و تحقیقی انداز میں بیان کرنے کی بجائے مزاح کے رنگ میں بیان کر دیا تا کہ قارئین پر یہ سنجیدہ و خشک لہجہ اور تحقیقی انداز گراں نہ گزرے۔

انشا نے پاکستان اور مشرق بعد کی معاشرت کے درمیان جو اشتراکات اور اختلافات محسوس کیے ہم نے ان کا تقابلی مطالعہ درج ذیل عنوانات کے تحت کیا ہے۔

وقت، جغرافیہ، موسم، آب و ہوا، آبادی، باشندے، خوراک، لباس، بناؤ سنگھار، عادات و اطوار، ادب و آداب، اخلاقی اقدار، سماجی اقدار، اندازِ فکر، ہوٹل، تفریح کے مختلف ذرائع، ذرائع آمدورفت، علاج معالجہ، نظامِ تعلیم، سیاسی نظام، عدالتی نظام، معاشی نظام، مذہب، شہر اور دیہات، بازار، محنت کش طبقہ، آثارِ قدیمہ، جانور، اخبارات، زبان، فنونِ لطیفہ۔

ذیل میں ان تمام عنوانات کا تقابلی مطالعہ الگ الگ پیش کیا جاتا ہے۔

وقت:

انسانی زندگی میں وقت کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی کا عرصۂ حیات تو خود وقت ہی کی مختلف اکائیوں یعنی ماہ و سال پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ زندگی میں وقت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری زندگی کے عام معمولات سے لے کر اہم ترین معمولات تک کا انحصار صرف وقت کے صحیح تعین اور استعمال پر ہوتا ہے۔ انشا کو دورانِ سیاحت جہاں پاکستان اور مشرقی بعید کے ممالک کے درمیان بہت سے

اشتراکات نظر آئے وہیں ان ممالک میں اختلافات کے کئی پہلو بھی نظر آئے۔ مشرقِ بعید کے تمام ممالک یوں تو ایک ہی جغرافیائی حدود میں واقع ہیں لیکن پھر بھی ان ممالک میں وقت کے حوالے سے اختلاف کا پہلو موجود ہے۔ کسی جگہ کے وقت کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ مقام خط استوا سے کتنے فاصلے پر واقع ہے۔ جو مقام خط استوا سے جس قدر قریب ہوگا وہاں دن کا آغاز اتنا ہی جلد ہوگا اور جو مقام خط استوا سے جس قدر دور ہوگا وہاں دن کا آغاز اتنی ہی تاخیر سے ہوگا۔ یوں مشرق بعید کے تمام ممالک مشرق میں واقع ہونے کے باوجود خط استوا سے مختلف فاصلے پر واقع ہیں جس کے سبب ان کے وقت میں بھی اختلاف کا پہلو موجود ہے۔ انشا نے مشرقِ بعید کی سیاحت کے دوران پاکستان اور مشرق بعید کے ممالک کے معیاری وقت کا تقابل کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی صورتوں کو اپنے سفرناموں میں بیان کر دیا ہے۔

انشا نے پاکستان اور مشرق بعید کے ممالک کے معیاری وقت میں جو اختلافات محسوس کیے انھیں ذیل میں فرداً فرداً بیان کیا جاتا ہے۔

جاپان قیام کے دوران انشا پر یہ حقیقت کھلی کہ جاپان کا معیاری وقت پاکستان کے معیاری وقت سے تقریباً چار گھنٹے آگے ہے۔ بقول انشا اگر جاپان میں صبح سات بجے کا وقت ہو تو کراچی میں اس وقت رات کے تین بجے ہوں گے۔ جاپان قیام کے دوران انشا نہ صرف مسائل کا شکار رہے بلکہ ان کے معمولات زندگی بھی بری طرح متاثر ہوئے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب میں جولائی ۱۹۷۳ء میں ٹوکیو گیا تو وہاں ایک کے ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں بھی بے خوابی کا شکار رہا۔ حالانکہ اس ہوٹل میں ہر طرح کی جدید سہولیات اور ضروریات زندگی میسر تھیں لیکن اس کے باوجود مجھے وہاں بالکل نیند نہ آئی۔ یوں وہ اپنی بے چینی اور بے خوابی کا ذمہ دار وقت کے اختلاف ہی کو ٹھہراتے ہیں اور بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ٹوکیو میں ساڑھے بارہ بجے کا وقت پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق تو ساڑھے آٹھ بجے کا وقت ہوتا تھا۔ ظاہر ہے میں تو پاکستانی وقت کے مطابق سونے کا عادی تھا لہٰذا مجھے اپنے معمول کے وقت سے چار گھنٹے پہلے نیند کیسے آتی؟ بہرحال انشا کو جاپان قیام کے دوران پاکستان اور جاپان کے معیاری وقت میں نمایاں فرق نظر آیا بلکہ اس اختلاف نے وہاں قیام کے دوران انھیں بہت سے مسائل سے دوچار بھی کیا۔

انشا نے اپنی دفتری مصروفیات کے انجام دہی کی غرض سے عوامی جمہوریہ چین کا سفر بھی اختیار کیا۔ وہاں قیام کے دوران انھیں یہ معلوم ہوا کہ پاکستان اور چین کے معیاری وقت میں بھی اختلاف کا پہلو موجود ہے کیونکہ چین کا معیاری وقت پاکستان کے معیاری وقت سے تین گھنٹے آگے ہے۔ وقت کے اختلاف نے انھیں یہاں بھی پریشان کیے رکھا اور یہاں بھی ان کے معاملاتِ زندگی بری طرح متاثر ہوئے جس کا تذکرہ انھوں نے بڑے دلچسپ اور مزاحیہ انداز میں سفرنامہ چلتے ہو تو چین کو چلیے کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

''اور یوں جب ہماری گھڑی میں چھ، پیر صاحب کی گھڑی میں تین اور اعجاز کی گھڑی میں چار بج رہے تھے ہم نے کنیٹن کی پہلی جھلک دیکھی۔ پیر صاحب نے اپنی گھڑی میں کراچی کا ٹائم رہنے دیا تھا اور اعجاز نے ڈھا کہ کا۔ ہماری گھڑی کے چھ بجے کنیٹن کا ٹائم تھا۔ چین کا ٹائم مغربی پاکستان کے ٹائم سے تین گھنٹے آگے ہے۔ اسی لیے تو ابھی ناشتہ پیٹ میں موجود تھا کہ لنچ کا ٹائم ہو گیا اور اس کے فوراً بعد سہ پہر کی چائے آ گئی، اور جلد ہی شنگھائی پہنچتے ہی رات کا کھانا کھانا پڑ گیا۔ بے شک اس وقت شنگھائی میں آٹھ بجے تھے، لیکن ہمارے معدے کو یہ باریکیاں کیا معلوم کراچی میں تو ابھی پانچ بجے شام ہی کا عمل تھا۔ ایک دو روز تو ہم یونہی وقتوں کے فرق کے مخمصے میں گرفتار رہے۔ ایک بجے لنچ پر بیٹھتے اور یاد آتا کہ ابھی کراچی کے دس بجے ہیں، تو بھوک آدھی رہ جاتی اور صبح آٹھ بجے اٹھتے اور سوچتے کہ کراچی میں ابھی پانچ کا عمل ہے اور لوگ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہوں گے تو بے اختیار وطنِ عزیز پر رشک آتا۔'' [1]

یوں درجہ بالا اقتباس میں انشا نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان اور چین کے معیاری وقت میں نمایاں فرق موجود ہے۔ ان دونوں ممالک کے وقت میں موجود اختلاف نے چین میں قیام کے دوران ان کے معمولاتِ زندگی میں بار بار خلل ڈالا۔

چین اور جاپان کے بعد انشا روس اور قازقستان کو بھی اس تقابلی مطالعے کا حصہ بناتے ہیں اور ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ پاکستان اور ان ممالک کے معیاری وقت میں نمایاں فرق موجود ہے۔ وہ پاکستان، روس اور قازقستان کے وقت میں موجود اختلاف کو سفر نامہ *نگری نگری پھرا مسافر* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں:

''الما تا کا وقت ماسکو سے تین گھنٹے آگے ہے۔ جب کہ ہمارا وقت صرف دو گھنٹے آگے ہے۔ جب ماسکو میں نو بجتے ہیں۔ ہمارے ہاں گیارہ بجتے ہیں اور الما تا میں بارہ کا عمل ہوتا ہے۔'' [2]

الغرض، انشا کو وقت کے حوالے سے پاکستان اور مشرقِ بعید کے مختلف ممالک میں صرف اختلاف کی صورتیں ہی نظر آئیں۔

جغرافیہ:

دنیا کا تقریباً ہر ملک جغرافیائی اعتبار سے ایک منفرد حیثیت کا مالک ہوتا ہے۔ جب کسی ملک کے جغرافیے کے بارے میں دریافت کیا جائے تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مقام کتنے عرض بلد اور کتنے طول بلند پر واقع ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی کتنی ہے اور اس میں موجود پہاڑ، میدان، سمندر، ندی نالے اور جزیرے کیسے اور کس نوعیت کے ہیں۔ انشا نے مشرقِ بعید کے ممالک کے سفر کے دوران ان ممالک کے بارے میں جہاں دیگر معلومات کو اہمیت دی وہیں ان ممالک کے جغرافیائی عناصر کو بھی خاص طور پر اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ انھوں نے ان ممالک کے جغرافیائی عناصر کے بارے میں جو

معلومات حاصل کیں ان کا تقابل پاکستان کے جغرافیائی عناصر سے بھی کیا اور ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کی۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا جارہا ہے۔

دریا:

دریا کا نام سنتے ہی ذہن میں پانی کے ایک وافر ذخیرے کا تصور ذہن میں آجاتا ہے۔ دنیا کے اکثر ممالک میں دریا موجود ہیں۔ دریاؤں کے ذکر میں انؔشا افغانستان کے مشہور دریائے کابل کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ اس دریا کی وسعت و کشادگی اور پانی کی مقدار کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''دریا'' کا نام سنتے ہی ذہن میں وسعت و کشادگی اور پانی کے ایک وافر ذخیرے کا تصور ابھرتا ہے لیکن دریائے کابل میں دریاؤں کی سی کوئی خصوصیت سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اس کی وجہ وہ بتاتے ہیں کہ ایک تو یہ دریا بہت چھوٹا ہے اور دوسرے اس میں پانی کی مقدار اتنی کم ہے کہ یہ کسی بھی طور دریا کہلوانے کا مستحق نہیں ہے۔ اس کے بعد انؔشا دریائے کابل کا موازنہ پاکستان کے دو مشہور دریاؤں سندھ و ستلج، بھارت کے دریاؤں گنگا و جمنا اور چین کے دریاؤں ہوانگ اور ینگسی سے کرتے ہیں۔ وہ یہ بتاتے ہیں کہ دریائے کابل کسی بھی اعتبار سے مذکورہ دریاؤں کا ہم پلہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ دریا حقیقی معنوں میں دریا کہلوانے کے مستحق ہے کیونکہ ایک دریا کے لئے جس وسعت و کشادگی اور پانی کے وافر ذخیرے کا ہونا ضروری ہوتا ہے' دریائے کابل ان خصوصیات قطعی محروم نظر آتا ہے۔ وہ بڑے مزاحیہ انداز میں یہ کہتے ہیں کہ گو کہ یہ دریا حقیقی معنوں میں دریا کہلانے کا مستحق نہیں ہے لیکن پھر بھی اگر آپ بضد ہیں کہ دریائے کابل کے لئے دریا کا لفظ ہی استعمال کیا جائے تو پھر دریائے سندھ و ستلج، گنگا و جمنا اور دریائے ہوانگ اور ینگسی سے معذرت کرلیں جو وسعت و کشادگی اور پانی کے وافر ذخیرے کی بدولت حقیقی معنوں میں دریا کہلانے کے مستحق ہیں۔ انؔشا دریائے کابل کی وسعت اور اس میں موجود پانی کے ذخیرے کو طنز و تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے سفرنامہ دنیا گول ہے کے حوالے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''کراچی والے دریائے کابل کی وسعت کا اندازہ کرنا چاہیں تو اس گندے نالے کو دیکھ لیں جو نہ جانے کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا ہے لیکن وومن کالج کے پاس سے گزرتا ہے۔ فرق اس نالے اور دریائے کابل میں یہ ہے کہ اس نالے کا پانی نسبتاً صاف ہے اور اس میں سے اتنی زیادہ بُو نہیں آتی۔ پانی کی مقدار بھی آج کل تو اسی نالے میں زیادہ ہے۔ ہاں گرمیوں میں سنا ہے برف پگھلتی ہے تو دریائے کابل کی ناطاقتی کچھ دور ہوجاتی ہے۔''[۳]

بہر حال انؔشا کو وسعت و کشادگی اور پانی کے ذخیرے کے حوالے سے پاکستان کے دریاؤں سندھ و ستلج، بھارت کے دریاؤں گنگا و جمنا اور چین کے دریا ہوانگ و ینگسی میں تو اشتراک کا پہلو نظر آیا لیکن افغانستان کے مشہور دریائے کابل میں اس حوالے سے اختلاف ہی کو بیان کیا ہے۔

پہاڑ اور چوٹیاں:

پہاڑ اور چوٹیاں بھی کسی ملک کی انفرادیت کا باعث ہوتی ہیں۔ انؔشا جب پاکستان اور مشرقِ بعید کے ممالک میں پائے جانے والے پہاڑوں اور چوٹیوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ہانگ کانگ کی مشہور وکٹوریہ چوٹی اور مری کی پہاڑیوں میں اشتراک کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ ان دونوں ممالک کی چوٹیوں میں موجود اشتراکات کو انھوں نے سفرنامہ دنیا گول ہے کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے۔

> ''پھر وکٹوریا چوٹی کو بھی ہم نے سر کرلیا۔ بالکل مری کا سا نقشہ ہے۔ پہاڑ کو گردشوں میں کاٹتی ہوئی سڑک۔ اس ڈھلوان پر ایک کیبل ٹرین بھی چڑھتی ہے۔ اپنے انجن کے زور پر نہیں بلکہ ایک کیبل کے سہارے کچے دھاگے سے بندھی آتی ہے سرکار مری۔''[۴۲]

درجہ بالا حوالے میں انؔشا نے مری کی پہاڑیوں اور ہانگ کانگ کی وکٹوریا چوٹی میں بل کھاتی سڑکوں اور کیبل ٹرین کی موجودگی کے حوالے سے اشتراک دکھایا ہے۔

متصل مقامات اور حدود اربعہ:

ہانگ کانگ قیام کے دوران انؔشا نے وہاں کے جغرافیے کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کی کوشش بھی کی۔ جس سے انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ممالک میں ایسے متصل مقامات موجود ہیں جو باہم متصل ہونے کے باوجود متضاد جغرافیائی نوعیت کے حامل ہیں۔ ان متصل مقامات میں سے ایک حصہ اگر پانی کا کوئی جزیرہ ہے تو دوسرا حصہ خشکی کا قطعہ ہوگا۔ ہانگ کانگ کے متصل مقامات کی تفصیل بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہانگ کانگ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصے کا نام جزیرہ ہانگ کانگ ہے جو ہانگ کانگ کا تجارتی مرکز ہے۔ اس جزیرے کی لمبائی گیارہ میل اور چوڑائی دو میل کے قریب ہے۔ جب کہ دوسرے حصے کا نام کولون ہے جو خشکی کا ایک قطعہ ہے۔ اس قطعے کا رقبہ تقریباً پونے چار مربع میل ہے، اس حصے میں ایک بین الاقوامی ہوائی اڈہ بھی موجود ہے۔ یہ حصہ چین کے انتہائی جنوب میں واقع ہے۔ انؔشا کو ایسا ہی جغرافیائی تنوع پاکستان کے شہر کراچی میں بھی محسوس کیا کیونکہ یہاں بھی ہانگ کانگ کی طرح جغرافیائی تنوع کے حامل مقامات موجود ہیں۔ کراچی میں واقع متصل مقامات میں سے ایک حصے کا نام منوڑہ اور دوسرے کا نام کیماڑی ہے۔ منوڑہ بھی جزیرہ ہانگ کانگ کی طرح ایک جزیرہ ہے اور کیماڑی کولون کی طرح ایک خشکی کا قطعہ۔ یوں انھیں ہانگ کانگ کے متصل مقامات جزیرہ ہانگ کانگ و کولون اور کراچی کے متصل مقامات منوڑہ و کیماڑی میں یہ مماثلت نظر آئی کہ دونوں ہی متصل مقامات متضاد جغرافیائی نوعیت کے حامل ہیں۔ البتہ جب وہ منوڑہ کا تقابل جزیرہ ہانگ کانگ سے کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ منوڑہ رونق وخوبصورتی میں جزیرہ ہانگ کانگ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

انشا کو پاکستان اور ہانگ کانگ کے علاوہ سنگاپور کے جزیرے میں بھی کچھ اسی نوع کا جغرافیائی تنوع نظر آیا۔ البتہ جب وہ سنگاپور کے جزیرے اور اس کے متصل مقامات کا تقابل کراچی اور ہانگ کانگ کے متصل مقامات سے کرتے ہیں تو انھیں جہاں اشتراک کی صورت نظر آتی ہے وہیں اختلافات کے چند پہلو بھی نظر آتے ہیں۔ ان اشتراکات اور اختلافات کو انشا سفر نامہ دنیا گول ہے کے حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں:

''سنگاپور کے جزیرے کا رشتہ جزیدہ نمائے ملایا سے ایسا ہی ہے جیسا منورہ[۵] کے جزیرے کا کراچی سے۔ جہاں ہمارے ہاں کیماڑی[۶] ہے، وہاں ملائیشیا کا شہور جوہور ہے۔۔۔ اسی تذکرے میں ہم عرض کردیں کہ ہانگ کانگ بھی اسی طرح کا جزیرہ ہے اور اس کا رشتہ بھی سرزمین چین سے ایسا ہی ہے۔ فرق یہ کہ سرزمین چین کی نوک ایک سرا بھی انگریزوں کی عمل داری ہے۔ اسے کولون کہتے ہیں اور کولون کے ریلوے اسٹیشن سے چل کر ریل گاڑی میں کینٹین پیکنگ۔ شنگھائی وغیرہ سیدھے جاسکتے ہیں۔ لیکن ہانگ کانگ اور کولون ہر چند کہ مل کر ایک سیاسی وحدت ہیں اور مجموعاً ہانگ کانگ ہی کہلاتے ہیں۔ لیکن ان کے درمیان پل وغیرہ کا سلسلہ نہیں۔ بس فیری چلتی ہے جسے اردو میں بیڑی کہیے۔ سنگاپور اور ملائشیا کے درمیان کی کھاڑی پر البتہ پل ہے۔ پون ایک میل لمبا پل پار کیجیے اور ملائیشیا میں داخل ہو جایئے۔''[۷]

مذکورہ حوالے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پاکستان، ہانگ کانگ اور سنگاپور کے جزیرے میں اشتراک اور اختلاف کا پہلو موجود ہیں۔ اشتراک کے بارے میں وہ بتاتے ہیں کہ ان تینوں ممالک میں متضاد جغرافیائی نوعیت کے حامل متصل مقامات موجود ہیں البتہ ان تینوں ممالک کی اپنے متصل مقامات سے تعلق کی نوعیت مختلف ہے۔ اس کے علاوہ سنگاپور کے جزیرے کا متصل حصہ جو خشکی کے قطعہ پر مشتمل ہے اس میں ایک میل لمبا پل ہے جبکہ کولون اور کیماڑی میں پل کی سہولت بھی موجود ہے۔ یوں انشا کو پاکستان، ہانگ کانگ اور سنگاپور کے متصل مقامات میں اشتراک کے ساتھ ساتھ اختلاف کے پہلو بھی نظر آئے۔

اس کے بعد انشا حدود اربعہ کے اعتبار سے بھی پاکستان اور مشرق بعید کے ممالک کا تقابل کرتے ہیں۔ اس تقابل سے انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ سری لنکا کے شہر سیلون اور پاکستان کے کئی شہروں کے حدود اربعہ میں مماثلت کی صورت موجود ہے۔ اس سلسلے میں وہ بتاتے ہیں کہ سیلون شہر کی لمبائی تقریباً ۱۴۰ میل ہے اور چوڑائی اس سے تقریباً دوگنی یعنی ۲۷۰ میل ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ کراچی چھاؤنی سے ٹنڈو آدم تک کے علاقے کی چوڑائی ۱۴۲ میل ہے جو سیلون کی چوڑائی کے تقریباً مساوی ہے یوں ان کو سری لنکا کے شہر سیلون اور پاکستان کے بعض علاقوں ٹنڈو آدم اور ٹنڈو مستی کے حدود اربعہ میں کسی حد تک اشتراک کی صورت نظر آئی۔

الغرض انشا نے جغرافیائی اعتبار سے پاکستان، بھارت، سری لنکا، سنگاپور، ہانگ کانگ، چین اور افغانستان کا تقابل کیا اور اس تقابل میں انھیں اشتراک کے ساتھ ساتھ اختلاف کے پہلو بھی نظر آئے۔

موسم وآب وہوا:

کسی جگہ درجہ حرارت کی وقتی کیفیت کا نام موسم ہے جب کہ کسی مقام پر درجہ حرارت کی سالانہ کیفیت کو وہاں کی آب وہوا قرار دیا جاتا ہے۔ کسی جگہ پر پڑنے والی گرمی، سردی، بارش اور حبس جیسے عناصر کا شمار وہاں کے موسم اور آب وہوا میں ہوتا ہے۔ انشاؔ کو مشرقِ بعید کے سفر کے دوران یہ معلوم ہوا کہ پاکستان اور مشرقِ بعید کے ممالک کے موسم اور آب وہوا میں اختلاف کی کئی صورتیں موجود ہیں۔ انھیں مشرقِ بعید کے ممالک کی سیاحت کے دوران جن جن موسمی تغیرات کا تجربہ ہوا ان کا تقابل انھوں نے پاکستان کے موسم اور آب وہوا سے بھی کیا تاکہ ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو واضح کیا جاسکے۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو فرداً فرداً بیان کیا جاتا ہے۔

چین قیام کے دوران انشاؔ کو وہاں کے مختلف شہروں میں قیام کرنے کا موقع ملا۔ ان شہروں میں قیام کے دوران انھیں یہاں کے موسم کا مشاہدہ کرنے اور پاکستان اور ان شہروں کے موسم میں موجود فرق کو جانچنے کا موقع بھی در آیا۔ جس سے انھیں یہ معلوم ہوا کہ پاکستان اور چین کے بعض شہروں کا موسم تقریباً ایک جیسا ہے۔ اس لئے وہ پیکنگ کو چین کا راولپنڈی، شنگھائی کو لاہور اور کینٹین کو ڈھاکہ قرار دیتے ہیں۔ یوں انشاؔ کو پاکستان اور چین کے بعض شہروں کے موسم میں اشتراک کا پہلو نظر آیا۔

افغانستان قیام کے دوران انھیں وہاں کے موسم کا تجربہ کرنے اور اس کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع بھی ملا۔ وہ افغانستان کے موسم کو موضوع بحث بناتے ہوئے وہاں کے موسم سرما کا تقابل پاکستان کے موسم سے کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ہاں اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ افغانستان میں موسم سرما کے دوران شدید سردی پڑتی ہے لیکن جب مجھے وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ پاکستان اور افغانستان میں موسم سرما کے دوران پڑنے والی سردی کی نوعیت تقریباً ایک ہی جیسی تھی۔ انشاؔ بتاتے ہیں کہ اپنے ملک کے اکثر لوگوں کی طرح میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ افغانستان میں موسم سرما کے دوران شدید ترین سردی پڑتی ہوگی۔ لہٰذا میں نے وہاں کی سردی سے نپٹنے اور اپنے آپ کو کسی پریشان کن اور غیر متوقع صورتحال سے بچانے کے لیے اپنے ساتھ گرم اور اونی کپڑوں کا پورا انتظام کر لیا جن میں کوٹ، سوئیٹر، مفلر، مختلف طرح کی ٹوپیاں، دستانے، کنٹوپ اور پوستینیں شامل تھیں۔ البتہ جب میں وہاں پہنچا تو مجھے اتنی ہی سردی محسوس ہوئی جتنی پنڈی، پشاور یا لاہور میں ہوتی ہے بلکہ اتنی سردی تو کراچی میں بھی کئی بار اس وقت ہو جاتی ہے جب وہاں کوئٹہ سے سردی کی کوئی لہر آئی ہوئی ہو۔ یوں انشاؔ کو پاکستان اور افغانستان کے موسم سرما میں اشتراک کی یہ صورت نظر آئی کہ ان دونوں ممالک میں سردی کی نوعیت بالکل ایک جیسی تھی۔

انشاؔ کی سرکاری مصروفیات نے انھیں ایران کے سفر کے مواقع بھی فراہم کیے۔ وہاں قیام کے دوران انھیں وہاں

کے موسم کے بارے میں جاننے اور واقفیت حاصل کرنے کے مواقع بھی در آئے۔ دراصل ہوا یوں کہ جنوری ۱۹۶۴ء میں وہ سری لنکا کے سفر پر روانہ ہوئے لیکن اس سے کچھ دن پہلے ہی وہ ایران کے سفر سے لوٹے تھے یوں انھیں موسم سرما کے ان سخت سرد دنوں میں ان دونوں ملکوں کے سفر کا تجربہ ہوا جس سے انھیں ان دونوں ممالک کے موسم سرما کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو جاننے کا موقع بھی در آیا۔ پہلے وہ پاکستان اور ایران کے موسم کا تقابل کرتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ایران میں موسم سرما کے دوران پڑنے والی سردی پاکستان میں اس موسم کے دوران پڑنے والی سردی سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔ ان دونوں ملکوں میں اس موسم کے دوران پڑنے والی سردی کا تقابل کرتے ہوئے وہ یہ کہتے ہیں کہ ایران پہنچ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے مجھے سرد خانے میں رکھ دیا ہو، یوں ان کا صرف یہ بیان ہی ایران میں پڑنے والی سردی کی نوعیت جاننے کے لئے کافی ہے۔ بہر حال انھیں پاکستان اور ایران کے موسم میں موسم سرما کے دوران پڑنے والی سردی کی نوعیت میں اشتراک کی ایک صورت نظر آئی۔

انشا کو ان کی سرکاری مصروفیات نے سری لنکا کے سفر کے مواقع بھی فراہم کیے۔ وہاں قیام کے دوران انھوں نے نہ صرف اس ملک کے اشیاء و مظاہر کو کھوجنے اور دریافت کرنے کی کوشش کی بلکہ وہاں کے موسم کے بارے میں معلومات بھی حاصل کیں۔ جب وہ پاکستان کے مشہور شہر کراچی کے موسم کا تقابل سری لنکا کے شہر کولمبو سے کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں صرف اختلاف کے پہلو ہی نظر آتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ اول تو کولمبو میں پڑنے والی گرمی کراچی میں پڑنے والی گرمی کے مقابلے میں زیادہ شدید نوعیت کی ہوتی ہے اور دوسرے یہ شہر سارا سال ہی گرمی کی لپیٹ میں رہتا ہے۔ جبکہ کراچی میں ایک تو موسم سال بھر ایک جیسا نہیں رہتا اور دوسرے یہاں گرمی کی شدت بھی کولمبو کی نسبت کم ہوتی ہے۔ انشا کولمبو میں پڑنے والی شدید گرمی کی بابت بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک بار جب میں جنوری کے مہینے میں کولمبو گیا تو ان دنوں بھی وہاں اتنی گرمی تھی جتنی کراچی شہر میں جولائی کے مہینے میں عموماً ہوا کرتی ہے۔ یوں انھیں کراچی اور کولمبو کے موسم گرما میں پڑنے والی گرمی کی شدت کے حوالے سے اختلاف کی صورت نظر آئی۔ البتہ جب وہ کولمبو کے موسم گرما کا تقابل ملتان کے موسم گرما سے کرتے ہیں تو اس تقابل میں انھیں ان دونوں شہروں کے موسم میں گرمی کی شدت کے حوالے سے نہ صرف اشتراک کا پہلو نظر آتا ہے بلکہ وہ ملتان کی گرمی کو کولمبو کی گرمی سے زیادہ شدید قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ سفر نامہ *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں۔

> ''جہنم میں جہاں ہر طرف گنہگاروں کی تادیب اور عقوبت کے لیے آگ کے الاؤ بھڑک رہے تھے اور لوگ گرمی سے جل بھن کر الاماں الاماں پکار رہے تھے، دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک شخص لحاف کی بُکل میں بیٹھا ٹھرن سے کانپ رہا ہے، بلکہ دانت بج رہے ہیں۔ ایک فرشتے نے حیرت سے پوچھا'' آپ کی تعریف؟'' پتہ چلا ملتان کے ہیں۔''۸

یوں درجہ بالا اقتباس سے یہ ثابت ہوا کہ انشا کو ملتان اور کولمبو کی گرمی میں نہ صرف اشتراک کا پہلو نظر آیا بلکہ وہ ملتان کی گرمی کو کولمبو کی گرمی سے زیادہ شدید قرار دیتے ہیں۔

اس کے بعد انشا پاکستان اور سری لنکا کے مختلف شہروں کے موسم کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں ان دونوں ممالک میں ایسے جڑواں شہر دکھائی دیتے ہیں جو ہیں تو جڑواں لیکن ان کے موسم ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔اس سلسلے میں وہ پاکستان کے جڑواں شہروں، مری و اسلام آباد اور سری لنکا کے جڑواں شہروں کولمبو و کینڈی کے مثال پیش کرتے ہیں۔وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان اور سری لنکا کے جڑواں شہر یوں تو ایک دوسرے سے ملحق ہیں لیکن ان کے موسم ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ پاکستان کے ملحقہ شہروں میں سے اسلام آباد ایک سرسبز و شاداب اور پر فضا مقام تصور کیا جاتا ہے لیکن جوں ہی اسلام آباد کی حدود ختم ہو جاتی ہیں وہیں سے مری کے پہاڑی سلسلوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔مری چونکہ ایک پہاڑی مقام ہے اس لئے یہاں شدید سردی پڑتی ہے۔ یوں ان دونوں جڑواں شہروں کے موسم میں نمایاں فرق محسوس کیا جا سکتا ہے۔ پھر انشا بتاتے ہیں کہ اسلام آباد کی طرح کولمبو بھی سری لنکا کا ایک پر فضا مقام سمجھا جاتا ہے، اسلام آباد کی طرح جونہی کولمبو کی حدود ختم ہونے کو آتی ہے وہیں سے کینڈی کے پہاڑی سلسلوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔کینڈی مری کی طرح سری لنکا کا ایک پہاڑی مقام ہے اور یہاں بھی مری کی طرح شدید سردی پڑتی ہے۔یوں اس تقابل میں انشا نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان اور سری لنکا کے جڑواں شہروں میں اشتراک کی کئی صورتیں موجود ہیں۔اس تقابل کے بعد وہ کہتے ہیں کہ میں نے مری کو کینڈی کے مشابہ قرار دے کر اس کی قدر افزائی میں بے حد مبالغے سے کام لیا ہے حالانکہ مری میں وہ خوبصورتی اور رعنائی کہاں کہ وہ کینڈی کا مقابلہ کر سکے بلکہ یوں کہیے کہ مری کہاں اور کینڈی کہاں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انشا نے مری کی قدر بڑھانے کی بجائے اس کی قدر کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یقیناً کینڈی ایک خوبصورت مقام ہوگا اور اس کا دل پسند موسم بھی سیاحوں کو بہت بھلا لگتا ہوگا لیکن مری بھی اپنی خوبصورتی، حسین مناظر اور صحت بخش آب و ہوا کے لئے پاکستان کیا پوری دنیا میں اپنی شہرت رکھتا ہے۔ دراصل انشا نے کینڈی کی تعریف کو کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے حالانکہ مری بھی خوبصورتی اور رعنائی میں یقیناً کینڈی سے کسی بھی طرح کم نہیں ہوگا۔ بہر حال انشا کو پاکستان اور سری لنکا کے جڑواں شہروں میں اشتراک کی کئی صورتیں نظر آئیں۔

بارش کا شمار بھی ایسے عناصر میں کیا جاتا ہے جسے کسی جگہ کے موسم اور آب و ہوا میں بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ بارش نہ صرف رحمت خداوندی ہے بلکہ کسی جگہ کے موسم اور آب و ہوا میں اس کی ضرورت و اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔انشا جب بارش کے حوالے سے انگریز قوم اور پاکستانی قوم کے انداز فکر کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگریز قوم بارش کو اپنے لئے زحمت سمجھتی ہے جبکہ پاکستانی اسے اپنے لیے رحمتِ خداوندی گردانتی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ کراچی میں بارشیں بہت کم ہوتی ہیں لیکن اس حقیقت کو وہ مزاحیہ انداز میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شاید کراچی والے

بھی بارش کے معاملے میں انگریزوں کے خیالات سے اتفاق کرنے لگے ہیں۔

الغرض پاکستان اور مشرق بعید کے تمام ممالک ایک ہی جغرافیائی حدود میں واقع ہیں۔ اس کے باوجود انشا کو پاکستان اور اس خطے کے بعض ممالک کے موسم اور آب و ہوا میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

آبادی:

اس کرۂ ارض پر اربوں کی تعداد میں لوگ آباد ہیں جن کی تعداد شمار سے باہر ہے۔ دنیا کے تمام حصوں میں آبادی کا پھیلاؤ ایک جیسا نہیں ہے۔ کچھ ممالک زیادہ گنجان آباد ہیں اور کچھ ممالک نسبتاً کم گنجان آباد۔ انشا کے نزدیک کسی ملک کی آبادی بھی اس ملک کی ترقی و خوشحالی کو بہت متاثر کرتی ہے۔ اس لئے انھوں نے جن ممالک کا بھی سفر اختیار کیا وہاں کے اشیاء و مظاہر کے علاوہ وہاں کی آبادی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ انھوں نے آبادی سے متعلقہ ان معلومات کا تقابل پاکستان کی آبادی کے متعلقہ امور و مسائل سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراک اور اختلاف کی وضاحت کی۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

جب انشا پاکستان کے شہر کراچی اور کوریا کے شہر سیول کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں اختلاف کا پہلو نظر آتا ہے۔ وہ پاکستان اور کوریا کے شہروں میں آبادی کے حوالے سے موجود اختلاف کو سفرنامہ *دنیا گول ہے* کے درج ذیل اقتباس میں یوں کرتے ہیں:

> ''سیول کا شہر ہمیں پسند آیا۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ دنیا کے اس کونے میں اتنے بڑے بڑے شہر بھی ہوں گے۔ آبادی اس کی دم تحریر چوالیس لاکھ ہے۔ کراچی سے آٹھ دس لاکھ زیادہ''[9]

درجہ بالا حوالے میں انشا نے یہ بتایا کہ سیول کی آبادی کراچی کی آبادی سے بھی زیادہ ہے اور آبادی کے حوالے سے انھیں کراچی اور سیول میں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

باشندے

دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف رنگ و نسل کے لوگ آباد ہیں جو کسی نہ کسی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہیں۔ انشا نے مشرقِ بعید کے ممالک کے سفر کے دوران جہاں ان ممالک کے اشیاء و مظاہر کو اہمیت دی وہیں ان ممالک میں بسنے والے لوگوں کو بھی اپنی توجہ کا خصوصی طور پر مرکز بنایا۔ انھوں نے ان ممالک میں بسنے والے لوگوں کے بارے میں جو معلومات حاصل کیں ان کا تقابل پاکستانی باشندوں کی متعلقہ معلومات سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کی۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ بدن چور

چین قیام کے دوران انشا کو وہاں کے باشندوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جب وہ پاکستانی اور چینی باشندوں کا تقابل کرتے ہیں تو یہ نتیجہ کرتے ہیں کہ چینی باشندے اپنی اصل عمر سے کم کے دکھائی دیتے ہیں جب کہ پاکستانی باشندے اپنی بتائی گئی عمر سے زیادہ کے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ چین میں جس شخص سے اس کی عمر پوچھو تو وہ جو عمر اپنی بتاتا ہے وہ اس سے کم کا دکھائی دیتا ہے جب کہ پاکستانی باشندوں کی صورتحال اس کے بالکل برعکس ہے۔ انشا اس اختلاف کی وجہ پاکستانی اور چینی باشندوں کے طرزِ عمل کو قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے مطابق اگر پاکستانی باشندوں سے ان کی عمر پوچھی جائے تو وہ اپنی عمر اصل عمر سے کم کر کے بتاتے ہیں اس لیے وہ اپنی بتائی گئی عمر سے زیادہ بڑے لگتے ہیں۔ جبکہ چینی باشندے اپنی عمر نہیں چھپاتے اور وہی عمر بتاتے ہیں جو ان کی اصل عمر ہوتی ہے اس لئے وہ اپنی اصل عمر سے کم کے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ پاکستان میں تو اپنی عمر چھپانے کا رواج ہے لیکن شاید چین میں عمر بڑھا کر بتانے کا رواج ہو۔ یہ بات تو انشا نے یونہی کہی ہے حقیقت میں انھوں نے پاکستانی قوم کے طرزِ عمل کو طنز و تنقید کو نشانہ بنایا ہے۔ ان کا یہ طنز بالکل بجا ہے واقعی ہمارے قول و فعل میں ہر جگہ تضاد موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باقی معاملات کی طرح عمر بتانے میں بھی ہم لوگ جھوٹ سے کام لیتے ہیں جبکہ چینی لوگ اپنی اصل عمر ہی بتاتے ہیں۔ چینی لوگوں کے حوالے سے وہ ایک دلچسپ صورتحال کا ذکر کرتے ہیں اس سلسلے میں وہ بتاتے ہیں کہ ایک بار میں بیجنگ جانے والے جہاز میں بیٹھا تھا، اتنے میں ایک ننھی منھی سی ائر ہوسٹس نظر آئی۔ میرے اندازے کے مطابق تو اس کی عمر پندرہ یا سولہ سال سے زیادہ نہ تھی لیکن پوچھنے پر پتا چلا کہ اس ننھی منھی سی بچی کی عمر بائیس برس ہے۔

اسی طرح ایک بار انشا کو پیکنگ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ وہاں ان کی ملاقات ایسے طلبا اور طالبات سے کرائی گئی جو وہاں اردو کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انھوں نے کچھ چینی لڑکے اور لڑکیوں کو اپنی کتابیں بھی دیں۔ ایک لڑکی اور لڑکے کو انھوں نے ان کی عمر کے حساب سے بلو کا بستہ اور ایسی کتابیں دیں جن کا تعلق بچوں کے ادب سے تھا۔ جب انھوں نے ان بچوں سے ان کی عمریں پوچھیں تو انھوں نے جو عمر بتائی اس کے بعد انھوں نے ان سے یہ کتابیں لے کر موازنہ انیس و دبیر جیسی سنجیدہ کتاب انھیں دے دی۔ بہرحال انشا کو پاکستانی اور چینی باشندوں کے تقابل سے یہ پتا چلا کہ پاکستانیوں کے مقابلے میں چینی باشندے بدن چور ہیں اور اپنی اصل عمر سے کم دکھائی دیتے ہیں، یوں اس حوالے سے ان دونوں ممالک کے باشندوں میں اختلاف کا پہلو موجود ہے۔

۲۔ صحت و تندرستی

صحت اور تندرستی خدا کی نعمتوں میں سے ایک ہے۔ صحت مند انسان نہ صرف اپنی زندگی بہتر انداز میں گزارتا ہے

بلکہ اپنے ملک وقوم کے لئے بھی ایک مفید اور کارآمد شہری ثابت ہوتا ہے۔ انؔشا نے مشرق بعید کے سفر کے دوران اس خطۂ ارض میں بسنے والے لوگوں کی صحت کو بھی اہم جانا اور اس اعتبار سے ان کا تقابل اپنے ملک کے باشندوں سے کر کے یہ ثابت کیا کہ کس ملک کے باشندے زیادہ صحت منداور توانا ہیں۔

صحت وتندرستی کے حوالے سے جب انؔشا پاکستانی اور چینی باشندوں کا تقابل کرتے ہیں تو اس تقابل میں انھیں اختلاف کا پہلو ہی نظر آتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ چین قیام کے دوران مجھے چینی باشندوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جس سے مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ چینی باشندے پاکستانی باشندوں کے مقابلے میں زیادہ صحت منداور چاک وچوبند ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ تو ان کا مخصوص طرزِ زندگی ہے اور کچھ علاج معالجہ کی بہتر سہولیات۔ اس کے علاوہ وہ لوگ محنت مشقت کرتے ہیں، ورزش کے عادی ہیں، پانی ابال کر پیتے ہیں، سادہ خوراک کھاتے ہیں اور کھانے کو اتنا نہیں پکاتے کہ اس کی غذائیت ہی ختم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ چینی باشندے نہ تو بہت کمزور اور ناتواں ہیں اور نہ ہی بہت لحیم شحیم اور فربہ۔ جب کہ ہمارے ملک کے لوگ یا تو بہت کمزور ہیں یا پھر بہت موٹے اور فربہ۔ ان کی جسمانی کمزوری اور موٹاپے کا سبب کچھ تو ہمارا مخصوص طرز زندگی ہے جس میں محنت ومشقت اور ورزش کو صحت وتندرستی کے لئے ضروری نہیں سمجھا جاتا اور کچھ ہماری خوراک بھی ایسی نہیں ہے جو ہمیں صحت منداور توانا بنا سکے۔ کیونکہ ہم لوگ جو خوراک استعمال کرتے ہیں وہ نہ تو سادہ ہوتی ہے اور نہ ہی خالص، دوسرا ہمارے کھانا پکانے کا طریقہ بھی ایسا ہے جو خوراک میں موجود تمام غذائی اجزاء کو ضائع کر دیتا ہے۔ یوں ایسی ناقص اور مرغن خوراک کھا کر ہم یا تو بہت فربہ ہو جاتے ہیں یا بہت کمزور۔ بہر حال انؔشا کو پاکستانی باشندوں کے مقابلے میں چینی باشندے زیادہ صحت منداور چاک وچوبند نظر آئے۔ اور اس حوالے سے ان دونوں ملکوں کے لوگوں میں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

لباس اور بناؤ سنگھار:

لباس نہ صرف ستر پوشی کے کام آتا ہے بلکہ یہ ہماری شخصیت کو زینت اور وقار بھی بخشتا ہے۔ آج کل کے دور میں لباس کا استعمال تو تقریباً سبھی ممالک میں کیا جاتا ہے تاہم اس کے انتخاب میں دنیا کی مختلف اقوام مختلف باتوں کو پیش نظر رکھتی ہیں۔ جس کے باعث دنیا میں نت نئے رنگوں اور مختلف تراش خراش کے لباس دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انؔشا نے دوران سیاحت جہاں دیگر معلومات کو اہمیت دی وہاں مختلف ممالک کے لوگوں کے لباس کا بھی بطورِ خاص مشاہدہ کیا۔ انھوں نے مشرقِ بعید کے سفر کے دوران بھی اس خطے کے بعض ممالک کے لوگوں کے لباس کا بڑی باریکی سے مشاہدہ کیا ان کا تقابل پاکستانی لوگوں کے لباس سے کر کے ان میں موجود مماثلتوں اور اختلافات کے پہلوؤں کو نمایاں کیا۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو بیان کیا جاتا ہے۔

چین قیام کے دوران انشا نے وہاں کے لوگوں کے لباس کو بھی اپنی خاص توجہ کا مرکز بنایا۔ جب وہ پاکستانی اور چینی خواتین کے لباس کا تقابل کرتے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ چینی خواتین سادہ طرزِ زندگی اختیار کرتی ہیں۔ یہ خواتین نہ تو زیورات پہنتی ہیں اور نہ ہی بناؤ سنگھار کا تکلف کرتی ہیں۔ لباس کے سلسلے میں چین میں مرد اور عورت کی تخصیص نہیں کی جاتی، وہاں مرد اور خواتین دونوں ایک ہی جیسا لباس پہنتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ جیسے بند گلے کی جیکٹ مرد پہنتے ہیں ویسی ہی خواتین بھی پہنتی ہیں اسی طرح پتلون اور جوتے بھی دونوں بالکل ایک جیسے ہی پہنتے ہیں۔ اگر کسی چینی خاتون کو خریداری کے لیے بازار جانا پڑ جائے تو وہ کسی قسم کا بناؤ سنگھار نہیں کرتی، بس زیادہ سے زیادہ چیزیں رکھنے کے لیے اپنے ساتھ ایک تھیلا رکھ لیتی ہے۔ جبکہ پاکستانی خواتین کے طرزِ عمل کو وہ ایک دلچسپ صورتحال سے واضح کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ پاکستان سے جاتے ہوئے میں نے یہاں کی ایک ہینڈی کرافٹ شاپ سے ایک موتیوں والا پرس خریدا شاید چین میں کسی خاتون کو دینا پڑ جائے۔ لیکن وہاں قیام کے دوران جب مجھے چینی خواتین کے طرزِ زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو محسوس ہوا کہ چینی خواتین کو تو اس کی ضرورت نہیں ہے اس لیے میں نے یہ پرس ایک پاکستانی خاتون ہی کو دے دیا۔ یوں انشا کو پاکستانی اور چینی خواتین کے لباس اور بناؤ سنگھار میں صرف اختلاف کا پہلو ہی نظر آیا۔

جوتے بھی لباس کا ایک حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ آج کل کے دور میں دنیا کی تقریباً سبھی مہذب اقوام میں جوتے کا استعمال عام کیا جاتا ہے۔ البتہ دنیا کے مختلف ممالک میں جوتے پہننے کے آداب، استعمال اور نوعیت کے حوالے سے اختلاف ضرور موجود ہے۔ انھوں نے مختلف اقوام کے استعمال میں آنے والے جوتوں کا تقابل اپنے ہاں استعمال ہونے والے جوتوں سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کی۔ ذیل میں اس تقابلی مطالعے کو مختلف پہلوؤں کو الگ الگ بیان کیا جاتا ہے۔

جب انشا جوتا پہننے کے آداب کے حوالے سے پاکستانی، چینی، انگریز اور امریکی قوم کے طرزِ عمل کا تقابل کرتے ہیں۔ تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگریز اور امریکی اقوام تو جوتا پہننے اور اتارنے کے سلسلے میں کسی قسم کے ادب و آداب کی پروا نہیں کرتے۔ یہ لوگ اپنے مخصوص طرزِ زندگی کے باعث بار بار جوتا پہننے اور اتارنے کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتے۔ بلکہ اگر ایک بار یہ لوگ جوتا پہن لیں تو پھر اسے اتارتے نہیں۔ بلکہ گھر اور باہر کے تمام کام اسی جوتے میں چلتے پھرتے سرانجام دیتے ہیں یہاں تک کہ یہ لوگ تو اپنی عبادت گاہوں میں بھی جوتے سمیت ہی چلے جاتے ہیں۔ جبکہ پاکستانی اور جاپانی لوگوں کو اپنے مخصوص طرزِ زندگی کے سبب بار بار جوتا پہننا اور اتارنا پڑتا ہے۔ یوں انشا کو جوتا پہننے اور اتارنے کے آداب کے حوالے سے پاکستانیوں اور جاپانیوں میں تو کسی حد تک اشتراک نظر آیا لیکن انگریزوں اور امریکیوں میں اسی حوالے سے اختلاف کا پہلو بھی نظر آیا۔

اس کے بعد انشا جوتے کے استعمال کے حوالے سے پاکستانی، جاپانی، انگریز اور امریکی قوم کا تقابل کرتے ہیں۔

وہ بڑے مزاحیہ انداز میں یہ بتاتے ہیں کہ انگریز، جاپانی اور امریکی اقوام تو صرف سہولت اور آرام کی غرض سے جوتوں کا استعمال کرتے ہیں لیکن ہمارے ہاں تو جوتوں کی حیثیت اپنے استعمال کے لحاظ سے کثیر المقاصد ہے۔ جوتوں کے استعمال کے حوالے سے جب وہ پاکستانی اور یورپی اقوام کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں بھی صرف اختلاف کا پہلو ہی نظر آتا ہے جیسے وہ بڑے مضحک انداز میں سفرنامہ *ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں:

''یورپ کے معاشرے میں جوتے کو ہرگز وہ حیثیت حاصل نہیں جو ہمارے ہاں ہے۔ وہاں تو جوتا بس پہن لیا جاتا ہے سردی سے یا سڑک کے روڑوں سے بچنے کے لئے۔ ہمارے ہاں پہنا جاتا ہے۔ گانٹھا جاتا ہے، مارا جاتا ہے، کھایا جاتا ہے، چٹخایا جاتا ہے اور دال بانٹنے کے برتن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ سگھڑ بیبیاں اپنے سرتاجوں اور خداوندان مجازی کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہیں۔ یورپ میں جوتی کی نوک ہی نہیں ہوتی لہٰذا اس سے یہ کام بھی نہیں لیا جاسکتا۔''[۵۱]

اس کے بعد انشا پاکستانیوں، جاپانیوں، انگریزوں اور امریکیوں کے استعمال میں آنے والے جوتوں کی نوعیت کا تقابل کرتے ہیں وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ انگریز، امریکی اور جاپانی تو ترقی یافتہ اقوام ہیں۔ اس لیے باقی چیزوں کی طرح جوتا بنانے میں بھی لوگوں کے آرام اور سہولت ہی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ یہ لوگ ایسے جوتے بناتے ہیں جو انھیں نہ صرف موسمی تغیرات سے بچاتے ہیں بلکہ سڑکوں اور کھردری وناہموار جگہوں پر چلتے ہوئے رگڑ اور ہر طرح کے زخم سے بھی محفوظ رکھتے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنے ہاں استعمال ہونے والے جوتوں کی نوعیت کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں بڑے افسوس سے پہلے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہم لوگ مادی ترقی کے لحاظ سے ابھی ایک پسماندہ قوم ہیں اس لیے ہم زندگی میں سہولت اور آرام جیسے الفاظ سے واقف نہیں ہیں اور کچھ ایسا ہی حال ہمارے جوتوں کا بھی ہے۔ انشا اس حقیقت کو ایک دلچسپ اور مضحکہ خیز صورتحال سے واضح کرتے ہیں جو انھیں ایک جاپانی دوست، مسٹر نوما کے ہاں پیش آئی۔ وہ بتاتے ہیں کہ مجھے اور یورپ سے آئے ہوئے ایک دوست کو ایک جاپانی مسٹر نوما کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا، جہاں مجھے اور مغرب سے آئے ہوئے صاحب کو جوتا اتار کر کھڑاؤں چلنا پڑا۔ مغرب سے آئے ہوئے دوست کو اس طرح چلنے کی بالکل عادت نہ تھی اس لیے وہ تو دو قدم بھی نہ چل سکے اور گر پڑے۔ جبکہ میں بڑی آسانی سے کھٹ کھٹ چلنے لگا بلکہ مجھے یوں آرام سے چلتا دیکھ کر تو مسٹر نوما بھی حیران رہ گئے اور کہنے لگے، واہ رے واہ اس سہولت سے تو ہم بھی ان جوتوں میں چل نہیں سکتے جس سہولت سے تم ان جوتوں میں چل رہے ہو۔ ہاں ہمارے بزرگ یقیناً اٹھارویں یا انیسویں صدی میں یوں چلتے ہوں گے۔ میں نے انھیں بتایا کہ جناب یہ تو کچھ بھی نہیں ہماری قوم تو مادی ترقی کے لحاظ سے ابھی پندرھویں یا سولہویں صدی میں ہے اس لیے ہم لوگ آرام اور سہولت جیسے الفاظ سے واقف نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں آرام اور آسائش کو زندگی کے لیے ایک فضول چیز تصور کیا جاتا ہے اس لیے کھڑاؤں کیا میں تو بغیر جوتوں کے بھی بڑی آسانی سے چل سکتا ہوں۔ انشا نے اس تقابل میں پاکستانی قوم کی مادی ترقی کو جس طرح طنز وتنقید کا نشانہ بنایا ہے وہ اپنی جگہ بالکل بجا ہے۔ واقعی ہم لوگوں کی روزمرہ زندگی میں آرام، سہولت اور آسائش

کی بہت کمی ہے۔

بہر حال اَنّشا کو جوتا پہننے کے آداب کے حوالے سے تو پاکستانیوں اور جاپانیوں میں اشتراک نظر آیا۔ البتہ ان کے استعمال اور نوعیت کے حوالے سے جاپانیوں، انگریزوں اور امریکیوں میں تو اشتراک نظر آیا لیکن پاکستانیوں میں اسی حوالے سے اختلاف کی صورت نظر آئی۔

خوراک

خوراک انسانی جسم کی بنیادی ضرورت ہے اس کے بغیر ہماری زندگی کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ متوازن خوراک سے مراد ایسی خوراک ہے جو تمام لازمی غذائی اجزاء پر مشتمل ہو، ایسی خوراک میں گوشت، مختلف اقسام کے اناج، دالیں، پھل، سبزیاں، پانی اور دیگر مشروبات شامل ہوتے ہیں۔ اَنّشا نے مشرقِ بعید کی سیاحت کے دوران جن ممالک میں قیام کیا اور وہاں جس قسم کی خوراک کھائی اس کا تقابل پاکستان میں کھائی جانے والی خوراک سے بھی کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے صرف چند نمائندہ اشیاء کا انتخاب کر کے ان کا تقابل پاکستان میں استعمال ہونے والی اس قسم کی اشیاء سے مختلف حوالوں سے کیا اور اس سلسلے میں آنے والے اشتراکات اور اختلافات کو واضح کیا۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو بیان کیا جاتا ہے۔

اناج:

اناج کو ہماری خوراک میں ایک لازمی جزو کی حیثیت حاصل ہے۔ اناج میں بہت سی اشیاء شامل ہیں جن میں گندم، مکئی، جوار، باجرا اور دیگر اشیاء شامل ہیں۔ دنیا کی مختلف اقوام اپنی مرضی ومنشا کے مطابق اناج کی ان مختلف اقسام میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے اسے اپنی خوراک کا لازمی حصہ بنا لیتی ہیں اور ان کا استعمال باقی اناج کی نسبت بڑھا دیتی ہیں۔ اَنّشا جب پاکستان اور سری لنکا کے لوگوں کی خوراک کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ سری لنکا میں چاول کو خوراک کے بنیادی جزو کی حیثیت حاصل ہے جب کہ پاکستان میں یہی حیثیت روٹی کو حاصل ہے۔ اس بات کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب وہ اور ان کے دوست ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر محمد اختر کے ہاں ایک دعوت پر گئے۔ ڈاکٹر محمد اختر نے اپنے ہم وطن دوستوں کے لئے بڑے ہی پر تکلف کھانے کا اہتمام کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ آج میں نے آپ لوگوں کے لئے خاص پاکستانی کھانے کا اہتمام کیا ہے کیونکہ اس میں چاول کی بجائے روٹی رکھی گئی ہے۔ اس رات صرف ڈاکٹر محمد اختر کے گھر ہی روٹی پکائی گئی تھی باقی قرب وجوار کے تمام گھروں میں چاول ہی کھائے گئے تھے۔ یوں خوراک کے اس بنیادی جزو کے انتخاب نے ان دونوں ممالک کے لوگوں کی خوراک کے درمیان ایک واضح فرق قائم کر دیا۔

اس کے بعد انشا پاکستان اور سری لنکا کے عوام وخواص کی خوراک کا تقابل کرتے ہیں۔اس تقابل سے انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مما لک کے عوام وخواص کی خوراک میں اشتراک کا پہلو موجود ہے۔کیونکہ دونوں مما لک کے عوام تو سادہ خوراک کھاتے ہیں اور کھانے میں تکلفات سے بھی اجتناب کرتے ہیں۔جب کہ دونوں ملکوں کے خواص مرغن اور پرتکلف کھانے کھاتے ہیں اور کھانے میں تکلفات بھی برتتے ہیں۔چاول وہ اناج ہے جوسری لنکا کے علاوہ پاکستان کے لوگ بھی بڑے شوق سے کھاتے ہیں البتہ دونوں ملکوں کے خواص انھیں کھانے میں جس قسم کی تکلفات پسندی سے کام لیتے ہیں اسے انشا نے سفر نامہ *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

''ہم نے کہا،معلوم تو چاول ہوتے ہیں''۔بولے جی نہیں۔چاول کا آٹا پیس کرسوّیاں بٹی جاتی ہیں اوران کوچھوٹا چھوٹا چاول کے برابر کاٹا جاتا ہے۔یہ ہے وہ چیز''ہم نے پوچھا پھرسیدھے سادھے چاول کیوں نہیں پکا لیتے ؟''بولے وہ تو گنواروں کا طریقہ ہے۔شرفا کا قاعدہ یہی ہے۔غور کیا تو معلوم ہوا کہ صرف اس معاملے میں نہیں اور معاملوں میں بھی شرفاء کا قاعدہ یہی ہے۔خواہ وہ پاکستان کے ہوں یا سیلون کے،کہ اصل چاول کو پیس کرسوّیاں بنائیں گے پھران کو کاٹ کر مصنوعی چاول بنائیں گے۔ سیدھے سادھے چاول کھانا متبذل ہے۔''[11]

درجہ بالا حوالے سے انشا نے یہ ثابت کیا کہ پاکستان اور سری لنکا کے امراء کھانے میں بہت تکلفات برتتے ہیں۔ بہر حال انشا کوخوراک کے اس اہم جزو کے حوالے سے پاکستان اور سری لنکا کے لوگوں میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

دالیں:

دالیں بھی ہماری خوراک کا ایک ضروری جزو ہیں۔یہ نہ صرف پاکستان میں بڑے شوق سے کھائی جاتی ہیں بلکہ مشرق بعید اور کئی دیگر مما لک میں بڑے شوق سے کھائی جاتی ہیں۔مشرق بعید کی سیاحت کے دوران انشا کو دالوں کی قیمت اور دستیابی کے حوالے سے پاکستان اور اس خطۂ ارض کے بعض مما لک میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔انھوں نے ان اشتراکات اور اختلافات کو اپنے سفر ناموں میں بیان کر دیا۔ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کی تفصیل ملاحظہ کیجئے۔

جب انشا دالوں کی قیمت اور دستیابی کے حوالے سے پاکستان اور جاپان کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ جاپان میں دالیں زیادہ مہنگی ہیں اور کھلے عام دستیاب نہیں ہوتیں۔جب کہ پاکستان میں دالیں نہ صرف ہر جگہ عام دستیاب ہوتی ہیں بلکہ ان کی قیمت بھی جاپان کے مقابلے میں بہت ارزاں ہے۔وہ بتاتے ہیں کہ جاپان میں دالیں صرف کوبے اور یوکوہاما کی چند دکانوں سے ہی ملتی ہیں اور یہ دونوں جگہیں اتنی دور ہیں کہ اگر کسی شخص کا دل دال کھانے کو چاہے بھی

تو اسے اس لمبی مسافت کا خیال کر کے اس خواہش کو دل سے نکالنا پڑتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہاں دالوں کی قیمت پاکستان کے مقابلے میں تقریباً دس گنا زیادہ ہے بلکہ ایک عام شخص کی تو ان تک رسائی بھی ممکن نہیں ہے۔ یوں انشا کو یہ جان کر بڑی حیرانی ہوئی کہ ویسے تو جاپان ایک ترقی یافتہ اور خوشحال ملک ہے لیکن وہاں دالوں کی عام دستیابی اور قیمت کے حوالے سے غیر تسلی بخش صورتحال موجود ہے چونکہ پاکستان میں اس حوالے سے موجود صورتحال جاپان سمیت کئی دیگر ممالک سے کہیں بہتر ہے۔ جب وہ پاکستان اور جاپان میں آٹے اور دال کے بھاؤ کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جاپان میں ان اشیاء کی قیمت پاکستان کے مقابلے میں دس گنا زیادہ ہے۔ دالوں کی قیمت اور دستیابی کے بعد انشا دال کھانے کے حوالے سے پاکستان اور جاپان کے لوگوں کی غذائی عادات کا تقابل کرتے ہیں جس سے انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حوالے سے بھی ان دونوں ملکوں میں اختلاف کا پہلو موجود ہے۔ کیونکہ پاکستانی لوگ تو دال کو بہت ارزاں جانتے ہیں اور اگر کوئی مہمان ان کے ہاں آجائے تو اسے یوں کہتے ہیں، جناب دال روٹی حاضر ہے جبکہ جاپانی لوگ اپنے پاکستانی دوستوں سے فرمائش کرتے ہیں کہ جب بھی وہ جاپان آئیں تو ان کے لئے دالوں کا تحفہ ضرور لائیں۔

بہر حال انشا کو پاکستان اور جاپان میں دالوں کی قیمت، دستیابی اور اسے کھانے کے حوالے سے ان دونوں ملکوں کے لوگوں کی غذائی عادات میں بھی اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

گوشت:

گوشت بھی ہماری خوراک کا ایک اہم جزو ہے جو پاکستان سمیت دنیا کے بیشتر ممالک میں بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔ دنیا کی شاید اکا دکا اقوام ہی ایسی ہوں گی جو گوشت نہ کھاتی ہوں باقی سب کے لئے یہ ایک مرغوب غذا ہے۔ انشا کو مشرق بعید کی سیاحت کے دوران پاکستان اور اس خطے کے بعض ممالک میں گوشت کے انتخاب، قیمت، دستیابی اور اسے کھانے کے حوالے سے ان دونوں ممالک کے لوگوں کی غذائی عادات میں اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں ہی نظر آئیں۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

سب سے پہلے تو انشا گوشت کھانے کے حوالے سے پاکستان، چین، جاپان اور ہانگ کانگ کے لوگوں کا تقابل کرتے ہیں تو اس تقابل سے ان پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ ان چاروں ممالک کے لوگ گوشت کھاتے ہیں۔ البتہ گوشت کے انتخاب کے سلسلے میں ان چاروں ممالک کے لوگوں کا نقطۂ نظر ضرور مختلف ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ چین، جاپان اور ہانگ کانگ کے لوگ گوشت کے انتخاب میں کسی قسم کی پابندی کو قبول نہیں کرتے اور ہر قسم کا گوشت بڑے شوق سے کھا لیتے ہیں۔ جب کہ ہم لوگوں کو کچھ تو اپنے مذہب کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں یعنی حلال وحرام جیسے مسائل کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور کہیں اپنی احتیاط پسندی کی عادت کے بوجہ گوشت کے انتخاب میں بہت سی باریکیوں کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ گوشت

کے انتخاب کے معاملے میں پاکستانیوں کی احتیاط پسندی کی وضاحت کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ سانپ وہ جانور ہے جس کا گوشت چین، جاپان اور ہانگ کانگ میں بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے بلکہ ہانگ کانگ کے لوگ تو اس کے اتنے شوقین ہیں کہ زندہ سانپ ہی کے ٹکڑے کر کے کھا جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان ممالک کے لوگ سانپ کے گوشت کو کئی بیماریوں کے علاج میں مفید جان کر اس سے علاج بھی کرتے ہیں جب کہ پاکستان میں صورتحال اس کے بالکل برعکس ہے یہاں سانپ کھانا تو در کنار، ایسا کرنے کے خیال ہی سے کراہت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں اگر کوئی صحت مند شخص غلطی سے اسے کھا بیٹھے تو تندرست ہونے کے بجائے الٹا وہ بیمار پڑ جاتا ہے۔ اس بات کی وضاحت میں انشا ایک دلچسپ صورتحال کا ذکر کرتے ہیں جس میں انھیں چند پاکستانی دوستوں کے ہمراہ ٹوکیو کے ایک ہوٹل میں کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ وہ بتاتے ہیں کہ باقی صاحبان نے تو اپنی اپنی پسند کی اشیاء آرڈر کیں لیکن میرا دل مچھلی کھانے کو چاہ رہا تھا، اس لئے میں نے ''چیلی فش''، کو مچھلی کی کوئی قسم جان کر اس کا آرڈر دے دیا۔ جیسے ہی میری ڈش سامنے آئی تو میں اس پر ٹوٹ پڑا لیکن ابھی میں نے صرف ایک یا دو لقمے ہی کھائے تھے کہ میرے دوستوں نے مجھے بتانا شروع کر دیا کہ سانپ تو بہت ہی مفید جانور ہے یونہی لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اس کا گوشت بلڈ پریشر اور جوڑوں کے مریضوں کے لئے بہت فائدہ مند ہوتا ہے، معلوم نہیں اس کا ذائقہ کیسا ہوتا ہوگا؟ لیکن انشا کو تو لازماً اس کے ذائقے کا علم ہوگا کیونکہ وہ تو اس وقت سانپ کھا رہے ہیں۔ انشا بتاتے ہیں کہ یہ سنتے ہی مجھے ایک دم متلی سی ہونے لگی لہٰذا میں فوراً غسل خانے کی طرف دوڑا۔ وہاں جا کر میں نے خوب قے کی اور اس کے بعد بھی کئی روز تک میری طبیعت بوجھل ہی رہی۔

اس کے بعد انشا گوشت کی قیمت، اقسام اور دستیابی کے حوالے سے پاکستان، جاپان اور ہانگ کانگ کا تقابل کرتے ہیں۔ ہانگ کانگ قیام کے دوران وہاں کے پنجاب ہاؤس میں منعقدہ ایک تقریب میں ان کی ملاقات ایک ترجمان سے ہوئی۔ جس نے انھیں جاپان اور ہانگ کانگ میں گوشت کی قیمت، دستیابی اور اقسام کے بارے میں بہت اہم معلومات فراہم کیں۔ ان کی بتائی گئی معلومات کے مطابق جاپان میں حلال گوشت صرف کوبے میں ہی دستیاب ہوتا ہے اس کے علاوہ اور کہیں نہیں۔ وہاں گوشت کی صرف ایک ہی قسم دستیاب ہوتی ہے جسے بیف یا بڑا گوشت کہا جاتا ہے۔ اس گوشت کی نوعیت کے لحاظ سے مزید دو اقسام مقرر کی گئی ہیں۔ اول معیاری گوشت جو بہت لذیذ ہوتا ہے اور ۲۰۰ روپے فی کلو کے حساب سے بکتا ہے، یہ گوشت مہنگا ہونے کے سبب عوام کی قوت خرید سے باہر ہوتا ہے وہ اسے دیکھ تو سکتے ہیں لیکن خرید کر اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ دوسری قسم کا گوشت غیر معیاری ہوتا ہے جو ۴۰ روپے فی کلو کے حساب سے بکتا ہے، اس گوشت کی نوعیت کے بارے میں وہ اتنا ہی کافی سمجھتے ہیں کہ اگر آپ خود اسے نہ کھانا چاہیں تو اسے جانوروں کو تو کھلا ہی سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ گوشت کی قیمت اور دستیابی کے حوالے سے پاکستان میں موجود صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں۔ پاکستان میں اس حوالے سے صورتحال انھیں کافی حد تک بہتر نظر آتی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان میں حلال گوشت عام دستیاب ہوتا ہے

اوراس کی قیمت بھی باقی ممالک کی نسبت کم ہے۔جس کی وجہ سے امیر تو امیر غریب عوام بھی اگر زیادہ نہیں تو مہینے میں ایک دو بار ضرور گوشت کھا سکتے ہیں۔ جب گوشت کی قیمت کے حوالے سے پاکستان اور جاپان کا تقابل کرتے ہیں تو اس تقابل میں انھیں صرف اختلاف کا پہلو ہی نظر آتا ہے۔اس اختلاف کو انھوں نے سفرنامہ *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

> ''ویسے بھنڈی وہاں یہاں کے گوشت سے بھی مہنگی ہے۔ایک روپے کی ایک بھنڈی سمجھئے۔ہم نے قیمت سن کر اس کو گوشت سمجھ کر کھانا شروع کر دیا تب کہیں اسلام کا تھوڑا سا ٹو رہم میں واپس آیا۔''[۱۲]

بہر حال انشا کو گوشت کھانے کے حوالے سے پاکستان، چین، جاپان اور ہانگ کانگ میں اشتراک کا پہلو نظر آیا البتہ اس کے انتخاب، قیمت، اقسام اور دستیابی کے حوالے سے ان چاروں ممالک میں صرف اختلاف کی صورت ہی نظر آئی۔

پھل:

پھل قدرت کے انمول تحفہ ہیں۔ یہ بھی ہماری خوراک کا ایک اہم حصہ ہیں اور صحت وتندرستی کے لئے ان کے استعمال کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف اقسام کے پھل پائے جاتے ہیں البتہ بعض پھل ایسے بھی ہیں جو دنیا کے اکثر علاقوں میں پائے جاتے ہیں لیکن ہر جگہ ان کا رنگ، ذائقہ، خوشبو اور جسامت مختلف ہوتی ہے۔اس سلسلے میں انشا سیب کی مثال دیتے ہیں جو پاکستان سمیت دنیا کے اکثر علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ جب وہ پاکستان اور جاپان میں پائے جانے والے سیبوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ جاپان میں پائے جانے والے سیب جسامت میں اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ پاکستان کیا یورپی ممالک میں پائے جانے والے سیب بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔اس کے بعد وہ پاکستان، ہانگ کانگ اور جرمنی میں سیب کی قیمت کا جائزہ لیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یوں تو ہانگ کانگ میں بھی سیب بہت مہنگے ہیں لیکن پاکستان میں تو ان کی قیمتیں آسمان کو چھوتی ہیں لہٰذا لوگ انھیں دیکھ تو سکتے ہیں لیکن خرید نہیں سکتے البتہ جرمنی میں ان کی قیمت بہت کم ہے۔ انشا ان تینوں ممالک میں سیب کی قیمت کا تقابل کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ کولون (ہانگ کانگ) میں میں نے پونے دو مارک کے صرف تین سیب خریدے۔ کچھ دنوں بعد جرمنی جانا ہوا تو وہاں بھی حسب عادت سیبوں کو دیکھ کر میری طبیعت مچل گئی۔ لہٰذا میں نے دکاندار سے کہا کہ مجھے ایک مارک کے سیب دے دو۔ چنانچہ اس نے ایک بڑا سا لفافہ سیبوں سے بھر دیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ جناب میں بیوپاری نہیں ہوں مجھے صرف ایک مارک کے سیب چاہئیں۔اس پر اس نے مجھے بتایا کہ جناب یہ سیب میں نے آپ کو ایک مارک ہی کے دیئے ہیں۔ پھر پاکستان میں سیب کی قیمت کے حوالے سے موجود صورتحال کے بارے میں وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ہاں لوگ اسے کھا تو نہیں سکتے البتہ دیکھ ضرور سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انگریزی کے ایک مقولے میں تو روزانہ ایک سیب کھا کر ڈاکٹر کو بھگانے کا فارمولا پیش

کیا جاتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں سیب اتنے مہنگے ہیں کہ عوام کی پہنچ سے بھی دور ہیں اور جہاں تک بات رہی ڈاکٹروں کو بھگانے کی تو اس کے لئے انھیں سیب کھانے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کی فیس ہی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ ڈر کے مارے خود ہی بھاگ جاتے ہیں۔ انشؔا نے سیبوں کی قیمت کے تقابل میں ڈاکٹروں کے طرزِ عمل کو جس طرح تنقید کا نشانہ بنایا ہے وہ بالکل بجا ہے۔ واقعی ہمارے ہاں ڈاکٹر حضرات کی فیس اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ لوگ ان کے پاس جانے سے گھبراتے ہیں۔ قصہ مختصر انشؔا کو سیب کی جسامت اور قیمت کے حوالے سے پاکستان، جاپان، ہانگ کانگ، جرمنی اور دیگر یورپی ممالک میں صرف اختلاف کے پہلو ہی نظر آئے۔

دنیا میں کچھ پھل ایسے بھی ہیں جو صرف مخصوص جگہوں پر ہی پائے جاتے ہیں۔ رمبوتان بھی ایسا ہی پھل ہے جو صرف مخصوص جگہوں پر ہی پایا جاتا ہے۔ انشؔا جب اس پھل کی دستیابی کے حوالے سے پاکستان اور انڈونیشیا کا موازنہ کرتے ہیں تو انھیں پتا چلتا ہے کہ یہ پھل انڈونیشیا میں تو کثرت سے پایا جاتا ہے لیکن پاکستان میں یہ پھل نہیں پایا جاتا۔ پھر وہ رمبوتان نامی پھل کا تقابل اپنے ہاں پائے جانے والے مختلف پھلوں سے کرتے ہیں، اس تقابل میں انھیں اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں ہی نظر آتی ہیں جسے وہ سفر نامہ *دنیا گول ہے* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''سائز رمبوتان کا آڑو کے برابر ہوتا ہے۔ جلد سرخ، اس پر کانٹے سے کھڑے، چھیلا تو اندر سے شفاف لیچی کی طرح، مزہ اور خوشبو دلنواز۔'' [۱۳]

مشروبات:

مشروبات کا استعمال عام طور پر دنیا کے تقریباً سبھی ممالک میں کیا جاتا ہے۔ البتہ ان کے انتخاب میں موسم اور لوگوں کی منشا کے مطابق ردوبدل ضرور ہوتا رہتا ہے۔ انشؔا نے مشرق بعید کی سیاحت کے دوران اس خطۂ ارض کے جن ممالک میں قیام کیا اور وہاں جن اقسام کے مشروبات سے حظ اٹھایا ان کا تقابل پاکستان میں استعمال ہونے والے مشروبات سے بھی کیا اور ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو واضح کیا۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو بیان کیا جاتا ہے۔

چین قیام کے دوران انشؔا کو وہاں کے مشروبات سے لطف اندوز ہونے کا موقع بھی ملا۔ جب وہ پاکستان اور چین میں استعمال ہونے والے مشروبات کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں اختلاف کے کئی پہلو نظر آتے ہیں۔ ان دونوں ممالک کے مشروبات میں سب سے پہلا بنیادی اختلاف تو انھیں یہ نظر آتا ہے کہ چین میں جہاں ہر کام صرف ملک کی ترقی و خوشحالی اور عوام کی صحت و تندرستی کے خیال سے کیا جاتا ہے وہیں مشروبات کے انتخاب میں بھی ان کے ہاں یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں جہاں ہر کام میں ملک کی ترقی و خوشحالی اور عوام کی بہتری کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی

وہیں مشروبات کے انتخاب میں بھی یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے۔ جب وہ چین میں استعمال ہونے والے گرمیوں کے مشروبات کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں گرمیوں میں ایک عام آدمی کا مشروب صرف سادہ ابلا ہوا پانی ہے جو چین میں ہر جگہ بہت ارزاں قیمت پر دستیاب ہوتا ہے۔ البتہ مہمانوں کی تواضع میں کچھ تکلف برتا جاتا ہے لیکن اس مقصد کے لیے بھی جدید دور کے مصنوعی مشروبات مثلاً کوکا کولا، پیپسی، سیون اپ وغیرہ سے پرہیز کیا جاتا ہے اور سنگترے کے رس جیسے فرحت بخش مشروب سے مہمانوں کی تواضع کی جاتی ہے۔ سنگترے انھیں کہیں سے درآمد نہیں کرنا پڑتے بلکہ ان کے اپنے ملک ہی میں پیدا ہوتے ہیں۔ یوں سنگترے کا رس کو بطور مشروب استعمال کرنے سے یہ لوگ نہ صرف اپنے ملک کا قیمتی زرِمبادلہ بچاتے ہیں بلکہ یہ مشروب لوگوں کی صحت و تندرستی کے لیے بھی زیادہ مفید ہے۔ جبکہ پاکستان، مشرقِ بعید اور دنیا کے کئی دیگر ممالک میں جدید دور کے مصنوعی مشروبات ہی استعمال کیے جاتے ہیں جن میں کوکا کولا، پیپسی کولا اور سیون اپ وغیرہ شامل ہیں جو نہ صرف صحت و تندرستی کے نقطۂ نظر سے بہت مضر ہوتے ہیں بلکہ ان کی درآمد پر کثیر زرِمبادلہ بھی خرچ ہوتا ہے۔

چائے سردیوں کا عام مشروب ہے گو کہ کچھ لوگ اسے گرمیوں میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ سردیوں کے مشروبات میں اسے جو اہمیت حاصل ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مشروب چین، جاپان، ایران اور پاکستان سمیت دنیا کے اکثر ممالک میں پیا جاتا ہے۔ البتہ اس مشروب کے اجزائے ترکیبی اور پیش کش کے اعتبار سے دنیا کے اکثر ممالک میں اختلاف کا پہلو موجود ہے۔ انشا جب چائے کے اجزائے ترکیبی کے حوالے سے پاکستان، چین اور جاپان کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ چین اور جاپان میں بننے والی چائے میں دودھ اور شکر کا استعمال نہیں کیا جاتا جبکہ پاکستان میں بننے والی چائے میں پانی اور چائے کی پتیوں کے علاوہ دودھ اور شکر کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ وہ پاکستان میں بننے والی چائے کو شیرے اور کاڑھے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں چین میں بننے والی چائے پاکستان میں بننے والی چائے سے مختلف ہوتی ہے لیکن اگر فرنچا کہہ کر چائے طلب کی جائے تو یہ چائے اپنے رنگ، خوشبو اور اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے کراچی کے ملباری ہوٹل میں بننے والی چائے جیسی ہی ہوگی۔ بہرحال انشا کو پاکستان، چین، جاپان اور ایران میں بننے والی چائے کے اجزائے ترکیبی میں تو اختلاف کا پہلو نظر آیا لیکن چین کی فرنچا چائے اور کراچی کے ملباری ہوٹل کی چائے میں رنگ، خوشبو، ذائقے اور اجزائے ترکیبی کے حوالے سے اشتراک کی صورت بھی نظر آئی۔

اس کے بعد انشا چائے کی پیش کش کے حوالے سے چین، جاپان، ایران اور پاکستان کا تقابل کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یوں تو چائے ان چاروں ممالک میں پی جاتی ہے لیکن چائے کے سلسلے میں جس قدر تکلف اور اہتمام جاپان میں کیا جاتا ہے شاید دنیا کے کسی اور ملک میں اس قدر تکلف اور اہتمام دیکھنے میں نہیں آتا۔ وہ بتاتے ہیں کہ چائے میں نے پاکستان میں بھی پی ہے اور ایران کے ہوٹلوں میں بھی لوگوں کو چائے پیتے اور پیش کرتے دیکھا ہے۔ لیکن چائے کے سلسلے

میں جس قدر تکلفات جاپان میں برتے جاتے ہیں ان کی مثال ملنا محال ہے۔ وہاں چائے نوشی صرف چائے بنانے کے عمل تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس کی پیش کش کو بھی اسی کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔ انشا جاپانیوں کی چائے کے سلسلے میں تکلفات پسندی کو سفر نامہ *ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں:

''پچھلے دنوں ضیا نے ایک شو میں دکھایا، کہ جاپانی لوگ کس تکلیف سے چائے بناتے پیتے اور پلاتے ہیں۔ ایک جاپانی صاحبہ ہی سارا اہتمام کر رہی تھیں اور سامان بھی موقع کی مناسبت سے مہیا کیا گیا تھا۔ چوکیاں، چٹائیاں، پیالیاں وغیرہ۔ ضیا صاحب بھی جوتا اتارے موجود تھے اور گھٹنوں کے بل اِدھر سے اُدھر پُھدک رہے تھے۔''[۱۴]

بہر حال انشا کو پاکستان، چین، جاپان اور ایران میں یہ اشتراک تو نظر آیا کہ ممالک میں چائے بڑے ذوق وشوق سے پی جاتی ہے۔ البتہ اس کے اجزائے ترکیبی اور پیشکش کے حوالے سے انھیں ان تینوں ممالک میں کہیں اشتراک اور کہیں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

چینی:

ہم اپنی خوراک میں چینی کا ستعمال بھی کثرت سے کرتے ہیں جو توانائی کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ انشا جب چینی کی دستیابی کے حوالے سے پاکستان، سنگاپور، ہانگ کانگ اور فلپائن کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنگاپور، ہانگ کانگ اور فلپائن میں تو چینی بالفراط ملتی ہے لیکن پاکستان میں اس کی خاصی قلت ہے بلکہ یوں سمجھئے قحط کی سی صورتحال ہے۔ انشا بتاتے ہیں کہ ۱۹۶۸ء میں جب میں ہانگ کانگ اور سنگاپور گیا تو ان دنوں کراچی میں چینی کی خاصی قلت تھی لیکن وہاں جا کر دیکھا تو چینی ہر جگہ بالفراط موجود تھی۔ میرا دل چینی کی وافر مقدار دیکھ کر ہی مچل گیا اور میں جو کراچی میں چینی کی قلت کے سبب صرف آدھی چمچ چینی چائے میں ڈالتا تھا۔ سنگاپور اور ہانگ کانگ پہنچ کر چائے میں چینی کی بجائے چینی میں چائے ڈالنے لگا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ۱۹۶۸ء میں کراچی میں چینی کی اس قدر قلت تھی کہ لوگ چینی کی کمی کو نمک، شہد اور خونِ جگر سے پورا کرنے پر مجبور تھے۔ بلکہ چینی کی قلت کے سبب اب شہد بھی خالص مل رہا تھا کیونکہ اب ملاوٹ کے لئے چینی ہی موجود نہیں تھی۔ وہ بتاتے ہیں کہ چینی کی قلت کے باعث شب برات کا تہوار بھی پھیکا ہی رہا کیونکہ اس تہوار پر چینی کی قلت کے سبب ہم نہ تو کوئی میٹھی چیز پکا سکے اور نہ ہی اس تہوار کو صحیح طرح منا سکے، بس یوں کیا کہ صرف ایک ایک چمچ خمیرہ عنبری جواہر والا کا سب کے منہ میں ڈال دیا اور الحمد پڑھ کر شب برات منانے کی رسم پوری کر لی۔ یوں چینی کی قلت سے نہ صرف ہماری روزمرہ کی زندگی متاثر ہوئی بلکہ شب برات جیسا تہوار بھی چینی کی قلت کی نذر ہو گیا۔ اس کے بعد انشا بتاتے ہیں کہ چینی کی قلت کی موجودہ صورتحال بھی گو کافی پریشان کن ہے لیکن اس سے پہلے تو حالات اس سے بھی ابتر تھے، ۱۹۶۸ء سے بیشتر تک کی صورتحال کو انھوں نے سفر نامہ *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

''اب کے ۱۹۶۸ء کا سا حال تو نہ تھا جب لوگ ذیابطیس کے مریضوں پر رشک کیا کرتے تھے کہ اسے شکر آتی تو ہے، خواہ کسی عنوان آتی ہے۔''۱۵

یوں انشا کو چینی کی دستیابی کے حوالے سے پاکستان، فلپائن، سنگاپور اور ہانگ کانگ میں یہ اختلاف نظر آیا کہ سنگاپور، فلپائن اور ہانگ کانگ میں تو چینی با آسانی دستیاب ہوتی ہے جبکہ پاکستان میں اس کی شدید قلت ہے۔

کھانے:

ابتدا میں انسان خوراک کو کچا ہی کھایا کرتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ دیگر علوم وفنون کی طرح وہ کھانا پکانے کے فن سے بھی آشنا ہوا۔ جس دنیا میں انواع واقسام کے کھانے وجود میں آئے۔ انشا کو مشرقِ بعید کے ممالک کی سیّاحت کے دوران اس خطے کے بعض ممالک کے خوش ذائقہ اور مزیدار کھانوں سے لطف اندوز کا موقع بھی ملا۔ یوں تو ہر ملک کے کھانے اور پکوان اس کی شناخت بن جاتے ہیں لیکن انشا کو مشرقِ بعید کی سیّاحت کے دوران اس بات کا بھی پتا چلا کہ پاکستان اور مشرقِ بعید کے ممالک میں تقریباً ایک جیسے ہی ہیں۔ اس حوالے سے جب وہ پاکستان اور انڈونیشیا کے کھانوں کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں یہ پتا چلتا ہے کہ پاکستانی مٹن تکہ اور انڈونیشیا کے مشہور کھانے ساتے یا ساتی میں اشتراک کی کئی صورتیں موجود ہیں۔ دونوں کھانوں میں موجود اشتراکات کا ذکر کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ ساتے میں گوشت کی بوٹیاں لکڑی کی تیلیوں میں پروئی جاتی ہیں اور انھیں دہی میں ڈبو کر دانتوں سے توڑ توڑ کر کھایا جاتا ہے۔ اس طرح مٹن تکہ میں بھی گوشت کی بوٹیوں کو لوہے کی سیخ میں پرو کر پکایا جاتا ہے اور کھاتے ہوئے چھری کانٹے سے مدد نہیں لی جاتی۔ اس کے علاوہ مٹن تکہ کو بھی ساتی کی طرح چٹنی کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ ساتے اور مٹن تکہ کے ذائقے میں یہ فرق تھا کہ ساتے اتنا چٹ پٹا نہیں تھا جبکہ پاکستانی مٹن تکہ زیادہ چٹ پٹا اور مزیدار تھا۔

بہر حال انشا کو انڈونیشی کھانے ساتے اور پاکستانی مٹن کے بنیادی اجزاء اور پکانے کے طریقۂ کار میں تو اشتراک کا پہلو نظر آیا لیکن دونوں کھانوں میں مسالوں کے اختلاف کے باعث ان کے ذائقے میں فرق محسوس ہوا۔

عادات واطوار

عادت سے مراد کام کرنے کا طریقہ اور انداز ہے۔ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں کسی کام کو جس انداز سے سرانجام دیتے ہیں وہ بالآخر ہماری عادت بن جاتا ہے۔ مختلف عادات واطوار کے مجموعے سے کسی فرد کی شخصیت کا مجموعی مزاج متعیّن ہوتا ہے۔ جس طرح ایک فرد اپنی عادات واطوار کے لحاظ سے دوسرے معاشرے اور قوم سے مختلف ہے اسی طرح

ایک معاشرہ اور ایک قوم بھی اپنی عادات و اطوار کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ انشا کو مشرقِ بعید کے ممالک کے سفر کے دوران بھی مختلف افراد اور اقوام سے ملنے کا تجربہ ہوا۔ جس سے انھیں ان افراد اور اقوام کی عادات و اطوار کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع ملا۔ انھوں نے ان اقوام کا تقابل پاکستانی قوم سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراک اور اختلاف کے پہلوؤں کی وضاحت بھی کی۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کی تفصیل ملاحظہ کیجئے۔

ا۔ میانہ روی:

میانہ روی وہ خوبی ہے جو انسان کے اعمال کو حد اعتدال میں رکھتی ہے۔ انشا جب اس خوبی کے حوالے سے پاکستان اور کوریا کے باشندوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس خوبی کے حوالے سے ان دونوں ملکوں کے لوگوں میں مکمل اشتراک کا پہلو موجود ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ کوریا کے باشندے بھی پاکستانی لوگوں کی طرح لباس اور رہن سہن کے سلسلے میں نہ تو ضرورت سے زیادہ صفائی وستھرائی کا خیال رکھتے ہیں اور نہ ہی تکلف پسندی سے کام لیتے ہیں۔ یوں انھیں کو پاکستانی اور کوریائی باشندوں میں یہ اشتراک نظر آیا کہ دونوں ہی لباس اور رہن سہن کے معاملے میں میانہ روی سے کام لیتے ہیں۔

۲۔ وقت کی پابندی:

وقت کی پابندی کرنا اچھی عادت ہے۔ دنیا کی تعلیم یافتہ اور مہذب اقوام ہمیشہ وقت کی قدر کرتی ہیں۔ انشا وقت کی پابندی کے حوالے سے پاکستان اور چین کے باشندوں کا تقابل کرتے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ چینی لوگ وقت کی بہت قدر کرتے ہیں جبکہ ہم لوگ ایسا نہیں کرتے۔ ان کی زندگی کو وقت کی پابندی کے سلسلے کی بہترین مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جب کہ ہماری زندگی کو اس کی بدترین مثال کے طور پر۔ وہ بتاتے ہیں کہ چین میں مجھے جب کہیں جانا ہوتا تو میں وہاں کے متعلقہ افسر کو اپنے آنے کی اطلاع دے دیتا۔ جب میں وہاں جاتا تو دیکھتا کہ متعلقہ افسر مقررہ وقت سے پانچ منٹ پہلے وہاں موجود ہوتا۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ وقت کی پابندی کے سلسلے میں وہاں کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھا جاتا تھا اگر چینی وزیراعظم موزے تنگ نے بھی آپ کو ملاقات کا وقت دے رکھا ہے تو وہ بھی باقی لوگوں کی طرح مقررہ وقت سے پانچ منٹ پہلے دروازے پر موجود ہوگا اور خود آپ کا استقبال کرے گا۔ ملاقات کے دوران نہ تو وہ کسی سے ملے گا اور نہ ہی کسی فون کا جواب دے گا۔ وقت کی پابندی کے حوالے سے جب انشا اپنے وفد کے ارکان کے طرز عمل کا موازنہ کرتے ہیں تو بے حد شرمندگی محسوس کرتے ہیں کیونکہ ان حضرات نے وقت کی پابندی کے سلسلے کی بدترین مثالیں قائم کیں بلکہ ان کا تو یہ کہنا تھا کہ ہمیں چند روز یہاں آ کر اپنی عادتیں خراب نہیں کرنیں۔ پاکستانی وفد کے ارکان نے چین قیام کے دوران وقت کی پابندی کے سلسلے میں جس قسم کے طرز عمل کا مظاہرہ کیا اسے انشا نے سفرنامہ چلتے ہو تو چین کو چلیئے کے درج ذیل حوالے میں یوں

بیان کیا ہے:

''ترجمان حضرات ہمیں یہ بتا کر کہ نو بجے فلاں جگہ پہنچنا ہے، ہمیں لینے کے لئے پونے نو بجے پہنچ کر ہوٹل کی انتظار گاہ میں آ بیٹھے تھے۔ ہماری منڈلی میں سے ایک آدھ آدمی نو بجے نیچے اُتر آتا تھا۔ دوسرا کوئی پانچ منٹ بعد چلا آ رہا ہے۔ تیسرا کوئی دس منٹ بعد برآمد ہوتا ہے۔ اب گنتی ہوئی تو سات میں سے چھ موجود ہیں۔ فلاں صاحب باقی ہیں اور آخری اطلاع کے مطابق غسل خانے میں تھے۔ خدا خدا کر کے وہ آئے اور چلنے کی تیاری ہوئی تو ایک نہ ایک صاحب کو یاد آیا کہ میری پنسل یا میرے سگریٹ یا میری نوٹ بک کمرے میں رہ گئی ہے۔ ان کے اپنے کمرے تک جانے (اور شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر آخری بار کنگھا کرنے) اور اپنی چیز تلاش کر کے لانے میں پانچ سات منٹ اور بیت جاتے، ایسا اکثر ہوا کہ وقت نو بجے کا دیا اور منزل پر ساڑھے نو بجے پہنچے۔ میزبان بیچارے کو آدھ گھنٹہ انتظار کرایا۔''[۱۶]

بہرحال انشا کو وقت کی پابندی کے حوالے سے پاکستان اور چین کے باشندوں میں خاصا اختلاف نظر آیا۔

۳۔ اپنی مدد آپ:

اپنی مدد آپ کرنا بھی ایک اچھی عادت ہے۔ انشا اہل مشرق اور اہل مغرب کا اس عادت کے حوالے تقابل کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ مغرب میں نوکر، خانسامے اور خدمت گار نام کی کوئی مخلوق نہیں ہوتی البتہ ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی ایک بڑی فوج دکھائی دیتی ہے۔ مغرب میں ہر شخص اپنا کام خود کرتا ہے جن میں گھر کے چھوٹے بڑے کاموں سے لے کر دفتری کام بھی شامل ہیں جبکہ مشرق میں لوگوں کو ہر کام نوکروں، ملازموں اور خادموں سے کرانے کی عادت ہوتی ہے۔ یوں انشا کو اپنی مدد آپ جیسی عادت کے حوالے سے مشرق اور مغرب میں صریحاً اختلاف نظر آیا۔

۴۔ قیلولہ:

دن بھر کے کام کے بعد ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ کچھ دیر آرام کرے۔ انشا جب قیلولہ کی عادت کے حوالے سے پاکستان، ایران اور انڈونیشیا کے لوگوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ان تینوں ممالک کے لوگوں میں اس عادت کے حوالے سے اختلاف کا پہلو نظر آتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان کے لوگ تو صرف رات کو سوتے ہیں لیکن ایران میں لوگ رات کے علاوہ دن میں بھی آرام کرتے ہیں جبکہ انڈونیشیا کے باشندے قیلولہ کے لئے جس قدر وقت مختص کرتے ہیں اس کی مثال تو ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ انڈونیشیا میں جب دن کا ایک بجتا ہے تو ہر قسم کے سرکاری و نیم سرکاری ادارے بند کر دیئے جاتے ہیں تا کہ لوگ آرام کر سکیں۔ اگر آپ کسی رکشا میں جا رہے ہوں اور راستے میں ایک بج جائے تو رکشے والا آپ سے مزید سفر کے لئے معذرت کر لے گا اور بتائے گا کہ جناب یہ میرے آرام کا وقت ہے۔ یوں وہ سواری کو بیچ راستے میں اتار کر خود آرام کرنے چلا جاتا ہے۔ بہرحال اس تقابل سے انشا نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''قیلولہ'' کی

عادت کے حوالے سے پاکستان، ایران اور انڈونیشیا کے باشندوں میں اختلاف کا پہلو موجود ہے۔

۵۔ شجرکاری:

جنگلات کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے دنیا کے اکثر ممالک میں قدرتی طور پر پائے جانے والے جنگلات کے ساتھ ساتھ شجرکاری مہم کے ذریعے مصنوعی طور پر بھی درخت لگائے جاتے ہیں۔ انؔشا شجرکاری مہم کے حوالے سے جب پاکستانی اور چینی بچوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ملکوں کے بچے اس مہم میں بڑے ذوق وشوق سے حصہ لیتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب وہ پیکنگ پہنچے کیونکہ وہاں انھوں نے یہ دیکھا کہ چینی بچوں کے ہاتھوں میں ٹہنیاں، پودے اور پیڑ تھے اور وہ شجرکاری مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ انھیں یاد آیا کہ وہ اور ان کے دوست بھی بچپن میں اس مہم میں شرکت کرتے تھے اور فصلوں کو نقصان پہنچانے والی جڑی بوٹیوں کو اکھاڑنے کے لئے دو، دو میل تک پیدل چلا کرتے تھے۔ یوں انؔشا کو پاکستانی اور چینی بچوں میں یہ اشتراک نظر آیا کہ دونوں ہی شجرکاری مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

۶۔ بےلحاظی:

بےلحاظی برتنا بھی ایک عادت ہے۔ گو کہ اس عادت کا شمار اچھی عادتوں میں نہیں ہوتا لیکن پھر بھی یہ عادت کئی لوگوں میں موجود ہوتی ہے۔ اس عادت کے حوالے سے جب انؔشا پاکستان اور انڈونیشیا کے لوگوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ممالک کے لوگوں میں یہ بری عادت موجود ہے اور اس حوالے سے ان میں مکمل اشتراک ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جکارتہ قیام کے دوران کسی شخص نے مجھ سے پوچھا کہ اے مہمان عزیز بندونگ جائیے گے؟ تو میں نے جواب دیا کہ جناب کیوں نہیں جاؤں گا بندونگ کیا، جہاں دل چاہے لے جائیے۔ اس شخص نے میری بات کو فضول جان کر کہا، تو پھر چلے چلئے۔ یہ سن کر انؔشا تو بیچارے حیران و پریشان رہ گئے کیونکہ انھیں ایسے جواب کی ہرگز توقع نہ تھی۔ وہ بتاتے ہیں کہ کچھ ایسی ہی صورتحال ٹوکیو سے آنے والے ایک جاپانی کے ساتھ بھی پیش آئی۔ اس کے ساتھ بھی ایک پاکستانی نے کچھ اسی طرح کا برتاؤ کیا، پہلے تو اس پاکستانی صاحب نے ٹوکیو سے آنے والے سیاح کو پاکستان کے مختلف شہر دکھانے کی پیشکش کی لیکن بعد میں خود ہی اس سے دامن چھڑا لیا۔ بہرحال انؔشا کو یہ جان کر دکھ ہوا کہ یہ بری عادت پاکستان اور انڈونیشیا کے باشندوں میں موجود ہے، یوں اس عادت کی موجودگی کے حوالے سے ان میں اشتراک کا پہلو موجود تھا۔

۷۔ محنت ومشقت:

محنت مشقت کرنا بھی ایک اچھی عادت ہے جو افراد اور اقوام اس عادت کو اپنا لیتے ہیں وہ زندگی کے ہر شعبے میں کامیاب وکامران رہتے ہیں۔ انؔشا اس عادت کے حوالے سے پاکستان اور چین کے لوگوں کا تقابل کرتے ہیں اور برملا یہ کہتے

ہیں کہ چینی، ایک مشقت پسند قوم ہیں جبکہ ہم ایک آرام طلب قوم ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ چینی لوگ دوسروں پر انحصار نہیں کرتے بلکہ اپنا ہر کام خود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ بھاری بھرکم بوجھ خود اٹھاتے ہیں اور اس سلسلے میں انسان کیا جانوروں کی مدد لینا بھی گوارا نہیں کرتے۔ وہاں نہ صرف مرد حضرات کام کرتے ہیں بلکہ خواتین بھی ان کے شانہ بشانہ کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اور ہر قسم کا ہلکا اور بھاری بوجھ خود اٹھاتی ہیں۔ جبکہ پاکستان میں صورتحال یہ ہے کہ یہاں خواتین تو کیا مرد حضرات بھی کام کرنے سے کتراتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو کہیں کوئی بوجھ اٹھانا پڑ جائے تو ایسا کام جسے ایک شخص با آسانی کر سکتا ہے اس کے لئے کئی کئی لوگ بلوائے جاتے ہیں پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ بار بردار جانوروں سے بھی مدد لی جاتی ہے اور پھر بھی کوئی شخص گر رہا ہوتا ہے اور کوئی ہانپ رہا ہوتا ہے جبکہ چینی مرد اور خواتین اپنے سے کئی گنا زیادہ وزن بڑے آرام وسکون سے اٹھا لیتے ہیں۔ یوں انشا نے پاکستانی اور چینی باشندوں کے تقابل سے یہ ثابت کیا ہے کہ چینی ایک مشقت پسند قوم ہیں اور پاکستانی ایک آرام طلب قوم۔ اور ان دونوں اقوام میں محنت ومشقت کے حوالے سے اختلاف کا پہلو موجود ہے۔

۸۔ شوروغل:

شور مچانا اچھی عادت نہیں ہے۔ دنیا کی مہذب اور تعلیم یافتہ اقوام شوروغل اور بلند آواز میں بولنے کو ناپسند کرتی ہیں۔ انشا بتاتے ہیں کہ جاپان ایک مہذب اور تعلیم یافتہ ملک ہے اس لئے یہاں کے لوگ شوروغل کرنے اور بلند آواز میں بات چیت کرنے کو ناپسند کرتے ہیں جب کہ پاکستانی لوگوں کی اکثریت ان پڑھ، جاہل اور غیر مہذب ہے اس لئے یہاں کے لوگوں کو شوروغل کرتے ہوئے کسی قسم کی شرمندگی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ یوں لگتا ہے کہ جیسے شور کرنا اور بلند آواز میں بولنا ان لوگوں کی عادت ہو۔

۹۔ صفائی:

جس طرح ہر انسان کا طرز زندگی دوسرے انسانوں سے مختلف ہوتا ہے اسی طرح مختلف اقوام کا طرز زندگی بھی دوسری اقوام سے مختلف ہوتا ہے، جو کسی حد تک ان کی پہچان بن جاتا ہے۔ انشا نے مشرق بعید کے سفر کے دوران مختلف اقوام کے طرز زندگی کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا اور وہاں صفائی کے حوالے سے موجود صورتحال کا جائزہ بھی لیا۔ انھوں نے مختلف اقوام کے رہن سہن کے بارے میں جو معلومات حاصل کیں ان کا تقابل پاکستانی قوم رہن سہن سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت بھی کی۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

انشا جب پاکستانی اور جاپانی قوم کے رہن سہن کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ پتا چلتا ہے کہ دونوں جانب اس حوالے سے اختلافی صورتحال موجود ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جاپان میں صفائی کو ایک معاشرتی مسئلہ سمجھا جاتا ہے لہٰذا اس مسئلے کے حل کے لیے وہاں قوانین بنائے جاتے ہیں اور ان قوانین پر سختی سے عمل درآمد کرایا جاتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں اول تو اس

مسئلے کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی جاتی بلکہ اسے فرد کا ذاتی مسئلہ قرار دے کر اس سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔ انشا بتاتے ہیں کہ جاپان میں کسی شخص کو سڑکوں پر سگریٹ، کاغذ، پان کی پیک حتیٰ کہ ایک تنکا تک پھینکنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ وہاں رفع حاجت کے لئے مخصوص جگہیں بنائی جاتی ہیں جب کہ ہمارے ہاں اس مقصد کے لئے کسی دیوار کے سائے کو کام میں لایا جاسکتا ہے، ہاں اتنا خیال ضرور رکھا جاتا ہے کہ آپ اپنی ناک پر رومال رکھ لیں اور پاس سے گزرنے والا شخص بھی اپنی ناک پر ایک رومال رکھ لے۔ انشا نے رفع حاجت کے سلسلے میں پاکستانی قوم کے پاس موجود انتظامات اور اس حوالے سے پاکستانی قوم کے اپنائے گئے طرز عمل کو خفیف طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں خوب تنقید کا نشانہ بنایا ہے لیکن ان کا یہ طنز و تنقید بے جا نہیں ہے واقعی ہمارے معاشرے میں ایسے مناظر عام دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کے بعد روحانی صفائی کے حوالے سے پاکستانی اور جاپانی قوم کا تقابل کرتے ہیں تو اس تقابل میں انھیں یہ برملا کہنا پڑتا ہے کہ ہم ظاہری صفائی میں تو جاپانیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے البتہ باطنی صفائی میں وہ بھی ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ہاں کے نیک لوگ تو دل پر ''اللہ ھو'' کی ضربیں لگا کر دل کو گناہوں اور برائیوں سے پاک کرتے ہیں لیکن ہم لوگ طنز و تنقید کے نشتروں سے ایک دوسرے کے دلوں پر ضربیں لگاتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی دل آزاری کا سبب بنتے رہتے ہیں۔

اس کے بعد انشا پاکستان اور قازقستان میں صفائی کی صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ پاکستان کے چھوٹے شہروں اور قازقستان میں نکاسی آب کا نظام بالکل ایک جیسا تھا کیونکہ دونوں جگہ نکاسی آب کے لئے سڑک کے دونوں طرف کھلی نالیاں نظر آئیں۔ البتہ جب وہ پاکستان اور قازقستان میں موجود نالیوں میں صفائی کی صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں قازقستان میں موجود نالیاں پاکستان میں موجود نالیوں سے اس حوالے سے کہیں بہتر نظر آتی ہیں۔

قصہ مختصر انشا کو صفائی کے حوالے سے پاکستان، جاپان اور قازقستان میں زیادہ تر اختلاف کے پہلو ہی نظر آئے۔

ادب و آداب

جو قوم جس قدر مہذب اور تعلیم یافتہ ہوتی جاتی ہے اسی قدر زندگی کے ہر معاملے میں ادب و آداب کو ملحوظ رکھتی ہے۔ انشا کو مشرق بعید کی سیاحت کے دوران مختلف اقوام کے لوگوں کو قریب سے دیکھنے اور زندگی کے مختلف معاملات میں ان کے طرز عمل کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے زندگی کے چند اہم معاملات کے ذریعے پاکستان اور مشرق بعید کے ممالک کے لوگوں کے ادب و آداب کا تقابل بھی کیا اور ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت بھی کی۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کی جاتی ہے۔

ا۔ تحائف:

دنیا کے تقریباً سبھی معاشروں میں تحائف کے تبادلوں کو سماجی تعلقات میں بہتری کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے البتہ

ہر معاشرے میں ان کی قدر و قیمت مختلف ہوتی ہے۔ انشا جب تحائف کی قدر و قیمت کے حوالے سے پاکستانیوں، جاپانیوں اور انگریزوں کے طرزِ عمل کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ان تینوں اقوام کے طرزِ عمل میں کافی اختلاف نظر آتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ انگریز لوگ تو صرف مذہبی تہواروں پر ہی تحائف دیتے ہیں اور تحائف لینے کے بعد وہ تحائف کے تبادلے کو بھی ضروری نہیں سمجھتے بلکہ کئی بار تو وہ صرف تھینک یو کہہ دینا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ جبکہ تحائف کے سلسلے میں ہمارا طرزِ عمل یہ ہے کہ ہم لوگ تحائف صرف کسی ذاتی غرض یا ذاتی مفاد کے پیشِ نظر ہی دیتے ہیں البتہ ہمارے ہاں تحائف کے تبادلے کو ایک رسم کے طور پر نبھایا جاتا ہے۔ تحائف کے تبادلے کے سلسلے میں جاپانی قوم کا طرزِ عمل یہ ہے کہ یہ لوگ تحائف کے تبادلے کو کسی ذاتی غرض یا مفاد کی بجائے صرف ایک مذہبی فریضہ اور عبادت کا درجہ دیتے ہوئے نبھاتے ہیں۔

اس کے بعد انشا تحائف کے انتخاب کے حوالے سے پاکستان اور جاپان کے لوگوں کا تقابل کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ جاپانی لوگ چونکہ مادی نقطہ نظر کے حامی ہوتے ہیں اس لئے تحائف کے انتخاب میں بھی وہ اس نقطہ نظر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے زیادہ تر مادی اشیاء کا انتخاب کرتے ہیں۔ البتہ تحائف کے انتخاب میں وہ اعلیٰ سے اعلیٰ اشیاء کا انتخاب کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ پاکستانی لوگ تو روحانیت پسند ہیں اس لئے تحائف کے تبادلے کی بجائے وہ زیادہ تر دل و جان اور پرخلوص جذبات ہی سے کام چلاتے ہیں۔ ہاں اگر تحفہ دینے والا شخص کوئی شاعر یا مصنف ہو تو وہ اپنی طبع شدہ کتابیں بھی تحفے میں دے سکتا ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں کتابیں پڑھنے کا رواج تو ختم ہوتا جا رہا ہے لہٰذا آج کل ان سے یہی کام لیا جا رہا ہے، خود انشا بتاتے ہیں کہ خود میں نے بھی اپنی کتابوں کا پہلا ایڈیشن لوگوں کو تحفے میں دے دے کر ہی ختم کیا تھا۔

تحائف کے آداب میں انشا وضعداری کا تذکرہ بھی کرتے ہیں اور اس حوالے سے پاکستان اور جاپان کے لوگوں کا تقابل کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ہاں عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ تحفہ دینا صرف مہمان کا کام ہے جبکہ جاپانی لوگ مہمان اور میزبان دونوں حیثیت سے تحفہ دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ جاپانیوں کی وضعداری کے بارے میں وہ بتاتے ہیں کہ جب یہ لوگ کسی کے گھر مہمان کی حیثیت سے جاتے ہیں تب تو تحفہ دیتے ہی ہیں لیکن جب کوئی شخص ان کے ہاں مہمان کی حیثیت سے آئے تو تب بھی یہ لوگ تحفہ دیتے ہیں بلکہ یہی نہیں اگر کوئی شخص جواب میں تحفہ نہ بھی دے تو پھر بھی یہ لوگ تحفہ ضرور دیتے ہیں۔ انشا بتاتے ہیں کہ خود مجھے بھی اپنا طرزِ عمل جاپانیوں کی وضعداری دیکھ کر بدلنا پڑا۔

تحائف کے سلسلے میں اس کی پیکنگ کو بھی قطعی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انشا جب اس حوالے سے پاکستان، جاپان اور دنیا کی دیگر اقوام کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں صرف اختلاف کا پہلو ہی نظر آتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جاپان سمیت دنیا کے دیگر مہذب ممالک میں تحفے کے ساتھ ساتھ اس کی پیکنگ کو بھی خاص اہمیت دی جاتی ہے بلکہ ان ممالک میں تو اسے باقاعدہ ایک فن کا درجہ حاصل ہے۔ ان ممالک کے لوگ تحفے کی پیکنگ کرتے ہوئے مختلف رنگوں کے

کاغذوں، ڈبوں، لفافوں، ڈوریوں اور فیتوں کا استعمال کرتے ہیں جن سے یہ اشیاء بے حد خوشنما اور خوبصورت نظر آتی ہیں، جس سے تحفہ لینے والے اور دینے والے دونوں کا دل خوش ہوتا ہے۔ جبکہ پاکستان میں پیکنگ کے حوالے سے موجود صورتحال اس کے بالکل برعکس ہے کیونکہ یہاں اشیاء وتحائف کے لئے پیکنگ کو ضروری ہی نہیں سمجھا جاتا۔ انشا پیکنگ کے حوالے سے پاکستانیوں کے طرزِ عمل کی وضاحت بڑے طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں سفرنامہ ابن بطوطہ کے تعاقب میں کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں:

''ادھر ہم اپنی اسمال انڈسٹریز کی ہینڈی کرافٹ شاپ میں جاتے ہیں تو سیلز مین دانت نکال دیتا ہے کہ صاحب یونہی جیب میں ڈال لیجئے، ورنہ یہ لیجئے براؤن کاغذ کا لفافہ ہے اس میں ڈال لیجئے یا آج کی اخبار میں باندھ دیتے ہیں۔ اس میں آپ کا کالم بھی ہے جس کے پاس تحفہ جائے گا اس بہانے آپ کا کالم بھی پڑھ لے گا۔'' ۷؎

تحائف کے آداب کے سلسلے میں شکریہ ادا کرنے کی رسم کی بھی اپنی جگہ بہت اہمیت ہے۔ اس رسم کے ادا کرنے میں بھی انھیں جاپانی ہی سرفہرست نظر آتے ہیں۔ انشا بتاتے ہیں کہ جاپانی لوگ تحفہ دیکھے بغیر ہی اس کی تعریف کرتے ہیں اور تحفہ دینے والے کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں لوگوں کا وطیرہ ہے کہ پہلے تو وہ تحفے میں ملنے والی چیز کو بڑے غور سے دیکھتے ہیں تاکہ اس کی قیمت کا تعین ہو سکے اور پھر کہیں جا کر وہ اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ تحفہ دینے والے کا شکریہ ادا کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

الغرض انشا نے پاکستانی اور جاپانی لوگوں کا تقابل تحائف کی قدر و قیمت، انتخاب، نوعیت، وضعداری، پیکنگ اور شکریہ ادا کرنے کی رسم کے حوالے سے کیا اور اس تقابل میں انھیں زیادہ تر اختلاف کے پہلو ہی نظر آئے۔

۲۔ سلام دعا:

دنیا کے تقریباً سبھی مہذب معاشروں میں سلام دعا کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور رائج ہوتا ہے۔ انشا جب پاکستانیوں اور جاپانیوں کے سلام دعا کے طریقوں کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جاپانی زندگی کے باقی معاملات کی طرح سلام دعا کے طریقے میں بھی حد سے زیادہ تکلفات برتتے ہیں، جبکہ ہمارے ہاں سلام دعا کا طریقہ بہت سادہ ہے۔ اس سلسلے میں وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ہاں تو مصافحہ کا رواج ہے جبکہ جاپانی جھک کر سلام کرتے ہیں اور جھکنے میں وہ حفظ مراتب کا پورا خیال رکھتے ہیں، مثلاً ایسا کرتے ہوئے وہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ کس شخص کے سامنے کتنا جھکنا ہے، تھوڑا جھکنا ہے یا کمر کو دہرا کرنا ضروری ہے۔ بہرحال انشا کو پاکستان اور جاپان کے لوگوں کے سلام دعا کے طریقوں میں اختلاف کا پہلو ہی نظر آیا۔

۳۔ خودکشی:

زندگی خدا کی ایک نعمت ہے۔لیکن کبھی کبھی زندگی میں موجود مشکلات سے گھبرا کر انسان اپنی زندگی کو ختم کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔ انشا جب خودکشی کے حوالے سے پاکستانیوں اور جاپانیوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جاپانی لوگ زندگی گزارنے میں تو ادب و آداب کا خیال رکھتے ہیں حتیٰ کہ خودکشی کرتے ہوئے بھی یہ لوگ ادب و آداب کو ملحوظ رکھتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں ایسا نہیں کیا جاتا۔ وہ بتاتے ہیں کہ جاپان میں خودکشی کو ہارا کیری کہا جاتا ہے اور اسے باقاعدہ ایک رسم کے طور پر ادا کیا جاتا ہے۔ وہاں خودکشی کرنے والا اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ پیٹ میں چھرا کس طرف سے اور کتنا گھونپا جائے، لباس کس وضع قطع کا ہو، اور نشت کا طریقہ کیا ہو وغیرہ وغیرہ۔ جبکہ ہمارے ہاں جہاں زندگی کے دیگر معاملات میں ادب و آداب کا خیال نہیں رکھا جاتا وہیں خودکشی کرتے ہوئے بھی کسی قسم کے ادب و آداب کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ بس جب دل چاہا کسی ریلوے لائن پر سر رکھ کر، زہر کھا کر یا کبھی چھلانگ لگا کر اپنی زندگی ختم کر لی جاتی ہے۔ البتہ اجتماعی خودکشی کو یہاں بھی ایک رسم کی طرح نبھایا جاتا ہے۔ انشا ملکی تباہی کے تمام مظاہروں، ہڑتالوں، بسوں کو آگ لگانے، کارخانوں کو بند کروانے، کرفیو لگوانے اور پولیس و رینجرز سے ہاتھا پائی جیسے تمام مظاہر کو اجتماعی خودکشی سے تعبیر کرتے ہیں جس میں چھوٹے، بڑے سب لوگ شریک ہوتے ہیں اور باقاعدہ اسے ایک رسم کی طرح ادا کرتے ہیں۔ یوں انشا کو انفرادی خودکشی کے حوالے سے تو پاکستان اور جاپان میں اختلاف نظر آیا لیکن پاکستانیوں کی اجتماعی خودکشی اور جاپانیوں کی انفرادی خودکشی میں مکمل طور پر اشتراک کی صورت نظر آئی۔

اخلاقی اقدار:

کسی قوم کا اچھے اور پاکیزہ اخلاق سے متصّف ہونا اس کے مہذب اور تعلیم یافتہ ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ انشا جب اخلاقی اعتبار سے پاکستان، چین اور جاپان کے باشندوں کا تقابل کرتے ہیں تو اس تقابل میں انھیں چینی اور جاپانی باشندے پاکستانی باشندوں کی نسبت زیادہ بہتر نظر آتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ جاپانی لوگ محنتی، ایماندار، سچ بولنے والے، دوسروں کا ادب و احترام کرنے والے اور امن پسند ہوتے ہیں جبکہ ہم لوگ اخلاقی اعتبار سے حد درجہ پستی کا شکار ہیں۔ ہم لوگ جھوٹے، کام چور، بے ایمان، تندخو اور جھگڑالو ہیں۔ وہ اخلاقی اعتبار سے پاکستانیوں اور جاپانیوں کے طرزِ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر جاپان میں کوئی حادثہ ہو جائے تو دونوں فریق پہلے تو جھک کر ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں پھر جس فریق کی غلطی ہوتی ہے وہ یا تو نقد رقم دے دیتا ہے یا پھر گاڑی کی مرمت کروا دیتا ہے۔ جبکہ پاکستانیوں کے جھوٹ اور غیر مصالحت پسندانہ طرزِ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے وہ ایک پاکستانی صاحب کا واقعہ بیان کرتے ہیں جو روزانہ گاڑی بیک کر کے نکالا کرتے تھے۔ ایک دن موصوف گانا گانے میں مشغول تھے کہ کسی گاڑی کو ٹکر ماردی، ایسا کرنے

کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ متاثرہ شخص کو نقد رقم ادا کرتے یا پھر اس کی گاڑی کی مرمت کرواتے۔ لیکن انھوں نے اپنی غلطی ماننے سے ہی انکار کر دیا بلکہ الٹا الزام ٹوکیو میونسپلٹی پر ڈال دیا اور کہا کہ ہمارے ملک میں تو لوگوں کی سہولت کے لیے ہر گلی کی نکڑ پر آئینے لگائے جاتے ہیں جن میں گاڑی بیک کرتے ہوئے نظر آتی ہے۔ جس سے نہ صرف لوگوں کو سہولت رہتی ہے بلکہ حادثات بھی بہت کم ہوتے ہیں۔ اب ہمیں چونکہ ایسی سہولیات کی عادت ہے، اگر ٹوکیو میونسپلٹی نے اپنے ملک میں لوگوں کو ایسی سہولیات فراہم نہیں کیں تو اس میں ہمارا کیا قصور۔ اس لیے اس حادثے کی ساری ذمہ داری دراصل ٹوکیو میونسپلٹی پر ہی عائد ہوتی ہے، اگر یہ میونسپلٹی ہر گلی کی نکڑ پر آئینہ لگواتی تو آج یہ حادثہ رونما ہی نہ ہوتا۔ جج صاحب بھی ان پاکستانی صاحب کی دلیل سن کر حیران ہوئے اور ان پر جرمانہ عائد کرنے کی بجائے الٹا انھوں نے ٹوکیو میونسپلٹی کو یہ حکم صادر فرما دیا کہ اور کہیں آئینہ لگائیں یا نہ لگائیں لیکن ان پاکستانی صاحب کی گلی کی نکڑ پر ضرور آئینہ لگائیں کیونکہ انھیں ایسی سہولیات کی عادت ہے۔

اس کے بعد وہ اخلاقی اقدار کے حوالے سے چین کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ چین میں نہ صرف قوانین بنائے جاتے ہیں بلکہ ان پر سختی سے عمل درآمد بھی کروایا جاتا ہے۔ وہاں جوئے، شراب، نائٹ کلب، گداگری، مفت خوری، اغواء اور قتل و غارت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ٹریفک قوانین کی پابندی وہاں ہر شخص کرتا ہے اس لیے وہاں حادثات بھی نہیں ہوتے اور اخبارات میں گرم گرم خبریں بھی نہیں ہوتیں۔ جبکہ پاکستان کا حال یہ ہے کہ اول تو یہاں صفائی کے سلسلے میں کوئی قانون موجود ہی نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو اس پر عمل درآمد کروانا بے حد مشکل ہے۔ بہر حال انشا کو چین اخلاقی اعتبار سے پاکستان سے کہیں بہتر نظر آیا۔

بخشش، نفس کی تذلیل کا ایک ذریعہ ہے لیکن آج دنیا کے بیشتر ممالک میں بخشش لینے اور دینے کا رواج موجود ہے۔ انشا جب بخشش کے حوالے سے پاکستان، چین، جاپان، یورپ اور امریکہ کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ چین اور جاپان تو ایسے ملک ہیں جہاں بخشش نہ دی جاتی ہے اور نہ ہی لی جاتی ہے۔ ان دونوں ملکوں میں بخشش کا رواج ہی نہیں ہے کیوں کہ یہ لوگ اسے نفس کی تذلیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں جبکہ پاکستان سمیت یورپ اور امریکہ جیسے ممالک میں تو اس کا ادا کرنا اب ایک رسم بن چکا ہے۔ ان ممالک کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹلوں کے بیرے تو سروس چارجز کے باوجود بھی بخشش کا تقاضا کرتے ہیں اور مل جانے پر تھینک یو کہہ دیتے ہیں۔

اخلاقی اعتبار سے دیکھا جائے تو تمام انسان برابر ہیں۔ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کوئی برتری اور امتیاز حاصل نہیں ہے لیکن دنیا کے کئی ممالک میں رائج ذات پات کا نظام موجود ہے۔ ذات پات کی تقسیم کا نظام یوں تو انسانوں کے درمیان باہمی شناخت کے مقصد سے تشکیل دیا گیا تھا لیکن بعد میں یہی نظام انسانوں میں باہمی امتیاز اور تفریق کی بنیاد بنا۔ انشا جب اس نظام کے حوالے سے پاکستان اور چین کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ چین میں تو یہ نظام

موجود ہی نہیں ہے لیکن پاکستان میں یہ نظام موجود ہے۔ انشا بتاتے ہیں کہ مجھے اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب میں اور کوی جسیم الدین چین کے ایک شہر سوچو گئے۔ ہم نے وہاں ایک گائیڈ سے تبت میں ذات پات کے نظام کے بارے میں پوچھا تو اس نے اس نظام کے بارے میں قطعی لاعلمی کا اظہار کیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ یہ نظام وہاں موجود ہی نہیں ہے۔ یوں ذات پات کے حوالے سے انشا کو پاکستان اور چین میں صرف اختلاف کا پہلو ہی نظر آیا۔

عفت وحیا بھی ایک اخلاقی قدر ہے۔ لیکن انشا کو اس خوبی کے حوالے سے پاکستان، بھارت، چین، ہانگ کانگ اور سنگاپور میں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان اور بھارت میں تو عفت وحیا کا تصور موجود ہے اور ان دونوں ممالک میں شراب سے بھی اجتناب کیا جاتا ہے۔ لیکن ہانگ کانگ اور سنگاپور جیسے ایشیائی ممالک تو اپنی عیش پرستی کی وجہ سے ہی مشہور ہیں۔ وہاں مہمانوں کو بھی گھروں میں لے جانے کی بجائے گھیشا گھروں میں لے جایا جاتا ہے اور ان کی تواضع کی جاتی ہے۔ یوں انشا کو عفت وحیا کے حوالے سے پاکستان اور بھارت میں تو اشتراک نظر آیا لیکن اسی حوالے سے سنگاپور اور ہانگ کانگ میں مکمل اختلاف نظر آیا۔

اخلاقی اقدار کے بعد انشا اخلاقی جرائم کے حوالے سے پاکستان اور سری لنکا کے باشندوں کا تقابل کرتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ان دونوں ممالک کے باشندے اخلاقی تنزّلی کا شکار ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ چوری کرنا یوں تو ایک شرمناک فعل ہے ہی لیکن ان ممالک کے لوگ تو اپنی عبادت گاہوں میں بھی اس جرم کا ارتکاب کرنے سے باز نہیں آتے۔ اس بات کا اندازہ انشا کو اس وقت ہوا جب وہ سری لنکا میں ایک مندر دیکھنے گئے تو وہاں انھوں نے جوتوں کی رکھوالی کرنے والے کئی لوگ دیکھے جیسے ہمارے ہاں مسجدوں اور مذہبی مقامات میں موجود ہوتے ہیں جس سے انھیں یہ اندازہ ہوا کہ یہاں کے لوگ بھی پاکستانی لوگوں کی طرح چور ہیں اور اپنے مذہبی مقامات میں بھی اس جرم کا ارتکاب کرنے سے باز نہیں آتے۔ یوں انشا کو چوری جیسے جرم میں پاکستان اور سری لنکا کے لوگ ملوث نظر آئے۔

اخلاقی جرائم کے ذکر میں انشا اسمگلنگ کا ذکر بھی کرتے ہیں اور اس حوالے سے پاکستان اور جاپان کے باشندوں کا تقابل کرتے ہیں تو اس تقابل سے انھیں معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ممالک کے لوگ ہی اس اخلاقی برائی کا شکار ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ اسمگلنگ کا کاروبار ویسے تو ان دونوں ملکوں میں ہی ہوتا ہے لیکن ان دونوں جگہ اسمگل کی جانے والی اشیاء کی نوعیت میں اختلاف موجود ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جاپان میں موٹر سائیکل، ریڈیو اور دیگر ہلکی مشینیں چوری نہیں کی جاتیں بلکہ صرف بھاری مشینیں مثلاً کھودنے والی مشینیں اور بھاری کرینوں کے چوری ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ بہر حال انشا کو سمگلنگ جیسے جرم میں پاکستان اور جاپان دونوں کے لوگ ملوث نظر آئے۔

اندازِ فکر:

انسان کی فضیلت دیگر مخلوقات پر صرف اس کی عقل و دانائی کے سبب ہی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ایک تو ہر انسان میں عقل و دانائی کی صلاحیت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے اور دوسرے اس کی سوچ بھی دوسرے انسان سے مختلف ہوتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ہر انسان کی ترجیحات ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ یوں مختلف افراد کی طرح مختلف اقوام کی ترجیحات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں جن کے باعث ان کے اندازِ فکر میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ انشاؔ جب پاکستانی اور چینی لوگوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ چینی لوگ غیر مادی نقطہ نظر کے حامل ہیں اور پاکستانی لوگ مادی نقطہ نظر کے۔ چینی لوگ ہر کام اپنے ملک و قوم کی بہتری اور فلاح و بہبود کے خیال سے کرتے ہیں اور اپنے ذاتی مفاد پر ملکی و قومی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ جبکہ ہم لوگ ملک و قوم کے مفاد کی بجائے صرف اپنے ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ انھیں کو یہ جان کر ہوا کہ پہلے چین میں ادیبوں اور شاعروں کو ان کی کتابوں کی اشاعت کے حساب سے رائلٹی ملتی تھی جو بعض اوقات بہت زیادہ ہو جایا کرتی تھی لیکن ۱۹۶۵ء میں یہ طے پایا کہ ادیبوں اور شاعروں کو کتابوں کے صرف پہلے ایڈیشن پر ہی رائلٹی ملے گی۔ وہ بتاتے ہیں کہ میں نے ایک چینی دوست سے اس بارے میں دریافت کیا تو اس نے کہا کہ جناب دنیا میں صرف روپیہ پیسہ ہی بڑی چیز نہیں ہے اس کے علاوہ بھی کچھ قدریں ہیں۔ انشاؔ بتاتے ہیں کہ پہلے تو مجھے ان کی بات کی سمجھ نہ آئی لیکن جب میں نے اپنے ملک کی بدحالی اور پسماندگی اور اخلاقی پستی کی طرف نظر کی تو مجھے یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ آ گئی۔ وہ پاکستانیوں کے مادی نقطہ نظر اور جاپانیوں کے غیر مادی نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چینی ڈاکٹر اور انجینئر کم تنخواہ اور سہولیات کے باوجود اپنے ملک میں کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بلکہ ایسے چینی ڈاکٹر اور انجینئر جو پہلے بیرون ملک کام کر رہے تھے وہ بھی وہاں کا عیش و آرام اور سہولیات چھوڑ کر اپنے وطن واپس آ گئے اور اپنے ملک میں کم تنخواہ اور سہولیات کے باوجود اپنی ذمہ داریاں سرانجام دے رہے ہیں۔ جبکہ ہمارے ملک کے ڈاکٹر اور انجینئر حضرات بہتر مستقبل کی خاطر اپنے ملک کی بجائے بیرون ملک کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بہر حال انشاؔ نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان دونوں اقوام کے اس طرزِ عمل کے پس پردہ دراصل ان کا اندازِ فکر ہی کارفرما ہے جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

ہوٹل اور سرائیں:

ہوٹل سے مراد ایسی جگہ ہے جو مسافروں کو رہائش کے ساتھ ساتھ دیگر ضروری سہولیات بھی فراہم کرے اور کسی حد تک گھر کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش بھی کرے۔ آج دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو گا جہاں ہوٹل موجود نہ ہوں۔ انشاؔ کو مشرقِ بعید کی سیاحت کے دوران اس خطے کے مختلف ممالک کے ہوٹلوں میں قیام کرنے کا موقع ملا۔ اس دوران انھوں نے

پاکستان، مشرقِ بعید اور کئی دیگر ممالک کے ہوٹلوں کا تقابل بھی کیا اور ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت بھی کی۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو بیان کیا جا رہا ہے۔

انؔشا نے کئی بار جاپان کو اپنی سیر و سیاحت کا مرکز بنایا۔ ایک بار انھیں ٹوکیو کے نواحی قصبے میں واقع مارونوچی نامی ہوٹل میں قیام کرنے کا موقع ملا۔ وہ اس اعلیٰ درجے کے جاپانی ہوٹل کا تقابل ایک معمولی نوعیت کے پاکستانی ہوٹل سے کرتے ہیں جو ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی واقع ہے۔ اس تقابل میں وہ پاکستانی ہوٹل کو جاپانی ہوٹل سے ہر لحاظ سے بہتر ثابت کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تو وہ اس جاپانی ہوٹل مارونوچی کے نام ہی کو عجیب و غریب قرار دیتے ہیں اور بڑے مزاحیہ انداز میں یہ بتاتے ہیں کہ جاپان قیام کے دوران اس ہوٹل کے حوالے سے سب سے پہلی مشکل تو مجھے یہ پیش آئی کہ میرے لیے اس ہوٹل کا نام یاد رکھنا ہی مشکل تھا۔ چنانچہ اس ہوٹل کا نام یاد کرنے کے لیے میں نے کچھ تو ایک اردو محاورے ''مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ'' سے اخذ و اکتساب کیا اور جہاں تک سوال رہا لفظ نوچی کا تو یہ لفظ میں نے خود ہی ساتھ لگا لیا۔ اس کے بعد وہ کرائے اور دیگر سہولیات کے حوالے سے بھی جاپانی اور پاکستانی ہوٹل کا تقابل کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ ہوٹل مارونوچی کا کرایہ پاکستانی ہوٹل کے مقابلے میں بہت زیادہ تھا اور یہاں کرائے میں کھانے پینے اور دیگر سہولیات کے اخراجات بھی شامل نہیں کیے گئے تھے، اس کے علاوہ یہاں کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتیں بھی بہت زیادہ تھیں۔ جہاں تک بات رہی سہولیات کی تو اس ہوٹل میں مسافروں کے آرام کا خیال اس طرح رکھا جاتا تھا کہ گرمیوں کے موسم میں معمول کی لوڈ شیڈنگ کے علاوہ بھی ایئر کنڈیشنڈ بند رکھے جاتے تھے اور ہوٹل انتظامیہ مسافروں کو یہ بتاتی تھی کہ بجلی کے بحران کے سبب ایسا کرنا ضروری ہے۔ یوں ایک مسافر وہاں دن اور رات پُرسکون نیند کے لیے ترستا رہتا تھا حالانکہ اس کے لیے رات کی پر سکون نیند سے بڑھ کر کسی اور چیز کی اہمیت نہیں تھی۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس جاپانی ہوٹل میں کمرے کا سائز اتنا چھوٹا تھا کہ کوئی شخص مشکل سے ہی کروٹ بدل سکتا تھا جس کے سبب مسافروں کا سکون سے سونا محال تھا۔ جاپانی ہوٹل مارونوچی کی خامیاں بتانے کے بعد انؔشا پاکستانی ہوٹل کی بابت بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ہوٹل کیا ہے، بہت سی چارپائیاں درختوں تلے بچھی ہیں جن کا کرایہ پہلے تو صرف چار آنے تھا لیکن اب مہنگائی کی وجہ سے شاید آٹھ آنے ہو گیا ہوگا۔ وہ بتاتے ہیں کہ اگر بجلی نہ ہو پھر بھی یہاں مسافر درختوں کی گھنی چھاؤں تلے چین کی نیند سوتے ہیں۔ اس ہوٹل میں جہاں انھیں بہت سی خوبیاں نظر آئیں وہیں ایک خامی بھی نظر آئی۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہ پاکستانی ہوٹل باقی تو ہر لحاظ سے جاپانی ہوٹل مارونوچی سے بہتر تھا لیکن اس ہوٹل میں رفع حاجت کے لیے کوئی غسلخانہ موجود نہیں تھا۔ لیکن وہ بڑے طنزیہ اور مذاحیہ انداز میں بتاتے ہیں کہ یہاں ٹھہرنے والے مسافروں کو اس سلسلے میں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ قریب ہی یہاں کوئی نہ کوئی نالہ یا دیوار ضرور موجود ہوگی جو ان کی اس قسم کی احتیاجات کو پورا کرنے کے لیے کافی ہوگی۔ اس سلسلے میں صرف اتنا خیال رکھنا ضروری ہے کہ رفع حاجت کرنے والا شخص ایک رومال اپنی ناک پر رکھ لے اور اگر کوئی شخص قریب سے گزرے تو

وہ بھی ایسا ہی انتظام کر لے۔ انشا نے رفع حاجت کے لیے پاکستانی قوم کے طریقوں کو گہرے طنز وتنقید کا نشانہ بنایا ہے لیکن ان کا یہ طنز بالکل بجا ہے واقعی ہم اپنے گرد و نواح میں لوگوں کو رفع حاجت کے اس انتظام سے استفادہ کرتے ہوئے اکثر دیکھتے ہیں۔

انشا کو جاپان سمیت دیگر ایشیائی ممالک کے ہوٹلوں اور پاکستان کے ہوٹلوں میں ایک اختلاف یہ بھی نظر آیا کہ ان ممالک کے ہوٹلوں کی انتظامیہ مسافروں کے قیام وطعام کا بندوبست کرنے کے علاوہ اپنے مذہب کی تبلیغ کا فریضہ بھی سر انجام دیتی ہیں۔ اس مقصد کے تحت وہ ہوٹلوں میں اپنی مذہبی کتابیں مع ترجمے کے رکھتی ہیں تا کہ اگر کوئی ایسا مسافر آجائے جو کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھتا ہو تو وہ ان کتابوں کو پڑھ کر ان کے مذہب کے بارے میں کچھ نہ کچھ جان سکے۔ وہ بتاتے ہیں کہ میں نے دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر اختیار کیا، یورپی ممالک کے دوران بھی میں نے دیکھا کہ مشنریوں کی سوسائٹی نے انجیل کی جلدیں ہوٹلوں میں رکھوائی ہوئی تھیں اسی طرح بدھ مذہب کی کتابیں بھی میں نے ایک ہوٹل میں دیکھیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ملک میں دین اسلام کی تبلیغ کرنے والے آخر اپنے ملک کے ہوٹلوں کو تبلیغ کا ذریعہ کیوں نہیں بناتے شاید یہ لوگ اس لیے قرآن مجید کو ہوٹلوں میں نہیں رکھتے کہ کوئی شخص اسے چوری نہ کر لے یا کسی کو دے کر اس کا ہدیہ وصول نہ کر لے۔ یوں ہم لوگ صرف اس ڈر یا خوف کی وجہ سے اپنے مذہب کی تبلیغ کے اس وسیلے کو کام میں نہیں لا رہے۔ انشا نے اسلام کی تبلیغ کے سلسلے میں ہمارے طرز عمل کو خوب طنز وتنقید کا نشانہ بنایا ہے لیکن ان کا یہ طنز بے جا نہیں ہے۔ بہر حال انھیں کو پاکستان اور جاپان سمیت دنیا کے دیگر ممالک کے ہوٹلوں میں تبلیغی مقاصد کے لحاظ سے اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

انشا کو پاکستان اور جاپان کے ہوٹلوں میں جہاں اختلاف کے کئی پہلو نظر آئے وہیں اشتراک کی ایک صورت بھی نظر آئی۔ اشتراک یہ تھا کہ پاکستان اور جاپان دونوں ملکوں کے ہوٹلوں کے باہر اسٹینڈ بنے ہوئے تھے۔ جاپان میں چونکہ بارش بہت زیادہ ہوتی ہے اس لیے جاپانی جب بھی گھر سے باہر نکلتے ہیں تو چھاتا لے کر باہر نکلتے ہیں اس لیے جاپان میں ہوٹلوں کے باہر چھاتا رکھنے کے لیے اسٹینڈ بنائے جاتے ہیں۔ اسی طرح پاکستانی لوگوں کی ایک بڑی تعداد سائیکلوں کا استعمال کرتی ہے اس لئے پاکستانی ہوٹلوں کے باہر سائیکل رکھنے کے لیے اسٹینڈ بنائے جاتے ہیں۔ یوں انشا کو پاکستان اور جاپان کے ہوٹلوں میں یہ اشتراک نظر آیا کہ دونوں جگہ کے ہوٹلوں میں اسٹینڈ بنائے جاتے ہیں۔

انشا اپنی سرکاری مصروفیات کے سلسلے میں سری لنکا بھی گئے، وہاں بھی ان کا قیام زیادہ تر ہوٹلوں میں ہی رہا۔ وہ بتاتے ہیں کہ سری لنکا میں اسلامی ہوٹل بھی موجود تھے۔ جذبۂ اسلامی کے تحت انھوں نے وہاں کے ایک مسلم ہوٹل کا انتخاب کیا، اس ہوٹل میں قیام وطعام کے دوران انھیں اس ہوٹل کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جس سے انھیں اس ہوٹل میں کراچی کی بولٹن مارکیٹ کے ملیاری ہوٹل کا سا نقشہ نظر آیا۔ جب وہ سری لنکا کے مسلم ہوٹل اور کراچی کے ملباری ہوٹل کا تقابل کرتے

ہیں تو انھیں ان دونوں ہوٹلوں میں اشتراک اور اختلاف کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ انشا کو ان دونوں ہوٹلوں میں اشتراک کی پہلی صورت تو یہ نظر آئی کہ مسلم ہوٹل کی عمارت بھی ملیاری ہوٹل کی عمارت کی طرح دو منزلہ تھی جس کی نچلی منزل پر تو چائے کا انتظام تھا بلکہ یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ یہ منزل چائے کا ایک ریستوران معلوم ہوتی تھی اور دوسری منزل پر خواتین اور حضرات کے لیے کھانے کا انتظام تھا۔ اشتراک کی دوسری صورت انھیں یہ نظر آئی کہ مسلم ہوٹل اور ملباری ہوٹل میں بیروں کا طرز عمل بھی بالکل ایک جیسا تھا کیوں کہ ان دونوں ہوٹلوں کے بیرے بہت چرب زباں اور تیز طرار تھے اور اپنی چکنی چوپڑی باتوں سے گاہکوں کو گھیر لیتے ہیں۔ یہ لوگ مالکوں کے اتنے خیر خواہ تھے کہ جان بوجھ کر زیادہ چیزیں لاکر گاہکوں کے سر تھونپ دیتے تھے۔ اشتراک کی تیسری صورت صفائی کی ناقص صورتحال کے حوالے سے ان کے سامنے آئی۔ دونوں ملکوں کے ہوٹلوں میں صفائی کے ناقص انتظام کے حوالے سے موجود اشتراک کو انشا سفر نامہ *ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں بڑے مضحک انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''پانی وہاں بھی بیرے گلاس میں انگلیاں ڈبو کر لاتے تھے لہٰذا اورنج اور سوڈے سے پانی کا کام لیا۔
> اور بل دے کر ہم اس بات پر شکر کرتے ہوئے ہوٹل واپس چلے آئے کہ اپنی اخوت اسلامی کو بے لگام نہیں
> ہونے دیا۔ اور مسلم ہوٹل میں طعام کے علاوہ قیام نہیں کیا۔'' [۱۸]

انشا کو سری لنکا کے مسلم ہوٹل اور کراچی کے ملباری ہوٹل میں جہاں اشتراک کی چند صورتیں نظر آئیں وہیں اختلاف کا ایک پہلو بھی نظر آیا۔ وہ اختلاف یہ تھا کہ سری لنکا کے مسلم ہوٹل میں کھانا ناریل کے تیل میں پکایا گیا تھا اور ملباری ہوٹل میں کھانا پکانے کے لیے گھی کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس اختلاف کی وجہ وہ ان دونوں ملکوں کے لوگوں کی غذائی عادات میں موجود اختلاف کو قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ناریل کا تیل ہمارے ہاں صرف بالوں کی نشوونما اور بڑھوتری کے لیے ہی مخصوص سمجھا جاتا ہے جبکہ سری لنکا میں کھانا پکانے کے کام بھی آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انشا کے سامنے مچھلی، چاول اور ناریل کے تیل میں پکا ہوا شوربہ پیش کیا گیا تو انھوں نے شوربہ صرف اس لئے نہیں کھایا کہ یہ ناریل کے تیل میں پکا ہوا تھا اور چاول اور مچھلی کھا کر اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کی۔

بہر حال انشا کو سری لنکا کے مسلم ہوٹل اور کراچی کے ملباری ہوٹل میں اشتراکات کے پہلوؤں ساتھ ساتھ اختلافات کی ایک صورت بھی نظر آئی۔

انشا کو فلپائن اور پاکستان کے ہوٹلوں میں بھی اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو نظر آئے۔ جب وہ مہنگائی کے حوالے سے کراچی اور فلپائن کے ہوٹلوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ پتا چلتا ہے کہ فلپائن کے ہوٹل کراچی کے ہوٹلوں کے مقابلے میں زیادہ مہنگے ہیں۔ کیوں کہ کراچی کے ہوٹلوں میں تو اشیاء کی قیمتیں ایک بار بڑھائی جاتی ہیں لیکن فلپائن میں ان کی قیمتوں میں روز بروز اضافہ کیا جاتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ کراچی کے ہوٹلوں میں کوکا کولا کی قیمت بڑھا کر ڈیڑھ روپیہ کر

دی گئی ہے لیکن فلپائن کے ہوٹلوں میں تو مہنگائی کی صورتحال یہ ہے کہ کسی ایک قیمت پر اکتفانہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دن ایک چیز کی قیمت کچھ ہوتی ہے اور دوسرے دن کچھ اور۔ اشیائے خوردونوش کے علاوہ ان ہوٹلوں میں خدمات کا معاوضہ بھی عام معاوضے سے دوگنا لیا جاتا ہے اس کا اندازہ انشا کو اس وقت ہوا جب انھوں نے خط لکھنے کے لئے ہوٹل کے منیجر سے اسٹامپ پیپر کا تقاضا کیا۔ منیجر صاحب نے انھیں بتایا کہ متعلقہ شخص تو اس وقت موجود نہیں ہے اس لیے ہم خود ہی یہ کارڈ پوسٹ کردیں گے۔ انھوں نے بتایا کہ پاکستان کو خط پچاس سنتادو یعنی آدھے پیسوں میں جاتا ہے یعنی پاکستانی روپے کے حساب سے بارہ آنے سمجھئے۔ اب چونکہ آپ کا خط خاصا طویل ہے اس لیے اس کا وزن چار ریٹ ہے، پچیس سنتادو فی ریٹ کے حساب سے دو پیسو بیس سنتادو ہوئے اور پوسٹ کارڈ کے ۳۵ سنتادو۔ انشا نے یہ ریٹ سن کر انھیں بڑے ڈاکخانے جاکر پوسٹ کرنا ہی مناسب سمجھا۔ وہاں خط کا وزن ۲ ریٹ بتایا گیا اور اس حساب سے اس کی قیمت ایک پیسو اور کارڈ کے تیس سنتادو بتائے گئے۔ یوں بڑے ڈاکخانے جاکر انھیں یہ معلوم ہوا کہ ہوٹل والے ان سے عام معاوضے سے دوگنا معاوضہ طلب کررہے تھے۔

انشا کو ہانگ کانگ کے ہوٹلوں میں قیام وطعام کا موقع بھی ملا۔ جب انشا مہنگائی کے حوالے سے پاکستان اور ہانگ کانگ کے ہوٹلوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ پتا چلتا ہے کہ ان دونوں ملکوں کے کانٹی نینٹل ہوٹلوں میں ملازموں کی خدمات کے معاوضے اور اشیائے خوردونوش کی قیمتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ ہانگ کانگ کے ہلٹن نامی کانٹی نینٹل ہوٹل میں ناشتے کا احوال بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ وہاں ناشتے میں انڈے نہیں ہوتے بلکہ چائے کے ساتھ صرف چند ٹوسٹ دیئے جاتے ہیں۔ جن پر تھوڑا سا مکھن یا چیز لگا ہوتا ہے اور اگر بیرے نے آپ کو سلام کرلیا تو سمجھئے کہ ناشتے کا بل آٹھ روپے ہوگیا۔ یوں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان کی طرح ہانگ کانگ میں بھی ملازموں کی لگاوٹ اور اشیائے خوردنوش کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں اور اس حوالے سے ان دونوں ممالک کے کانٹی نینٹل ہوٹلوں میں اشتراک کی صورت موجود ہے۔

چین قیام کے دوران انشا کو وہاں کے ہوٹلوں کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہاں قیام کے دوران انھیں وہاں کے ایک اسلامی ہوٹل میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ جب وہ چین کے اس اسلامی ہوٹل کا تقابل پاکستان کے ہوٹلوں سے کرتے ہیں تو انھیں پتا چلتا ہے کہ ان دونوں ملکوں کے ہوٹلوں میں صفائی کی ناقص صورتحال بالکل ایک جیسی تھی۔ اس کے علاوہ انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ان دونوں ملکوں کے ہوٹلوں میں حلال گوشت عام دستیاب تھا۔ جبکہ مشرقِ وسطیٰ کے کئی اسلامی ممالک کے ہوٹلوں میں انھیں حلال گوشت کی عدم دستیابی جیسے مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بتاتے ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ کے کئی اسلامی ممالک میں بیرا آپ سے آکر پوچھتا ہے کہ جناب آپ کون سا گوشت کھائیں گے؟ بکرے کا یا گائے کا اور سؤر کا گوشت تو بہت ہی تازہ اور عمدہ ہے۔ یوں چین کے مسلم ہوٹل میں انھیں حلال گوشت عام دستیاب نظر آیا جس طرح پاکستان

کے ہوٹلوں میں عام دستیاب ہوتا ہے۔ یوں حلال گوشت کی عام دستیابی کے حوالے سے انھیں پاکستان اور چین کے ہوٹلوں میں تو اشتراک نظر آیا لیکن مشرقِ وسطیٰ کے کئی اسلامی ممالک میں اسی حوالے سے اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

انشا کو پاکستان اور چین کے ہوٹلوں میں اشتراک کی یہ صورت بھی نظر آئی کہ ان دونوں ممالک کے بعض ہوٹل لباس کے سلسلے میں تعصب برتتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ انھیں چین کے ساسون نامی ہوٹل جا کر ہوا۔ یہ ہوٹل ایک یہودی کی ملکیت تھا جو چینیوں کو اپنا دشمن سمجھتا تھا، اس نے اس ہوٹل میں چینیوں کے داخلے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ انشا بتاتے ہیں کہ کراچی کے کچھ ہوٹلوں میں بھی انگریزوں سے نفرت کے جذبے کا اظہار ملتا ہے۔ یہاں کے بعض ہوٹلوں میں بھی اب تک انگریزی لباس پہن کر آنے والوں کو داخلے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ یوں انشا کو پاکستان اور چین کے بعض ہوٹلوں میں یہ اشتراک نظر آیا کہ ان ہوٹلوں کی انتظامیہ اپنے دشمنوں سے سخت نفرت کرتی ہے اور اس نفرت کا اظہار ان کے لباس سے تعصب برت کر کرتی ہے۔

انشا نے مشرقِ بعید کے ممالک کے علاوہ افغانستان کے ہوٹلوں کا تقابل بھی پاکستانی ہوٹلوں سے کیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان اور افغانستان کے ہوٹلوں میں ماہِ رمضان کے احترام کے سلسلے میں بالکل ایک جیسا طرزِ عمل اختیار کیا جاتا ہے۔ وہ طرزِ عمل کیا ہے اسے وہ سفرنامہ *دنیا گول ہے* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ہم نے کابل کے ریستوانوں اور بھٹیار خانوں کو اسی طرح احترام کے پردے لٹکائے کاروبار کرتے دیکھا جیسا کراچی میں دیکھتے ہیں۔ ہم نے ایک آدھ بار روزہ رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہمارے ایک افغان دوست نے کہا کہ شوق سے رکھو۔ ہم منع نہیں کرتے۔ لیکن استاد یکھو کہ تم سفر میں ہو اور سفر میں روزے کی احتیاط رکھی جاتی ہے۔''[19]

یوں انشا کو رمضان کے احترام کے حوالے سے پاکستان اور افغانستان کے ہوٹلوں میں اشتراک کی یہ صورت نظر آئی کہ دونوں جگہ تمام پابندیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کھانے پینے کی اشیاء کھلے عام فروخت کی جاتی ہیں۔

سرائے، بھی مسافروں کے قیام وطعام کی جگہ ہے۔ انشا کو دورانِ سفر دنیا کے مختلف ممالک کے ہوٹلوں کے علاوہ وہاں کے سراؤں کو قریب سے دیکھنے اور وہاں قیام وطعام کا موقع بھی ملا جس سے انھیں ان سراؤں کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع در آیا۔ انھوں نے ان ممالک کی سراؤں کا تقابل پاکستان کی سراؤں سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو واضح کرنے کی کوشش بھی کی۔ جب وہ پاکستان، جاپان اور امریکہ کی سراؤں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں پاکستان اور جاپان کی سراؤں میں تو کافی حد تک اشتراک کا پہلو نظر آتا ہے لیکن امریکہ کی سراؤں میں اختلاف کا پہلو نظر آتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ہاں پہلے وقتوں میں مسافروں کے قیام وطعام کے لیے زیادہ تر سرائیں ہی ہوا کرتی تھیں، جن میں بہت سادہ طرز زندگی اپنایا جاتا تھا۔ سونے کے لیے مسافروں کو صرف ایک چارپائی فراہم کی

جاتی تھی اور کھانے میں صرف دال روٹی ہی دی جاتی تھی جس کی قیمت بہت ارزاں ہوتی تھی۔ مسافروں کی خدمت کے لیے بیروں اور خادموں کا انتظام تو نہ ہوتا صرف ایک بھٹیارن ہی ہوا کرتی جو مسافر کی خدمت داری میں کوئی کسر نہ چھوڑتی تھی لیکن اپنی خدمات کا معاوضہ کبھی طلب نہ کرتی تھی۔ پھر وہ بتاتے ہیں کہ جاپانی سرائے رائیگان میں بھی سادہ طرز زندگی ہی کو اپنایا جاتا ہے، ان سراؤں میں مسافروں کے بیٹھنے اور لیٹنے کے لیے صرف ایک چٹائی بچھی ہوتی ہے جس پر جوتا اتار کر بیٹھا جاتا ہے۔ تاہم انشاؔ کو پاکستانی اور جاپانی سراؤں میں یہ فرق نظر آیا کہ جاپانی سراؤں میں مشرقی طرز کی سجاوٹی اشیاء اور دیگر گھریلو سامان بھی ہوتا ہے جبکہ پاکستانی سراؤں میں ایسے تکلفات نہیں ہوتے۔ لیکن انھیں پاکستانی اور جاپانی سراؤں میں سادہ طرز زندگی کی جھلک ضرور نظر آئی۔ جبکہ امریکہ کی سراؤں کی بابت بتاتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ یہاں کی زبان میں سرائے Inn کو کہا جاتا ہے جس سے مراد امریکی نژاد ہوٹلوں کا ایک ایسا سلسلہ جو نہ صرف امریکہ میں بلکہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی موجود ہے۔ اس طرز کے ہوٹل پر تعیش طرز زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں جن میں رہائش، خدمات اور اشیائے خورد و نوش سب بہت مہنگی ہوتی ہیں۔

بہر حال انشاؔ کو پاکستانی اور جاپانی سراؤں یعنی رائیگان میں تو سادہ طرز زندگی کے حوالے سے اشتراک کا پہلو نظر آیا لیکن امریکی سراؤں میں پر تعیش طرز زندگی کے حوالے سے اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

تفریح کے مختلف ذرائع:

دن بھر کے کام کاج کے بعد انسان تفریح و مسرت کا خواہاں ہوتا ہے۔ انسان کی اسی ضرورت کے پیش نظر دل بہلانے کے بہت سے ذرائع وجود میں آئے جن میں مختلف قسم کے کھیل، ریڈیو، ٹیلی ویژن، تھیٹر، فلم، دیگر کھیل تماشے اور تفریحی مقامات شامل ہیں۔ انشاؔ نے دوران سیّاحت پاکستان اور مشرقِ بعید کے ممالک کے تفریحی ذرائع کا تقابل کیا اور ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو واضح کرنے کی کوشش بھی کی۔ ان اشتراکات اور اختلافات کو ذیل میں بیان کیا جارہا ہے۔

کھیل بھی تفریح کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ انسانی زندگی میں کھیل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ روزمرہ زندگی کی طویل اور تھکا دینے والی مشقت کے بعد انسان سکون اور اطمینان کا خواہاں ہوتا ہے تاکہ زندگی کی دوڑ میں دوبارہ شامل ہو سکے۔ انشاؔ کھیلوں کے حوالے سے جب پاکستان اور جاپان کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ پتا چلتا ہے کہ کئی کھیل ایسے ہیں جو پاکستان کے علاوہ مشرقِ بعید کے دیگر ممالک میں بھی کھیلے جاتے ہیں لیکن دونوں جگہ ان کے کھیلنے کے طریقہ کار میں کچھ فرق موجود ہے۔

پہیلی ایک ایسا کھیل ہے جو پاکستان کے علاوہ مشرقِ بعید کے دیگر ممالک میں بھی کھیلا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں

جگہ اس کھیل کے طریقہ کار میں کچھ اختلاف موجود ہے۔ انشا بتاتے ہیں کہ پاکستان میں پہیلیاں پوچھتے ہوئے چیز کی نوعیت کا تعیّن کرنا ضروری ہوتا ہے جبکہ انڈونیشیا میں ایسا نہیں کیا جاتا ہے۔ انشا کے نزدیک چیز کی نوعیت کا تعیّن کرنا ضروری ہوتا ہے کیوں کہ ایسا کرنے سے پہیلی بوجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی شخص صرف چند دنوں میں کسی ملک کے بارے میں مکمل معلومات اور آگاہی حاصل نہیں کرسکتا اس لیے پہیلی پوچھتے ہوئے چیز کی نوعیت کا تعیّن کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اپنے موقف کی حمایت میں وہ اپنے اور مادام سمترو کے درمیان پوچھی جانے والی پہیلیوں کو بطورِ مثال پیش کرتے ہیں۔ مثلاً مادام سمترو نے جب انشا سے پہلی پہیلی پوچھی تو انھوں نے فٹ سے جواب میں صدر سویکارنو کا نام لے لیا۔ ان کا یہ جواب تو درست ہو گیا لیکن بعد کی پہیلیوں میں وہ صرف اندازے ہی لگاتے رہے اور غلط پہ غلط جواب دیتے رہے۔ یوں انھوں نے ان پہیلیوں کے غلط جوابات سے یہ ثابت کیا کہ پاکستان میں اس کھیل کا طریقۂ کار آسان ہے کیونکہ اس میں چیز کی نوعیت کا تعیّن کیا جاتا ہے جبکہ انڈونیشیا میں پہیلیوں میں چیز کی نوعیت کا تعیّن نہیں کیا جاتا۔

کُشتی بھی ایسا کھیل ہے جو پاکستان کے علاوہ مشرقِ بعید کے دیگر ممالک میں بھی کھیلا جاتا ہے۔ البتہ اس کھیل کے طریقہ کار، پہلوانوں کی صحت اور پہلوانی کے معیار کے حوالے سے انشا کو پاکستان اور جاپان میں خاصا اختلاف نظر آیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ملک کے پہلوان بھی بہت خوراک کھاتے ہیں لیکن وہ خوراک کھانے کے ساتھ ساتھ ورزش بھی کرتے ہیں جس سے ان کا جسم فربہ نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں پہلوانی کا معیار یہ ہے کہ پہلوانوں کی چھاتی تو بہت چوڑی ہو لیکن ان کی کمر بالکل اندر کو دبی ہوئی ہو۔ بلکہ یوں کہیئے کہ چیتے جیسی کمر کو قابلِ رشک سمجھا جاتا ہے لیکن جاپان میں پہلوانی کا معیار کیا ہے اسے انشا نے بڑے مزاحیہ انداز میں سفرنامہ *ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے۔

> ''جاپانی پہلوان اپنا پورا بدن نکالتا ہے۔ خصوصاً پیٹ۔ جب تک وہ نیل کے ماٹ کی طرح لٹک کر تھل تھل نہ کرے، پہلوان کو کُشتی کے لائق نہیں سمجھا جاتا۔ آدمی کیا ہوتا ہے گوشت اور چربی کا پہاڑ ہوتا ہے۔''[۲۰]

انشا کو پاکستان اور جاپان میں جہاں پہلوانی کے معیار کے حوالے سے نمایاں فرق نظر آیا وہیں اس کھیل کے طریقۂ کار میں بھی نمایاں اختلاف نظر آیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ جاپان میں کھیلی جانے والی کُشتی میں مقابلے پر آنے والے دونوں پہلوان پیٹھ اٹھا کر آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو گھورتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ نمک اٹھا کر کچھ تو ایک دوسرے پر پھینکتے ہیں اور کچھ اپنے لنگوٹ پر مل لیتے ہیں اور ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہیں۔ یوں جب وہ اس کھیل کے حوالے سے پاکستان اور جاپان کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں ہی نظر آتی ہیں۔ اشتراک کی صورت تو انھیں صرف یہ نظر آئی کہ یہ کھیل ان دونوں ملکوں میں کھیلا جاتا ہے اور اختلاف کے پہلو انھیں اس کھیل کے طریقۂ کار اور پہلوانوں کی صحت کے حوالے سے نظر آئے۔

الغرض انشا کو پاکستان، انڈونیشیا اور جاپان میں کھیلوں کے حوالے سے اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

فلم، تھیٹر، ریڈیو اور ٹیلی ویژن:

فلم، تھیٹر، ریڈیو اور ٹیلی ویژن بھی تفریح کے اہم ذرائع ہیں۔ انشا نے مشرقِ بعید کی سیاحت کے دوران بھی پاکستان، مشرقِ بعید اور دیگر ممالک کے تفریحی ذرائع کا تقابل کیا اور ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو نمایاں کیا۔ وہ پاکستان ٹیلی ویژن پر پیش کیے جانے والے پروگراموں اور فلموں کا تقابل ٹوکیو (جاپان) ٹیلی ویژن پر پیش کیے جانے والے پروگراموں اور فلموں سے کرتے ہیں۔ وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ان دونوں ملکوں کے ٹیلی ویژن پر کچھ ایسے پروگرام اور انگریزی فلمیں پیش کی جاتی ہیں جن کے لیے صرف تصویر ہی کافی ہوتی ہے اور آواز کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر کراچی ٹیلی ویژن سے پیش کیے جانے والے قوالی کے پروگرام اور ٹوکیو ٹیلی ویژن پر جاپانی زبان میں پیش کیے جانے والے پروگرام سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں اس لیے ان کے لیے آواز کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ جاپان اور پاکستان ٹیلی ویژن پر دکھائی جانے والی انگریزی فلموں کو دیکھنے کے لیے بھی آواز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ بتاتے ہیں کہ جاپان میں دکھائی جانے والی انگریزی فلموں میں زیادہ تر یا تو کسی غیر انسانی مخلوق کو یا پھر کسی سمندری جانور کو موضوع بنایا جاتا ہے، جس پر کسی بم یا ہتھیار کا اثر نہیں ہوتا اور یہ جانور اس قدر طاقتور ہوتا ہے کہ ہر چیز کو تباہ کر ڈالتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس قسم کی فلمیں پاکستان میں بھی دکھائی جاتی ہیں جس کی ایک مثال ''گوڈزیلا'' نامی فلم ہے جس کے لیے آواز کی ضرورت نہیں ہوتی صرف تصویر ہی کافی ہوتی ہے۔ بہر حال انشا کو پاکستان اور جاپان ٹیلی ویژن پر دکھائی جانے والی فلموں اور پروگراموں میں یہ اشتراک نظر آیا کہ ان کے لیے صرف تصویر ہی کافی ہوتی ہے اور آواز کی اس سلسلے میں چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔

انشا کو پاکستان اور جاپان ٹیلی ویژن کے پروگراموں اور فلموں میں جہاں اشتراک کی ایک صورت نظر آئی وہیں فحاشی اور عریانی کے حوالے سے اختلاف کی ایک صورت بھی نظر آئی۔ وہ اختلاف یہ ہے کہ جاپان ٹیلی ویژن کے پروگرام فحاشی اور عریانیت پر مبنی ہوتے ہیں اور پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام اس برائی سے یکسر پاک ہوتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ جاپان ٹیلی ویژن پر 11:00 p.m جیسا حیا سوز پروگرام پیش کیا جاتا ہے جو صرف لہو ولعب اور کھیل تماشے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جبکہ پاکستان ٹیلی ویژن پر دنیا پاکستان جیسا صاف ستھرا اور معلوماتی پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔ یوں پاکستان اور جاپان ٹیلی ویژن کے پروگرام کے تقابل سے انھیں یہ معلوم ہوا کہ جاپان ٹیلی ویژن کے پروگرام فحاشی اور عریانیت پر مبنی ہوتے ہیں جبکہ پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام صاف ستھرے اور معلوماتی ہوتے ہیں۔

انشا نے کئی بار جاپان کا سفر اختیار کیا وہاں قیام کے دوران انھیں مشہور جاپانی تھیٹر کابوکی دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا۔ جب وہ کابوکی تھیٹر کا تقابل پاکستانی فلموں سے کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں میں کئی مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ پہلی مماثلت تو انھیں یہ نظر آتی ہے کہ یہ دونوں ہی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں اور انھیں دیکھنے کے بعد یا تو سر درد کی شکایت ہو جاتی ہے یا پھر لخلخے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ کابوکی تھیٹر میں فنی مہارت کی کمی کے حوالے سے وہ بتاتے ہیں کہ اس میں لمبے لمبے چوغوں والے چند بادشاہ اور کچھ شہزادیاں ادھر ادھر دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی گفتگو اور مکالموں کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے وہ فریاد کر رہے ہوں۔ موسیقی کا حال یہ تھا کہ چند بھدی آوازیں بغیر کسی سر اور تال کے رونے کا سا سماں پیش کر رہی تھیں۔ فنی مہارت میں کمی کی کچھ ایسی ہی صورتحال انھیں پاکستانی فلموں میں بھی دکھائی دیتی ہے اسی لیے انھیں جاپان کے کابوکی تھیٹر اور پاکستانی فلموں میں فنی مہارت کی کمی کے حوالے سے مکمل اشتراک نظر آتا ہے۔

انشا جاپانی تھیٹر کے ایک ڈرامے کا تقابل پاکستان ٹیلی ویژن کے ڈراموں سے کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں ملکوں کے ڈراموں میں اشتراک کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ یہ اشتراک زیادہ تر فنی مہارت میں کمی کے حوالے سے ہی تھا جس کا اندازہ انھیں جاپان کے ایک ہوٹل مڈسمر نائٹ میں ایک اسٹیج ڈرامہ دیکھ کر ہوا۔ اس ڈرامے میں بھی پاکستانی ڈراموں کی طرح ریہرسل نہیں کی گئی تھی۔ سیٹ کا یہ حال تھا کہ وہاں باقی سجاوٹی و آرائشی سامان تو در کنار ضروری اشیاء بھی موجود نہیں تھیں۔ یہاں تک کہ ایک سین کے لیے جب ہیرو کو دو عدد پیالوں کی ضرورت پڑی تو وہ سامعین کے سامنے پڑے ہوئے پیالے ہی اٹھا کر لے بھاگا۔ کہانی بھی دونوں ملکوں کے ڈراموں کی بالکل ایک جیسی تھی مثلاً پہلے مشکلات اور مصائب دکھائے جاتے ہیں پھر ظالم قوتوں کو شکست اور حق و سچائی کی جیت دکھائی جاتی ہے اور سب سے آخر میں ہیرو اور ہیروئن کا ملاپ دکھایا جاتا ہے۔ بہر حال انشا کو جاپانی تھیٹر اور پاکستان ٹیلی ویژن کے ڈراموں میں فنی مہارت کی کمی اور کہانی کے موضوع کے حوالے سے اشتراک کی کئی صورتیں نظر آئیں۔

فلم بھی تفریح کا ایک ذریعہ ہے۔ انشا نے مختلف ممالک کے سفر کے دوران جہاں ان ممالک کے اشیاء اور مظاہر کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا وہیں ان ممالک کی فلموں کو بھی لائق توجہ جانا۔ فلپائن قیام کے دوران انھوں نے وہاں کے ایک سینما گھر میں بائبل نامی ایک تاریخی فلم دیکھی جس کے بارے میں وہ بتاتے ہیں کہ اس میں دورِ قدیم کے چھ واقعات کو پردۂ اسکرین پر پیش کیا گیا تھا۔ وہ اس فلم کا تقابل اسی طرح کی ایک پاکستانی تاریخی فلم سے کرتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ انگریز اور مسلمان قدیم واقعات کی توجیہہ مختلف طریقے سے کرتے ہیں مثلاً بائبل نامی فلم میں حضرت آدمؑ والے قصے میں یہ دکھایا گیا تھا کہ اماں حوا کو سانپ یا کسی اور چیز نے نہیں بہکایا بلکہ انھوں نے خود ہی بہک کر سیب کھالیا۔ جبکہ ہمارے ہاں اول تو اماں حوا کی بہکنے کا سبب ہی کچھ اور بتایا جاتا ہے اور دوسرے ہمارے ہاں سیب کی بجائے گندم کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ کے قصے کو دیکھ کر یہ پتا چلتا ہے کہ عیسائی حضرت اسحاقؑ کو ذبیح اللہ سمجھتے ہیں اور مسلمان حضرت اسماعیلؑ کو ذبیح

اللہ سمجھتے ہیں۔ جہاں تک بات رہی اداکاری کی تو اس حوالے سے بھی انشا کو ان دونوں فلموں میں کافی حد تک اشتراک کا پہلو نظر آیا۔ خاص طور پر اس فلم میں ہابیل اور قابیل کا کردار نبھانے والے اداکاروں کی اداکاری انھیں پاکستانی اداکاروں جیسی ہی لگی۔ اسی طرح حضرت نوح کا کردار ادا کرنے والے اداکار جان ہٹن کی اداکاری میں انھیں پاکستانی اداکار مخدوم مطلبی فرید آبادی کی اداکاری کی جھلک نظر آئی۔ بہرحال انشا کو ہابیل نامی فلم اور اسی طرز کی پاکستانی تاریخی فلم میں فن کاروں کی اداکاری میں فنی مہارت کی کمی کے حوالے سے تو اشتراک نظر آیا لیکن قدیم واقعات کی توجیہہ کے حوالے سے اختلاف کا پہلو بھی نظر آیا۔

فلموں کے ذکر میں انشا ایکشن فلموں کا ذکر کرنا بھی نہیں بھولتے۔ وہ پاکستانی اور امریکی ایکشن فلموں کا تقابل کرتے ہیں تو اس تقابل میں انھیں اشتراک کی صورت ہی نظر آتی ہے۔ کیوں کہ ان دونوں فلموں میں انھیں مار دھاڑ، قتل و خون اور غارت گری، اداکاروں کی اوورا یکٹنگ اور جذبہ حب الوطنی کا اظہار ایک جیسا ہی نظر آیا۔ اس کے علاوہ دونوں ممالک کی فلمیں حقیقت سے بھی بہت دور نظر آئیں۔ انشا پاکستانی اور امریکی فلموں میں موجود اشتراک اور اس سلسلے میں پاکستانی فلموں کی برتری کو سفر نامہ نگری نگری پھرا مسافر کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں:

''اس امریکی فلم میں جان وین ایک آنکھ پر پٹی باندھے بہادری کے جوہر دکھاتا ہے کئی کئی گھڑ سواروں کو ڈھیر کر دیتا ہے تا کہ کیتھرائن ہپ برن پر سوائے اس کے کوئی بری نظر نہ ڈال سکے اور اس کی آبرو کی مناسب حفاظت ہوتی رہے۔ لیکن ہمارے ہاں کے ہیرو تو دونوں آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس سے زیادہ اچھا نشانہ لگا لیتے ہیں۔ بلکہ سنا ہے ایک فلم اندھا قاتل میں تو ہمارے شیر بدر منیر نے اندھا بن کر اتنا خون خرابہ کیا ہے کہ دونوں آنکھیں کھول کر بھی نہیں کیا ہوگا۔''[۱۲]

انشا کو پاکستان اور امریکہ کی ایکشن فلموں میں جہاں اشتراک کی کئی صورتیں نظر آئیں وہیں ان میں اختلاف کا ایک پہلو بھی نظر آیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ امریکی اداکار تو دھیمی آواز میں اپنے مکالمے ادا کرتے ہیں لیکن پاکستانی اداکار گلا پھاڑ پھاڑ کر بولتے ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ پاکستانی اداکار بولتے نہیں بلکہ چیختے ہیں۔ اس کے بعد وہ عریانیت اور فحاشی کے حوالے سے پاکستان، امریکی اور ایران کی ایکشن فلموں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں پاکستانی اور امریکی ایکشن فلموں میں تو فحاشی اور عریانیت کا مظاہرہ دکھائی دیتا ہے لیکن ایران کی ایکشن فلمیں اس برائی سے یکسر پاک دکھائی دیتی ہیں۔ یوں انشا کو پاکستان اور امریکی ایکشن فلموں میں ماسوائے آواز کے باقی ہر حوالے سے اشتراک کا پہلو نظر آیا لیکن پاکستانی اور ایرانی فلموں میں فحاشی اور عریانی کے حوالے سے اختلاف کا پہلو بھی نظر آتا ہے۔

دنیا کے مختلف ممالک میں تفریح کے نت نئے ذرائع موجود ہیں۔ کئی ممالک ایسے ہیں جہاں خواتین اور مرد حضرات کو بھی تفریح کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ انشا جب تفریح کے اس ذریعے کے حوالے سے ہانگ کانگ اور

پاکستان کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ممالک میں اس قسم کی تفریح عام ہے۔ البتہ جب وہ معاوضوں کے حوالے سے وہ ان دونوں ملکوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس سلسلے میں کچھ اختلاف نظر آتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہانگ کانگ میں خواتین کا معاوضہ ۳۳ ڈالر فی گھنٹہ ہے اور مردوں کا معاوضہ ۲۲ ڈالر فی گھنٹہ یعنی ہانگ کانگ میں خواتین مردوں کی نسبت زیادہ مہنگی ہیں۔ جب وہ ہانگ کانگ کے مردوں کی قیمت کا تقابل پاکستانی مردوں سے کرتے ہیں تو انھیں یہ پتا چلتا ہے کہ پاکستان میں مردوں کا معاوضہ ہانگ کانگ سے بھی کم ہے وہ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے ملک کے مرد تو ٹکوں کے مول بکتے ہیں بلکہ کچھ تو ایسے بھی ہیں جو کچھ لینے کی بجائے الٹا خرچ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ بہر حال انشا کو تفریح کے اس ذریعے کے حوالے سے پاکستان اور ہانگ کانگ میں اشتراک نظر آیا لیکن دونوں ملکوں میں مردوں کے معاوضے کے حوالے سے اختلاف کا پہلو بھی نظر آیا۔

انشا نے دوران سیاحت جہاں تفریح کے مختلف ذرائع میں اپنی خاص دلچسپی کا اظہار کیا وہیں تفریحی مقامات کو بھی اپنی خاص توجہ کا مرکز بنایا۔ انھوں نے مختلف ممالک کے تفریحی مقامات کا تقابل پاکستان کے تفریحی مقامات سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کی۔ وہ کولمبو (سری لنکا) کے دہی والا یا دیہی ویلا چڑیا گھر کا تقابل بھارت کے گاندھی گارڈن، لاہور کے لارنس گارڈن اور لندن کے ریجنٹ گارڈن سے کرتے ہیں۔ وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ دیہی والا یا دہی ویلا چڑیا گھر اپنی نوعیت کے اعتبار سے باقی تمام تفریحی مقامات سے مختلف ہے کیونکہ یہ نہ تو مکمل طور پر ایک پارک کا نقشہ پیش کرتا ہے اور نہ ہی ایک چڑیا گھر کی طرح نظر آتا ہے بلکہ اسے ان دونوں کے درمیان کی چیز کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس چڑیا گھر میں جانور تو تقریباً وہی تھے جو ہر چڑیا گھر میں موجود ہوتے ہیں البتہ پرندوں کی کچھ اقسام ضرور نئی تھیں۔ اس چڑیا گھر کی خصوصیت ہاتھیوں کا ایک مخصوص رقص تھا جس میں چھوٹے بڑے سب ہاتھی مل کر بڑی مہارت سے رقص کرتے ہیں۔ انشا اس رقص کا تقابل جب پاکستانی فلموں میں پیش کیے جانے والے رقص سے کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں ہی نظر آتی ہیں۔ اشتراکات کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ دیہی ویلا چڑیا گھر میں اگر ہاتھی رقص کرتے ہیں تو ہماری فلموں میں رقص کرنے والے ہیرو اور ہیروئن بھی جسامت کے اعتبار سے کسی ہاتھی سے کم نہیں ہوتے۔ البتہ دیہی ویلا چڑیا گھر میں رقص کرنے والے ہاتھیوں کے رقص میں تو سر اور تال کا کوئی میل نظر آتا ہے جبکہ ہماری فلموں کے ہیرو اور ہیروئن کا رقص سوائے بے ہنگم اچھل کود کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔

المختصر انشا کو تفریح کے مختلف ذرائع کے حوالے سے پاکستان، مشرقِ بعید کے ممالک، یورپی ممالک اور کئی دیگر ممالک میں اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں ہی نظر آئیں۔

ذرائع آمدورفت

سفر انسانی زندگی کا حصہ ہے۔ ہر دور کا انسان سفر کے لیے مختلف ذرائع آمدورفت کو کام میں لاتا رہا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ ان ذرائع آمدورفت میں ترقی اور تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ انشا نے مختلف ممالک کے سفر کے دوران جن ذرائع آمدورفت کو استعمال کیا ان کا تقابل پاکستان کے ذرائع آمدورفت سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ انشا نے مشرقِ بعید کے سفر کے دوران جس قسم کے ذرائع آمدو رفت استعمال کیے ان کی ذیل میں یوں درجہ بندی کی گئی ہے۔

۱۔ اندرونِ شہر استعمال ہونے والے ذرائع نقل وحمل

۲۔ ریلوے

۳۔ ہوائی سفر

۱۔ اندرونِ شہر استعمال ہونے والے ذرائع نقل وحمل:

انشا نے مشرق بعید کے سفر کے دوران بھی اندرون شہر استعمال ہونے والے کئی ذرائع آمدورفت سے سفر کیا اور ان کا تقابل پاکستان کے اندرون شہر استعمال ہونے والے ذرائع نقل وحمل سے کیا اور ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو واضح کرنے کی کوشش بھی کی۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

رکشا، اندرون شہر استعمال ہونے والی سواری ہے۔ یہ وہ سواری ہے جو پاکستان کے علاوہ مشرق بعید کے ممالک میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔ انشا جب انڈونیشیا گئے تو وہاں انھیں رکشے سے ملتی جلتی ایک سواری نظر آئی جس کا نام پوچھنے پر انھیں بیچا بتایا گیا۔ جب وہ انڈونیشی بیچا کا تقابل اپنے ہاں کے رکشا سے کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں سواریوں کی ساخت میں اشتراک اور انھیں چلانے والے ڈرائیور حضرات کی فنی مہارت میں کچھ اختلاف نظر آیا جسے انھوں نے سفر نامہ *دنیا گول ہے* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

> ''سائیکل رکشا کو یہاں بیچا کہتے ہیں۔ بیچا ہمارے ہاں بچوں کو ڈرانے کی چیز ہوتی ہے۔ لیکن ڈرنے کی اصل چیز انڈونیشی بیچا ہے۔ ہمارے ہاں رکشا کھنچا جاتا ہے وہاں دھکیلا جاتا ہے۔ جیسے کراچی کی سڑکوں پر آئس کریم یا چائے کے ڈبے بیچنے والے کرتے ہیں۔ گاڑی آگے اور گھوڑا پیچھے کی مثال سمجھ لیجیے۔ فائدہ اس میں یہ ہے کہ ٹکر اگر لگتی ہے تو مسافر کو لگتی ہے، ڈرائیور تو مزے میں پیچھے ہوتا ہے۔ یہ اختیار بھی ڈرائیور کو حاصل ہے کہ بیچا دوڑاتے ہوئے یک لخت بریک لگالے اور مسافر اپنے حال میں بیٹھا ہوا اچھل کر بیچ سڑک کے جا گرے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں کے رکشا والے بھی مشاق

ہیں۔ مسافر کو سامنے کی سواری سے ٹکرانے یا چاروں شانے چت زمین پر گرانے کا ہنر جانتے ہیں لیکن کہیں ہمارے ہاں بھی ایسے بیچا چلنے لگیں تو ان کا کام اور آسان ہو جائے۔'' ۲۲

اس کے بعد انشا پاکستان اور انڈونیشیا کے اندرونِ شہر استعمال ہونے والے ذرائع آمدورفت کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ انڈونیشیا میں بھی کراچی شہر کی طرح کاریں اور ٹرک استعمال کیے جاتے ہیں۔ البتہ ان کی تعداد کراچی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے جو کئی بار بڑے بڑے ٹریفک جام کا باعث بھی بن جاتی ہے ایسے ٹریفک جام کی مثال پاکستان میں ملنا بھی محال ہے۔ یوں انشا کو پاکستان اور انڈونیشیا کے اندرونِ شہر استعمال ہونے والے ذرائع نقل و حمل کی نوعیت میں تو اشتراک نظر آیا البتہ ان کی تعداد اور ٹریفک جام کی نوعیت کے حوالے سے اختلاف کا پہلو بھی نظر آیا۔

اس کے بعد انشا فلپائن میں اندرونِ شہر استعمال ہونے والے ذرائع آمدورفت کا تقابل پاکستان کے اسی قسم کے ذرائع آمدورفت سے بھی کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ وہاں استعمال ہونے والے ذرائع آمدورفت میں ٹانگے، سائیکل، رکشا، بسیں اور جیپنی شامل ہیں۔ جب وہ فلپائن میں چلنے والے تانگے کا مشاہدہ کرتے ہیں تو انھیں اس میں پاکستانی ٹانگے اور رکشا کی کچھ جھلک نظر آتی ہے۔ وہ یوں کہ اس کے اگلے حصے میں گھوڑا جوتا ہوتا ہے اور پچھلا حصہ بالکل رکشے کی طرح کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ فلپائن کی سب سے مشہور اور مقبول سواری جیپنی کا جائزہ لیتے ہیں جس میں انھیں پاکستانی رکشا اور جیپ کی کچھ جھلک نظر آتی ہے۔ وہ فلپائن کی اس ہر دلعزیز سواری کی ساخت کے بارے میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کا اگلا حصہ اور انجن تو بالکل جیپ کی طرح کا ہوتا ہے لیکن پچھلے حصے میں چار سیٹیں ایک طرف کو اور چار سیٹیں دوسری طرف کو ہوتی ہیں۔ یوں انشا کو فلپائن کی ہر دلعزیز سواری جیپنی اور پاکستانی رکشا اور جیپ کی ساخت میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آتے ہیں۔

ذرائع آمدورفت کے بعد انشا ڈرائیونگ کے طریقۂ کار کے حوالے سے بھی پاکستان اور دنیا کے باقی ممالک کا تقابل کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان اور ہالینڈ دونوں ایسے ممالک ہیں جو انگریزوں کے زیرِ تسلط رہے اور ایسے ممالک جو انگریزوں کے زیرِ تسلط رہے ہوں وہاں گاڑیاں دائیں ہاتھ رکھی جاتی ہے۔ اور جو ممالک ہسپانوی اثرات کے زیر اثر رہے ہوں وہاں گاڑیاں بائیں طرف رکھی جاتی ہیں مثلاً فلپائن اور افغانستان وغیرہ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جن ممالک میں گاڑیاں دائیں ہاتھ رکھی جاتی ہیں وہاں بائیں ہاتھ رکھنے والوں کے مقابلے میں حادثات زیادہ ہوتے ہیں۔

بہر حال انشا کو پاکستان اور مشرقِ بعید کے بعض ممالک کے اندرونِ شہر استعمال ہونے والے ذرائع آمدرفت میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو نظر آئے۔ اس کے علاوہ ڈرائیونگ کے طریقۂ کار میں انھیں پاکستان اور ہالینڈ میں تو اشتراک کی صورت نظر آئی البتہ دنیا کے باقی ممالک میں اس حوالے سے اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

۲۔ ریلوے:

ریل کا شمار بھی آمدورفت کے اہم ذرائع میں ہوتا ہے۔آج دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جہاں سفر کرنے کے لئے ریل کی سہولت موجود نہ ہو۔انشا نے مشرقِ بعید کے ممالک کے ریلوے نظام کا تقابل پاکستان کے ریلوے نظام سے کئی حوالوں سے بھی کیا اوران کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کومن وعن بیان کرنے کی کوشش کی جنھیں ذیل میں بیان کیا جارہا ہے۔

انشا کو سری لنکا قیام کے دوران وہاں کے ریلوے نظام کا قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔جب انھوں نے پاکستان اورسری لنکا کے ریلوے نظام کا تقابل کیا تو انھیں عملے کی تعیناتی کے حوالے سے ان دونوں ملکوں کے ریلوے نظام میں اشتراک کی صورت نظر آئی۔وہ بتاتے ہیں ان کہ دونوں ملکوں کے بڑے ریلوے سٹیشنوں پر تو زیادہ عملہ تعینات ہوتا ہے لیکن پسماندہ شہروں اور دیہی علاقوں کے ریلوے اسٹیشنوں پر بہت کم عملہ تعینات کیا جاتا ہے۔بلکہ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی افسر کو کئی کئی کام بیک وقت سرانجام دینے پڑتے ہیں جس سے ایک عجیب وغریب صورتحال سامنے آتی ہے۔انشا کو پاکستان کے پسماندہ شہروں اور دیہاتی علاقوں کی طرح سری لنکا کے نانو نہ جنکشن میں بھی عملے کی کمی کے باعث اشتراک کی جو صورتحال نظر آئی اسے انھوں نے سفرنامہ *ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

> ''نانو نہ ایک چھوٹا سا جنکشن تھا جہاں سے کولمبو کی گاڑی ہمیں ملی۔۔۔یہ بھی پاکستان کے ایک دیہاتی اسٹیشن کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ایک ہی بابو جانے والے مسافروں کوٹکٹ دینے کے بعد گیٹ پر آ کھڑا ہوتا اور آنے والوں کے ٹکٹ وصول کرتا۔''۲۳

عملے کی کمی کے علاوہ انشا کو پاکستان اور سری لنکا کی ریلوے میں اشتراک کی یہ صورت بھی نظر آئی کہ دونوں ملکوں میں بڑے اسٹیشنوں سے ذرا پہلے کوئی چھوٹا اسٹیشن بھی ہوتا ہے۔مثال کے طور پر سری لنکا میں کینڈی سے ذرا پہلے پیری ڈینیا کا اسٹیشن آتا ہے اور پاکستان میں کراچی سے ذرا پہلے لانڈھی یا ملیر کا اسٹیشن آتا ہے۔یوں انھیں پاکستان اورسری لنکا کے ریلوے اسٹیشنوں میں یہ اشتراک نظر آیا کہ ان میں بڑے اسٹیشنوں سے پہلے چھوٹے اسٹیشن بھی آتے ہیں۔

انشا کو پاکستان اورسری لنکا کے ریلوے نظام میں جہاں اشتراک کی دوصورتیں نظر آئیں وہیں ان دونوں ملکوں کے مسافروں کے طرزِ عمل میں اختلاف کا پہلو بھی نظر آیا۔وہ بتاتے ہیں کہ سری لنکا کے مسافر غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل سے اجتناب کرتے ہیں اور دیگر سہولیات کی طرح زنجیر کا استعمال بھی صرف بوقت ضرورت ہی کرتے ہیں،اگر کوئی شخص جان بوجھ کر اسے کھینچے تو اسے بیس روپے جرمانہ بھی کیا جاتا ہے۔جبکہ پاکستان میں مسافر انتہائی غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بار بار کھینچتے ہیں۔دراصل ہمارے ہاں کے لوگ واقعی غیر تعلیم یافتہ ہیں اور سہولیات کے استعمال سے واقف نہیں ہیں۔وہ بڑے مزاحیہ انداز میں کہتے ہیں کہ شاید ہمارے ہاں لوگوں کو تفریح کا کوئی اور ذریعہ دستیاب نہیں ہے

اسی لیے ہمارے ملک کے لوگ بار بار زنجیر کھینچ کر اپنا دل بہلاتے رہتے ہیں۔ پاکستان ریلوے نے گو کے بلاضرورت زنجیر کھینچنے کا جرمانہ پچاس روپے مقرر کر رکھا ہے لیکن پھر بھی پچاس روپے میں لوگوں کے لیے یہ تفریح کچھ زیادہ مہنگی نہیں ہے۔

چین قیام کے دوران انشا نے وہاں کے ریلوے نظام کا مشاہدہ بھی کیا اور اس کا تقابل پاکستان ریلوے سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو واضح کیا۔ جب وہ چینی اور پاکستانی ریلوے اسٹیشن پر تعینات عملے کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں دونوں جانب مکمل اختلاف نظر آتا ہے۔ پاکستان ریلوے کے عملے کے بارے میں وہ بتاتے ہیں کہ ان میں سے اکثر لوگ تو اپنی جگہ موجود ہی نہیں ہوتے بلکہ چائے پینے یا پھر مالش وغیرہ کروانے گئے ہوتے ہیں۔ جبکہ چینی ریلوے میں انسانی عملے کی بجائے سارا کام خودکار مشینوں سے لیا جاتا ہے اس لیے وہاں ہر کام بڑے نظم وضبط سے انجام پاتا ہے۔ وہ اس خودکار نظام کی بابت بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہاں معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک کھڑکی ہوتی ہے لیکن اس کھڑکی پر کسی قسم کا انسانی عملہ تعینات نہیں ہوتا بلکہ جوں ہی کوئی شخص اس کھڑکی پر آکر کھڑا ہوتا ہے تو اندر سے ایک خوب صورت آواز آئے گی اور آپ سے چینی زبان میں کہے گی ''جناب فرمائیے''۔ تاہم انشا سمیت کئی پاکستانی جواب میں صرف نی ہاؤ، نی ہاؤ ہی کرتے رہے یعنی بار بار مزاج ہی پوچھتے رہے۔

بہر حال انشا کو پاکستان اور چین کے ریلوے نظام میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

۳۔ ہوائی سفر:

ہوائی سفر کا شمار دورِ جدید کے برق رفتار ذرائع آمدورفت میں ہوتا ہے۔ انشا نے مشرقِ بعید کے ممالک کے سفر کے دوران آمدورفت کے اسی ذریعے کو زیادہ استعمال کیا۔ انھوں نے دورانِ سفر مختلف ممالک کے جہازوں، تعینات عملے، حفاظتی اقدامات اور دیگر معاملات کا بغور مشاہدہ کیا اور ان کا تقابل پاکستانی ہوائی کمپنی اور اس کے متعلقہ امور سے کر کے ان میں موجود اشتراکات اور اختلافات کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو بیان کیا جا رہا ہے۔

دنیا کی تقریباً تمام ہوائی کمپنیاں مسافروں کی پڑتال کے لیے کوئی نہ کوئی لائحہ عمل ضرور اپناتی ہیں۔ انشا جب چیکنگ کے حوالے سے پاکستان اور مشرقِ بعید کے ممالک کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہانگ کانگ امیگریشن والے مسافروں کی پڑتال میں سب سے زیادہ احتیاط پسندی سے کام لیتے ہیں۔ انشا ہانگ کانگ امیگریشن والوں کا تقابل بنگلہ دیش، کراچی، بنکاک اور ٹوکیو امیگریشن والوں سے کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یوں تو ان ممالک کی امیگریشن والے بھی مسافروں کی پڑتال میں بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں، پہلے وہ ان کو ایک مقناطیسی دروازے سے گزارتے ہیں پھر ایک مقناطیسی مشین ان کے کپڑوں پر پھیری جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک آدمی کپڑوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یہ اندازہ بھی کر لیتا ہے کہ کہیں ان کے پاس کوئی چاقو یا چھری تو نہیں لیکن وہ آپ کی جیب سے قلم اور پیسے نہیں نکلواتے۔ جبکہ ہانگ

کانگ امیگریشن والے تو قلم اور پیسوں کو بھی ہتھیار سمجھتے ہیں اور سب سے پہلے انھیں نکلوا کر پلاسٹک کے ایک لفافے میں بند کر کے رکھ دیتے ہیں اور پھر کسی شخص کو مقناطیسی دروازے سے گزارتے ہیں۔ یوں انشا کو پاکستان، بنکاک، بنگلہ دیش اور ٹوکیو امیگریشن میں یہ اشتراک نظر آیا کہ ان میں مسافروں کی چیکنگ میں زیادہ سختی سے کام نہیں لیا جاتا البتہ ہانگ کانگ امیگریشن والے چیکنگ میں بہت احتیاط پسندی سے کام لیتے ہیں۔

انشا کو جاپان کے سفر کے دوران جاپانی امیگریشن کے عملے کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ جاپانی امیگریشن کے عملے کا تقابل پاکستانی امیگریشن کے عملے سے کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ کراچی امیگریشن کا عملہ اپنے فرائض سے غفلت برتتا ہے جبکہ ٹوکیو امیگریشن کا عملہ اپنے فرائض بخوبی سرانجام دیتا ہے اور اس سلسلے میں کسی قسم کی رعایت نہیں برتتا۔ انشا کراچی امیگریشن کے عملے کی کارکردگی کو وہ ایک دلچسپ صورتحال سے واضح کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ سری لنکا سے رخصت ہوتے ہوئے وہاں کے ایک پبلشر، مسٹر مسبتین نے مجھے ٹاٹ میں لپٹی کسی پودے کی چند ٹہنیاں دیں اور تاکید کی کہ انھیں ڈاکٹر اختر حسین تک پہنچا دوں۔ میں نے انھیں بتایا کہ کراچی امیگریشن میں ہونے والی چیکنگ کے باعث شاید ایسا ممکن نہ ہو سکے۔ لیکن مسٹر مسبتین نے مجھ سے کہا کہ وہ تمھیں روکیں گے نہیں زیادہ سے زیادہ ان پودوں کو جراثیم سے پاک کرنے کی کوشش کریں گے۔ جب میں کراچی ایئر پورٹ پہنچا تو کسٹم والوں نے میرے ہاتھ میں ٹہنیاں دیکھ کر مجھے محکمہ زراعت کے پاس بھیج دیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو پتا چلا کہ وہاں پر تعینات افسر اپنے فرائض کو پس پشت ڈال کر کوئی بہت ضروری کام کرنے باہر گیا ہوا ہے مثلاً چائے پینے یا مالش کرانے۔ یوں انشا چیکنگ کے مراحل سے گزرے بغیر ہی بآسانی ڈاکٹر اختر حسین کے گھر پہنچ گئے۔

اس کے بعد انشا ٹوکیو امیگریشن والوں کے سخت رویے کی وضاحت ایک اور صورتحال سے کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک بار ٹوکیو جانے والا پی آئی اے کا جہاز بالکل خالی تھا۔ چنانچہ حکام نے جہاز کا توازن برقرار رکھنے کے لیے اس میں اینٹیں رکھ دیں لیکن جب جہاز ٹوکیو سے واپس آنے لگا تو پی آئی اے والوں کو کارگو لے جانے کے لیے بھاری معاوضے کی پیش کش کی گئی۔ جہاز میں چونکہ پہلے سے اینٹیں موجود تھیں اس لیے اس میں مزید وزن نہیں لے جایا سکتا تھا۔ لہٰذا پی آئی اے حکام نے جاپان امیگریشن والوں سے درخواست کی کہ انھیں جاپان میں اینٹیں پھینکنے کی اجازت دے دی جائے لیکن جاپانی امیگریشن نے جواب میں صاف انکار کر دیا۔ ٹوکیو امیگریشن اور کراچی امیگریشن والوں کی کارگزاری دیکھنے کے بعد انشا یہ سوچتے ہیں کہ کراچی ایئر پورٹ پر بھی تو پلانٹ پروڈکشن کا ایک آدمی موجود ہوتا ہے جس کے فرائض بھی کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں لیکن جب بھی جائیں تو پتا چلتا ہے کہ حسب روایت وہ کہیں چائے پینے گیا ہوتا ہے یا مالش کروانے۔ وہ طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ایسے افراد نے چائے پینی ہی ہے تو محکمے کو چاہیے کہ انھیں ایک کیتلی فراہم کر دیں تاکہ وہ چائے تو بے شک پئیں لیکن اپنی سیٹ پر کم از کم ضرور موجود رہیں۔ یوں انشا کو کراچی اور ٹوکیو امیگریشن والوں کے طرز عمل میں فرض شناسی کے

حوالے سے خاصا اختلاف نظر آیا۔

اس کے بعد آنشا پاکستان اور روسی امیگریشن والوں کے طرزِ عمل کا تقابل کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یہ لوگ ہماری طرح بہت نرم خو ہیں اور چیکنگ میں بالکل ویسا ہی طرزِ عمل اپناتے ہیں جیسا ہمارے ہاں کا رواج ہے۔ یوں آنشا کو پاکستانی اور روسی امیگریشن کے عملے کے طرزِ عمل میں چیکنگ میں نرمی برتنے کے حوالے سے اشتراک کی ایک صورت نظر آئی۔

کسی فضائی کمپنی میں بہتر سہولیات کی فراہمی ہی اسے ایک کامیاب اور منافع بخش فضائی کمپنی بناتی ہیں۔ آنشا جب سہولیات کی فراہمی کے حوالے سے پاکستانی ہوائی کمپنی PIA اور جاپانی ہوائی کمپنی SAS کا تقابل کرتے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ پاکستانی ہوائی کمپنی پی آئی اے اپنے مسافروں کو جاپانی ہوائی کمپنی SAS کی نسبت زیادہ سہولیات فراہم کرتی ہے۔ مثال کے طور پر جاپانی ہوائی کمپنی SAS رات سونے کے لیے اپنے مسافروں کو صرف پاجامہ اور سلیپنگ سوٹ دیتی ہے جبکہ PIA اپنے مسافروں کو رات سونے کے لیے بہت نرم اور خوبصورت کمبل فراہم کرتی ہے جن میں انھیں ایسی پُرسکون نیند آتی ہے کہ منزل پر پہنچ کر بھی وہ کمبل چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے۔ یوں آنشا کو سہولیات کی فراہمی کے حوالے سے پاکستان کی فضائی کمپنی PIA اور جاپانی کمپنی SAS میں اختلاف نظر آیا اور اس اختلاف میں انھیں پاکستانی فضائی کمپنی PIA جاپانی کمپنی SAS سے زیادہ بہتر نظر آئی۔

اس کے بعد آنشا پاکستان اور فلپائن کے مسافروں کے طرزِ عمل کا تقابل کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ فلپائن ایک اسلامی ملک نہیں ہے لیکن پھر بھی وہاں کے مسلمان جذبہء اسلامی کے تحت اپنے ملک کی ہوائی کمپنیوں، پان امریکن اور لفتانزا میں سفر کرنے کی بجائے پاکستان کی ہوائی کمپنی PIA میں سفر کرتے ہیں حالانکہ PIA کے کرائے فلپائن کی ہوائی کمپنیوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ جب انھوں نے فلپائنی مسافروں سے اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ وہ صرف مسلمان ہونے کے ناطے پاکستان سے اسلامی تعلق کی بنا پر PIA میں سفر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ جب انھوں نے اس سلسلے میں پاکستانی مسلمانوں کے طرزِ عمل کا جائزہ لیا تو انھیں یہ جان کر بے حد شرمندگی ہوئی کہ وہ خود اور ان جیسے کئی دوسرے پاکستانی مسافر صرف اپنے ذاتی فائدے اور آسائش کے لیے اپنے ملک کی ائیر لائن کو چھوڑ کر فلپائنی کمپنیوں، لفتانزا اور پان امریکن میں سفر کرتے ہیں۔ یوں آنشا کو پاکستان اور فلپائن کے مسلمان مسافروں میں جذبۂ اسلامی کے حوالے سے خاصا اختلاف نظر آیا۔

علاج معالجہ:

صحت مند زندگی قدرت کا ایک انمول تحفہ ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ زندگی سدا یونہی رواں دواں نہیں رہتی بلکہ کبھی کبھار اس میں ناسازئ طبع کے باعث رکاوٹ بھی آجاتی ہے یوں زندگی میں علاج معالجے کی اہمیت

سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انشا نے دورانِ سفر اس بات کا مشاہدہ بھی کیا کہ دنیا کے مختلف ممالک میں ڈاکٹروں کا طریقۂ علاج ایک جیسا نہیں ہے بلکہ اس میں کافی اختلاف موجود ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان اور جاپان میں ڈاکٹر حضرات تھرمامیٹر کا استعمال کرتے ہیں۔ پاکستانی ڈاکٹر منہ میں تھرمامیٹر لگاتے ہیں اور جاپانی ڈاکٹر بغل میں۔ اس کے علاوہ جاپان میں ڈاکٹر حضرات مرض کی تشخیص کے لیے مختلف ٹیسٹ تجویز کرتے ہیں اور ان ٹیسٹوں کے نتائج آنے کے بعد ہی کسی مرض کی تشخیص کرتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں کے حکیم صاحبان مرض کی تشخیص میں صرف اپنے اندازے سے کام لیتے ہیں۔ انشا پاکستانی حکیموں کے طریقۂ تشخیص کو سفر نامہ نگری نگری پھرا مسافر کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں:

''ہائے ہمارے ہاں کے حکیم۔ کسی کی چارپائی کے نیچے خربوزے کے چھلکے دیکھ کر حکم لگا دیتے تھے کہ مریض نے خربوزہ کھایا ہے۔ ان کے ایک شاگرد نے البتہ اسی اصول پر ایک مریض کے پلنگ کے نیچے جوتوں کا جوڑا دیکھ کر یہ تشخیص کی کہ مریض نے جوتے کھائے ہیں۔ تو خود جوتے کھائے۔ یہ لوگ قارورہ دیکھ کر پوری کیفیت بھانپ لیتے تھے۔ ایک روز کوئی شخص کسی مرض کی شکایت لے کر آیا اور مریضوں کی قطار میں بیٹھ گیا۔ اتفاق سے اس کے ہاتھ میں اورنج جوس کی بوتل تھی جسے وہ گھر لے جا رہا تھا۔ حکیم صاحب نے اسی کو دیکھ کر بتا دیا کہ تمھارے پیشاب میں اور جسم میں صفرا کی زیادتی ہے اور خلطیں خلط ملط ہو گئی ہیں۔''۲۴

طریقۂ علاج کے بعد انشا مختلف بیماریوں، ان کے علاج اور ادویات کی دستیابی کے حوالے سے جاپان اور پاکستان کا تقابل کرتے ہیں۔ وہ بڑے فخریہ انداز میں بتاتے ہیں کہ جاپان ایک ترقی یافتہ ملک ہونے کی وجہ سے زندگی کے کئی شعبوں میں ہم سے آگے ہو گا لیکن بیماریوں، ان کے علاج اور ادویات کی دستیابی کے معاملے میں ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے مؤقف کی حمایت میں یہ کہتے ہیں کہ جاپان میں گھڑیاں، ٹرانسمیٹر، ٹیلی ویژن اور کیمرے تو بنائے جاتے ہیں لیکن ملیریا اور اسہال کی ایک عام سی ادویات دستیاب نہیں ہوتی۔ اس حقیقت کا انکشاف ان پر اس وقت ہوا جب انھوں نے اپنے دوست امان اللہ سردار کو ملیریا کی دوا لانے کے لیے کہا، انھوں نے انشا کو بتایا کہ یہاں صفائی کے عمدہ نظام کی بدولت مکھیاں اور مچھر پیدا نہیں ہوتے جو ملیریا اور اسہال کی وجہ ہوتے ہیں اس لئے یہاں ملیریا اور اسہال کی دوا نہیں ملتی۔ جبکہ پاکستان میں ہر جگہ گندگی اور غلاظت کے ڈھیر نظر آتے ہیں جو مچھر اور مکھیوں کی ایک بڑی آمجگاہ ہوتے ہیں اس لیے پاکستان میں یہ دونوں بیماریاں عام ہیں اور ان بیماریوں کی ادویات بھی اتنی وافر مقدار میں موجود ہیں کہ ہم اپنی ضروریات تو کیا اوروں کی ضروریات بھی بآسانی پوری کر سکتے ہیں، ہاں یہ شرط نہ لگائی کہ دوائیاں اصلی ہیں یا نقلی۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ جاپان پر ہماری برتری صرف امراض کی تشخیص، طریقۂ علاج اور ادویات کی دستیابی کی حد تک ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے ہاں تو معالج بھی کئی اقسام کے ملتے ہیں مثلاً عامل، کامل، سیاسی بابے اور حکیم وغیرہ جو ہر وقت آپ کی خدمت کے لیے حاضر رہتے ہیں۔ اسی طرح ادویات کی مختلف اقسام کی بابت وہ بتاتے ہیں کہ یہاں مختلف اقسام کے

معجون، کشتے اور شربت وغیرہ دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ بواسیر کے چھلے دینے والے چینی ہیلتھ سینٹر، انڈونیشی دواخانے، جرمن فارمیسیاں بھی اس خدمت میں پیش پیش ہیں۔

یوں انشانے جب علاج و معالجے کے حوالے سے پاکستان اور جاپان کا تقابل کیا تو انھیں ڈاکٹری آلات کے طریقۂ استعمال، امراض کی تشخیص، امراض، ادویات اور معالجین کی اقسام غرض ہر حوالے سے پاکستان اور جاپان میں صرف اختلاف کا پہلو ہی نظر آیا۔

نظامِ تعلیم:

کسی ملک کی ترقی و خوشحالی کے لیے اس ملک کے افراد کا پڑھا لکھا ہونا بے حد ضروری ہے۔ کسی ملک کی شرح خواندگی سے ہمیں نہ صرف اس ملک کی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ وہاں کے لوگوں کے تہذیب یافتہ ہونے کا پتا بھی چلتا ہے۔ انشانے بھی شرح خواندگی کو اہم گردانتے ہوئے پاکستان اور مشرقِ بعید کے ممالک کا تقابل اس حوالے سے بھی کیا۔ وہ پاکستان کی شرح خواندگی کی بابت بتاتے ہیں کہ پاکستان میں ۱۰۰ میں سے ۱۷ افراد خواندہ ہیں جبکہ جاپان میں تو پورا ملک ہی پڑھا لکھا ہے۔ انڈونیشیا میں بھی خواندگی کا تناسب وہ سو فیصد ہی بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہاں لوگوں کی اکثریت اگر لکھ نہیں سکتی تو پڑھ ضرور سکتی ہے۔ اسی طرح کوریا میں بھی شرح خواندگی کا تناسب وہ سو فیصد سے زائد بتاتے ہیں۔ البتہ سائنسی ترقی کے حوالے سے جب وہ پاکستان اور افغانستان کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں پاکستان میں اس حوالے سے صورتحال قدرے بہتر نظر آتی ہے۔

شرح خواندگی کے بعد انشا پاکستان اور انڈونیشیا کے نظامِ تعلیم کا تقابل کرتے ہیں۔ اس تقابل میں ان پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ ان دونوں ملکوں کے طلبا تعلیم پر توجہ دینے کی بجائے سیاست میں حصہ لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر کسی ملک کے طلبا تعلیم کو چھوڑ کر سیاست میں شریک ہونے لگیں تو وہاں کے تعلیمی نظام میں بگاڑ کا پیدا ہونا یقینی ہوتا ہے۔ یوں ان کو پاکستان اور انڈونیشیا کے نظامِ تعلیم میں اشتراک کی یہ صورت نظر آئی کہ ان دونوں ملکوں کے طلبا تعلیم کو چھوڑ کر سیاست میں حصہ لیتے ہیں جو ان دونوں ملکوں کے تعلیمی نظام میں بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔

اس کے بعد انشا پاکستان اور جاپان کے طالب علموں کے طرزِ عمل کا جائزہ لیتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ان دونوں ملکوں کے طالب علم کسی بھی منفی صورتحال میں شدید جذباتی ردِعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب انھوں نے ایک بھکشو کو جاپان کے مشہور گولڈن ٹمپل کو آگ لگاتے دیکھا۔ دراصل ہوا یوں کہ یہ بھکشو گولڈن ٹمپل میں درس پاتا تھا لیکن اسے یہاں کی تعلیم بے حد مشکل معلوم ہوتی تھی۔ لہٰذا اس نے اس مشکل سے نجات پانے کے لیے گولڈن ٹمپل ہی کو آگ لگا دی۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ملک کے نوجوان بھی کسی منفی صورتحال میں اسی قسم کے جذباتی ردِعمل

کا مظاہرہ کرتے ہیں کیوں کہ جب انھیں بھی کوئی پرچہ مشکل لگے تو وہ اسے حل کرنے کی بجائے پھاڑ دیتے ہیں۔ یوں انشا کو جاپان اور پاکستان کے طالبعلموں میں یہ اشتراک نظر آیا کہ جب بھی انھیں کوئی منفی صورتحال پیش آتی ہے تو وہ شدید جذباتی ردِّعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اسی طرح جب انشا پاکستان اور چین کے نظام تعلیم کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کو فوجی تربیت بھی دی جاتی ہے تاکہ وقت پڑنے پر وہ بھی گوریلا لڑائی میں حصہ لے سکیں۔ جبکہ ہمارے ہاں فوجی تربیت صرف ان ہی افراد کو دی جاتی ہے جو باقاعدہ فوج کا حصہ بنتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ شنگھائی قیام کے دوران میں نے اور وفد کے دیگر ارکان نے بچوں کے ایک کلچرل پیلس میں شرکت کی۔ جب میں اور میرے ساتھی اس پیلس میں گئے تو وہاں راستے میں موجود رکاوٹوں کے باعث ہمیں سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا لیکن بعد میں پتا چلا کہ ایسی مشقیں تو وہاں بچوں کو سکھائی جاتی ہیں۔ یوں انشا کو پاکستان اور چین کے نظام تعلیم میں فوجی تربیت کے حوالے سے بھی اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

اس کے بعد انشا مذہبی تعلیم کے حوالے سے پاکستان اور انڈونیشیا کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ پتا چلتا ہے کہ ان دونوں ملکوں میں مذہبی تعلیم کے لیے مسجدوں کے ساتھ مدرسے بنائے جاتے ہیں جہاں بچوں اور نوجوانوں کو مذہبی تعلیم دی جاتی ہے۔ یوں پاکستان اور انڈونیشیا میں مسجدوں سے ملحقہ مدرسوں کی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے اخبار کے ساتھ اس کے ضمیمے کی۔

الغرض انشا کو پاکستان، چین، جاپان اور انڈونیشیا کے نظام تعلیم میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

سیاسی نظام:

کسی ملک کا سیاسی نظام اس ملک کے باشندوں کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالتا ہے کیوں کہ یہ نظام ان لوگوں کی سماجی اور معاشی زندگی کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی عادات واطوار اور رویوں میں تبدیلی لاتا ہے۔ انشا نے دنیا کے مختلف ممالک کے سیاسی نظاموں کے بارے میں جس قدر معلومات حاصل کیں ان کا تقابل کئی حوالوں سے پاکستان کے سیاسی نظام سے بھی کیا اور اس تقابل کے نتیجے میں آنے والے اشتراک اور اختلاف کو واضح بھی کیا۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کی تفصیل بیان کی جارہی ہے۔

جب انشا نے پاکستان اور چین کے سیاسی نظام کا تقابل کیا تو انھیں یہ معلوم ہوا کہ ان دونوں ممالک نے اپنی آزادی کے حصول کے لئے نہ صرف جدوجہد کی اور قربانیاں دیں بلکہ لانگ مارچ بھی کیا۔ یوں انھیں پاکستان اور چین کے سیاسی نظام میں لانگ مارچ کے حوالے سے اشتراک کا پہلو نظر آیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد نے

۱۹۴۷ء میں ہجرت کی اور چینیوں نے ۳۵۔۱۹۳۴ء میں ایک لانگ مارچ کیا۔ البتہ پاکستانی لانگ مارچ کا مقابلہ چینی لانگ مارچ سے کسی بھی طرح نہیں کیا جاسکتا کیونکہ چینی لانگ مارچ ایک لمبے عرصے اور وسیع رقبے پر محیط تھا جس میں انقلابیوں کی ایک بڑی تعداد نے اپنے سے کئی گنا بڑے مسلح دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس لڑائی میں بہت سے انقلابی زخمی ہوئے اور بہت سے مارے گئے۔ بہرحال انشا کو پاکستان اور چین کے سیاسی نظام میں لانگ مارچ کے حوالے سے اشتراک کا پہلو نظر آیا۔

اس کے بعد انشا پاکستان، بھارت اور سری لنکا کے سیاسی نظام کا جائزہ لیتے ہیں۔ جس سے انھیں ان تینوں ممالک میں یہ اشتراک نظر آتا ہے کہ انھوں نے ایک ہی سال یعنی ۱۹۴۷ء میں انگریزی تسلط سے آزادی حاصل کی اور آزادی کے بعد ان تینوں ممالک کا گورنر جنرل ایک ہی انگریز تھا۔

انشا پاکستان اور انڈونیشیا کے سیاسی نظام کا تقابل بھی کرتے ہیں اور اس تقابل میں بھی انھیں اشتراک کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہ دونوں ملک ایک طویل عرصے تک غیر ملکی سامراج کے زیر تسلط رہے۔ انڈونیشیا نے ۱۹۴۶ء میں ساڑھے تین سو سال کی غلامی کے بعد آزادی حاصل کی اور آزادی کے بعد تحریک آزادی کے لیڈر سوئیکارنو ہی کو ملک کا صدر بنایا گیا۔ پاکستان نے ۱۹۴۷ء میں آزادی حاصل کی، پاکستان کے حصول آزادی کا زمانہ بھی انڈونیشیا کے حصول آزادی کے زمانے کے قریب ہی ہے اور یہاں بھی تحریک آزادی کے لیڈر قائداعظم ہی کو ملک کا پہلا سربراہ بنایا گیا۔ اس کے علاوہ انھیں پاکستان اور انڈونیشیا کے سیاسی نظام میں یہ اشتراک بھی نظر آیا کہ یہ دونوں ملک اپنی طاقت پر بھروسا کرنے کی بجائے انگریزوں کی طاقت پر بھروسا کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جب بھی کوئی مشکل آن پڑے گی تو انگریز ان کی مدد کو آئیں گے۔ انشا بتاتے ہیں کہ صرف پاکستان اور انڈونیشیا ہی نہیں بلکہ سراوک اور ملایا کے امراء وسلاطین بھی انگریزوں کی طاقت پر بھروسا کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اگر جاپان نے ان پر چڑھائی کی تو حکومت برطانیہ ایک شیر کی طرح ان پر جھپٹے گا۔ البتہ جب وقت آیا تو حکومت برطانیہ نے ان کی کوئی مدد نہ کی اور یوں حکومت برطانیہ جسے وہ اپنا ہمدرد اور مددگار سمجھتے تھے وقت آنے پر صرف کاغذی شیر ثابت ہوا۔ بہرحال انشا کو غیر ملکی سامراج کے تسلط، حصول آزادی کے زمانے اور ملک کے پہلے سربراہ کی نامزدگی کے حوالے سے پاکستان اور انڈونیشیا کے سیاسی نظام میں زیادہ تر اشتراک کی صورتیں ہی نظر آئیں۔ اس کے علاوہ انگریزوں کی طاقت پر انحصار کرنے کے حوالے سے بھی انھیں پاکستان، انڈونیشیا اور ملائیشیا میں بھی اشتراک کا پہلو ہی نظر آیا۔

اس کے بعد انشا پاکستان اور جاپان کے سیاسی نظام کا تقابل کرتے ہیں۔ اس تقابل سے انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ممالک میں حکومتی اختیارات کے دائرہ کار میں کافی اختلاف موجود ہے۔ پاکستان میں حکومتیں اپنے دائرہ عمل کے اعتبار سے محدود اختیارات کی مالک ہیں اس لئے لوگوں کے بہت سے معاملات اور باہمی لین دین کو ان کا ذاتی معاملہ قرار دے کر اس میں مداخلت نہیں کرتیں۔ جبکہ جاپان میں حکومت کے پاس وسیع اختیارات ہوتے ہیں اس لیے وہ لوگوں کے

باہمی معاملات میں مداخلت کا استحقاق بھی رکھتی ہے اگر کسی فریق کے ساتھ زیادتی ہو تو وہ انھیں اس کا حق بھی دلواتی ہے جبکہ پاکستان میں کسان اور بنئے کے باہمی لین دین یعنی مول اور بیاج میں اگر کسان کی فصل یا زمین رہن رکھ لی جاتی ہے تو ہماری حکومت اسے بھی ان دونوں کا باہمی معاملہ قرار دیتے ہوئے اس میں کوئی کردار ادا نہیں کرتی۔ جبکہ جاپان میں ایک کمپنی نے دس فیصدی دس روز کے حساب سے گالف کھیلنے والی ایک فرم کو کروڑوں روپے کا قرض دیا تو جاپانی حکومت نے اس سلسلے میں مداخلت کر کے زیادتی کے شکار فریق کو انصاف مہیا کیا۔

انؔشا کو پاکستان اور جاپان کے سیاسی نظام میں جہاں حکومتی اختیارات کے حوالے سے اختلاف نظر آیا وہیں کیوٹو (جاپان) کے کانیجو کاسل نامی ایک قدیم قلعے کے دیوانِ عام میں رائج نظام اور پاکستانی سیکرٹریٹ کے نظام میں بھی اشتراک نظر آیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ دونوں جگہ عوام اپنی بات براہِ راست سربراہ سے نہیں کر سکتے بلکہ انھیں درجہ بدرجہ مختلف لوگوں سے ہوتے ہوئے اپنی بات سربراہِ مملکت تک پہنچانی پڑتی ہے۔ اس اشتراک کو انؔشا نے سفرنامہ نگری نگری پھرا مسافر کے درج ذیل حوالے میں بڑے طنزیہ انداز میں یوں بیان کیا ہے:

> ''وہ دیوان عام جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے سب سے بڑا دیوان ہے۔ اس میں مورتیوں سے اس زمانے کے دربار کا نقش جما رکھا ہے کوئی پندرہ بیس درباری منصب دار یا جاگیردار گھٹنے ٹیکتے تلواریں سامنے رکھے بیٹھے ہیں۔ نگاہیں سب کی نیچی ان کے آگے وزراء کی نشست، چھ وزراء اور مدار المہام ایک دوسرے کی طرف منہ کئے مؤدب بیٹھتے ہیں۔ ان سے آگے کافی فاصلہ دے کر شوگن صاحب بیٹھے ہیں اور ان سے کچھ ہٹ کر ایک نوعمر لڑکا تلوار لئے، یہ صاحب خاص تھا۔ کیونکہ شوگن لوگ خود تلوار نہ اٹھاتے تھے اسے کسرِ شان سمجھتے تھے۔ یہ جاگیردار لوگ بھی شوگن سے براہ راست کلام نہ کر سکتے تھے۔ یہ وزراء کرام سے عرض معروض کرتے تھے۔ وہ آگے شوگن تک بات پہنچاتا تھا۔ قریب قریب ہمارے سیکرٹریٹ کا سا نظام سمجھئے کہ کلرک اپنی فائل سیکشن آفیسر کو پیش کرے اور سیکشن آفیسر ڈپٹی سیکرٹری سے رجوع کرے۔ وہ اچھے موڈ میں ہے تو چڑیا بٹھا کر فائل آگے بڑھائے ورنہ کونے میں ڈال دے۔''[۲۵]

یوں انؔشا کو پاکستان کے موجودہ سیکرٹریٹ اور جاپان کے قدیم دیوان عام کے نظام حکومت میں تو اشتراک نظر آیا لیکن پاکستان اور جاپان کی موجودہ حکومتوں کے اختیارات میں کافی اختلاف نظر آیا۔

انؔشا نے فلپائن قیام کے دوران وہاں کے سیاسی نظام کا بھی جائزہ لیا اور اس کا تقابل پاکستان کے سیاسی نظام سے بھی کیا۔ اس تقابل میں انھیں دونوں جانب اشتراک کی بہت سی صورتیں نظر آئیں۔ اشتراک کی پہلی صورت تو انھیں یہ نظر آئی کہ یہ دونوں ملک ایک طویل عرصے تک مارشل لاء کے زیر سایہ رہے جس کے باعث ان دونوں ممالک میں جمہوریت اور جمہوری اقدار کو پنپنے کو موقع نہ مل سکا۔ بلکہ ان ممالک میں عوام کا ایک طبقہ ایسا بھی موجود ہے جو خود مارشل لاء کے نفاذ کا حامی نظر آتا ہے۔ انؔشا بتاتے ہیں کہ فلپائن میں مارشل لاء کا نفاذ دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور میرے دل میں اس دیارِ غیر

کے لئے اپنائیت کا احساس جاگا۔ یہ طرزِ حکومت ہمارے ہاں ایک طویل عرصے تک رائج رہا ہے جس کے باعث ہمیں اس نظامِ حکومت سے ایک گونہ مانوسیت پیدا ہوگئی ہے۔ اب اگر ہم اپنے ملک کے علاوہ کسی اور ملک میں بھی مارشل لاء کا نفاذ دیکھیں تو ہمیں وہ ملک بھی اپنا وطن لگنے لگتا ہے بلکہ ہم تو یہ سوچتے ہیں کہ چلو وطن نہیں تو وطن کی کوئی چیز بھی اگر دیارِ غیر میں مل جائے تو غنیمت ہے۔

انشا کو پاکستان اور فلپائن میں یہ اشتراک کی دوسری صورت یہ نظر آئی کہ ان دونوں ملکوں کے حکمران مارشل لاء کے نفاذ کے لیے کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ لیتے ہیں پاکستان میں اس مقصد کے لیے مذہب کو آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور فلپائن میں بائیں بازو کی طرف سے ہونے والی مسلح جارحیت کو۔

اس کے علاوہ انشا کو پاکستان اور فلپائن کے سیاسی نظام میں اشتراک کی تیسری صورت یہ نظر آئی کہ ان دونوں ممالک میں سیاسی شخصیات کا قتلِ عام ہے اور ان کے قتل میں حکومتی مشینری کا عمل دخل بھی دونوں جگہ بالکل ایک جیسا ہی ہے۔ حالانکہ ان ممالک میں اہم سیاسی شخصیات کی حفاظت کے لیے سخت اقدامات کئے جاتے ہیں لیکن پھر بھی یہ سیاسی شخصیات قتل ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں ممالک میں قاتلوں کی ان شخصیات تک رسائی اور قتل کے بعد قاتل کو مار کر قتل کا سراغ مٹا دینے میں فوج، پولیس اور حکومتی مشینری کا کردار بھی انھیں دونوں جگہ بالکل ایک جیسا ہی نظر آیا۔ پاکستان میں اس کی مثال سید اکبر کے قتل سے اور فلپائن میں اس کی مثال صدر مارکوس کی اہلیہ پر ہونے والے قاتلانہ حملے سے دی جاسکتی ہے۔ وہ پاکستان اور فلپائن میں اہم سیاسی شخصیات کے قتل کا ذمہ دار حکومتی مشینری کو قرار دیتے ہیں اور اس اشتراک کو وہ سفر نامہ *ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''مارکوس صاحب کی بیگم بڑی دلکش شخصیت کی مالک ہیں اور ان کو الیکشن میں جتوانے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ بچاری اچھی ہیں۔ ایک شام ہم پان امریکن کے دفتر میں بیٹھے ٹکٹ بنوا رہے تھے کہ خبر آئی ان پر کسی نے چاقو سے حملہ کیا ہے۔ کس نے کیا ہے؟ کیوں کیا ہے؟ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ ہمیں یہی فکر تھی کہ جنوبی ریاستوں کے کسی مسلمان نے نہ کیا ہو؟ حملہ کرنے والا بے شک جنوبی ریاستوں ہی کا تھا لیکن مسلمان نہیں۔ سید اکبر کی طرح پولیس والوں نے اسے وہیں گولی مار کر ڈھیر کر دیا۔ جس سے اس کی عقدہ کشائی اور مشکل ہوگئی ہے۔''[۲۶]

یوں درجہ بالا تقابل کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ انشا کو پاکستان اور فلپائن کے سیاسی نظام میں مارشل لاء کے نفاذ، اس کے نفاذ کے جواز اور سیاسی شخصیات کے قتلِ عام میں فوج، پولیس اور حکومتی مشینری کے ملوث ہونے کے حوالے سے اشتراک کا پہلو نظر آیا۔

عدالتی نظام:

یوں تو زندگی میں افہام وتفہیم کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن پھر بھی بعض اوقات بعض مسائل اور تنازعات ایسے بھی جنم لیتے ہیں جن کے حل کے لیے ہمیں مجبوراً عدالتوں کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ اَنشا نے دوران سفر جہاں دیگر معلومات حاصل کیں وہیں دنیا کے مختلف ممالک کے عدالتی نظام کے بارے میں معلومات بھی حاصل کیں۔ جب وہ پاکستان اور چین کے عدالتی نظام کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں چین کا عدالتی نظام پاکستان کے عدالتی نظام سے زیادہ بہتر نظر آتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ چین میں عدالتیں اکثر خالی رہتی ہیں بلکہ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی کئی ہفتے کوئی کیس عدالت میں نہیں آتا۔ اور اگر کوئی کیس عدالت میں آ بھی جائے تو اس کا فیصلہ بھی اکثر راضی نامے کی صورت میں ہی ہو جاتا ہے۔ اَنشا بتاتے ہیں کہ وہاں درخواست گزار اشٹام کی بجائے سادہ کاغذ پر عرضی لکھ دیتا ہے یا پوسٹ کر دیتا ہے۔ اس کے ایک یا دو دن بعد عدالت فیصلے کے لئے بیٹھ جاتی ہے اور زیادہ سے زیادہ ایک یا دو دن میں فیصلہ ہو جاتا ہے۔ وکلاء کو فیس حکومت کی طرف سے ملتی ہے اس لئے وہ اپنے فریق کی بلا ضرورت حمایت نہیں کرتے بلکہ صرف اس قانون کی تشریح کرتے ہیں جو متعلقہ صورتحال میں لاگو ہوتا ہے۔ اَنشا سوچتے ہیں کہ اگر پاکستان کا عدالتی نظام بھی چین کے عدالتی نظام جیسا ہو جائے تو اس سے جو نئی صورتحال جنم لے گی اسے وہ سفرنامہ چلتے ہو چین کو چلیئے کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں:

''ہمارے ہاں ایسا ہو تو وکیل اور ان کے دلال، سرشتہ دار اور اہلکار، عرضی نویس اور وثیقہ نویس بھوکے مریں اور کل ہی ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے سامنے قطار باندھ کھڑے نظر آئیں۔''[۲۷]

بہر حال اَنشا کو پاکستان اور چین کے عدالتی نظام میں صرف اختلاف کے پہلو ہی نظر آئے۔

معاشی نظام:

کسی ملک کا معاشی نظام وہاں کے لوگوں کی زندگیوں کو بہت متاثر کرتا ہے۔ کسی ملک کی کرنسی کی قدر و قیمت میں کمی اور زیادتی، مہنگائی کی شرح، اور لوگوں کی اقتصادی حالت اور افراطِ زر کی شرح سے اس ملک کے معاشی نظام کے استحکام اور عدم استحکام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اَنشا پاکستان اور چین کے لوگوں کی تنخواہوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ چین میں لوگوں کی تنخواہیں پاکستان میں لوگوں کی تنخواہوں کے مقابلے میں بہت کم ہیں لیکن پھر بھی وہ وہ لوگ خوش وخرم رہتے ہیں اور مطمئن زندگی گزارتے ہیں۔ جبکہ پاکستان میں لوگوں کی تنخواہیں زیادہ ہیں لیکن پھر بھی یہاں کے لوگ بدحال اور ناآسودہ ہی نظر آتے ہیں۔ وہ اس تضاد کی وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اول تو چین میں مرد اور خواتین دونوں کام کرتے ہیں اور دوسرے

وہاں صحت اور تعلیم جیسی سہولیات سب کے لئے مفت ہیں اور جہاں تک رہائش اور لباس کا تعلق ہے تو وہ بھی وہاں سب کو بہت ہی ارزاں قیمت پر دستیاب ہو جاتا ہے۔ وہاں شادی بیاہ پر جہیز اور دیگر فضول رسومات سے پرہیز کیا جاتا ہے اور شادی کے اخراجات بھی حکومت کے ذمے ہوتے ہیں۔ پھر وہاں یہ سہولت بھی موجود ہے کہ اگر کوئی شخص چاہے تو اپنی آمدنی گھٹا اور بڑھا بھی سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی شخص کے ہاں بچے کی ولادت ہو جائے تو وہ شخص جس جگہ کام کرتا ہے وہاں سب لوگ باہمی مشاورت سے اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ اس طرح جب چینی وزیر اعظم موزے تنگ نے اس بات کا اندازہ کیا کہ ان کی تنخواہ ان کے اخراجات سے کچھ زیادہ ہے تو انھوں نے خود ہی اپنی تنخواہ میں کمی کر دی۔ جبکہ پاکستان میں صورتحال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں نہ تو حکومت اپنے فرائض پورے کرتی ہے اور نہ ہی لوگ فضول رسومات سے اجتناب کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگوں کی اکثریت غیر مطمئن اور بدحال نظر آتی ہے۔

کسی ملک کے معاشی استحکام میں اس ملک کی کرنسی کی قدر و قیمت کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ انشا نے دنیا بھر کی سیاحت کے دوران مختلف ممالک کی کرنسیوں کی قدر و قیمت کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور ان کا تقابل پاکستانی کرنسی سے کرنے کے بعد پاکستان اور دیگر ممالک کے معاشی نظام کے استحکام اور عدم استحکام کو واضح کرنے کی کوشش بھی کی۔

انشا پاکستانی کرنسی روپیہ، جاپانی کرنسی ین اور امریکی کرنسی ڈالر کا تقابل کرتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ امریکی کرنسی، ڈالر کی قدر و قیمت سب کرنسیوں سے زیادہ ہے۔ پاکستانی روپیہ جاپانی کرنسی ین کے مقابلے میں اپنی قدر کھوتا جا رہا ہے لیکن جاپانی کرنسی ین امریکی کرنسی ڈالر کے مقابلے میں استحکام حاصل کر رہی ہے۔

اس کے بعد انشا پاکستان روپے، افغانستان کی افغانی اور امریکی ڈالر کا تقابل بھی کرتے ہیں اور ان تینوں کرنسیوں کی قدر و قیمت میں موجود اختلاف کو ایک خریداری سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو انھوں نے اپنے ایک دوست مسٹر گلبرگ کے ہمراہ افغانستان کے ایک بازار میں کی۔ وہ سفر نامہ *دنیا گول ہے* کے درج ذیل حوالے میں اس خریداری کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''بات یہ ہے کہ افغانستان میں سکے کی بین الاقوامی قیمت مقرر نہیں ہے۔ ہر روز بازار کا بھاؤ نکلتا ہے۔ ڈالر کے ستر بہتر افغانی مل جاتے ہیں اور روپے کے بہت دوڑ دھوپ سے شاید نو افغانی مل جاتے ہیں۔ بہر حال ہم کسی چیز کے دام سن کر اسے فوراً پاکستانی سکے میں ڈھالتے تو وہ خاصی مہنگی معلوم ہوتی۔ گلبرگ صاحب کی آنکھیں ارزانی دیکھ کر چمک اٹھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کابل جیسے گئے تھے ویسے ہی پھر کے آگئے۔ کچھ بھی نہ لا سکے اور ڈاکٹر گلبرگ وہاں سے لدے پھندے گئے۔'' [۲۸]

یوں درجہ بالا حوالے میں انشا نے یہ واضح کیا ہے کہ سب سے زیادہ قدر و قیمت امریکی ڈالر کی ہے اس کے بعد پاکستان روپے کی اور سب سے کم افغانستان کی کرنسی افغانی کی۔

اس کے بعد انشا پاکستان، فلپائن اور امریکہ کی کرنسیوں کا تقابل کر کے ان میں موجود اختلاف کی وضاحت کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ فلپائنی کرنسی کے پندرہ سو ایک امریکی ڈالر کے برابر ہیں اور ہماری کرنسی کے حساب سے انھیں پندرہ روپے سمجھیے۔ یوں ان تینوں کرنسیوں کے تقابل سے وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جن لوگوں کے پاس ڈالر ہیں وہ تو بادشاہ ہیں، پاکستانی کرنسی کی قدر و قیمت بھی گو کہ زیادہ نہیں ہے لیکن پھر بھی فلپائن کی کرنسی سے زیادہ ہے۔ یوں انشا کو پاکستان، فلپائن اور امریکہ کی کرنسیوں کی قدر و قیمت میں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

کرنسیوں کی قدر و قیمت کے بعد انشا کاروباری لین دین کے حوالے سے پاکستان اور جاپان کے معاشی نظام کا جائزہ لیتے ہیں۔ انھیں پاکستان اور جاپان کے معاشی نظام میں یہ اختلاف نظر آتا ہے کہ جاپان میں سارا کاروباری لین دین پیسوں میں ہوتا ہے جبکہ ہمارے ہاں کاروباری لین روپوں میں ہوتا ہے۔ انشا کہتے ہیں کہ اگر ہم لوگ بھی قیمتوں کو روپوں کی بجائے پیسوں میں گنیں تو ایک دن لکھ پتی ہو سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے بلکہ ماضی قریب میں ہمارے ہاں بھی دمڑی ہوتی تھیں اور ان میں کوڑیاں ہوتی تھیں اور ان کوڑیوں کی چیزوں بھی بازار میں دستیاب ہوتی تھیں۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ میں نے دنیا کے مختلف ممالک کی کرنسیاں دیکھیں جن میں افغانستان کی افغانی، انڈونیشیا کا روپیہ، ایران کا ریال، پولینڈ کی زلوٹی اور اٹلی کا لیرا بھی دیکھا، یہ سب دونی، اکنی اور دھیلے کے برابر تو ہیں لیکن جاپانی کرنسی ین ان سب کو بہت پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ یوں انشا کو پاکستان اور جاپان کے معاشی نظام میں بھی اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

کسی ملک میں مہنگائی کی شرح میں کمی یا اضافے سے بھی اس ملک کی معیشت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انشا نے مہنگائی کے حوالے سے پاکستان اور بنگلہ دیش کا تقابل کیا اور یہ بتایا کہ پاکستان میں مہنگائی کے حوالے سے صورتحال تسلی بخش ہے لیکن بنگلہ دیش میں اس حوالے سے صورتحال غیر تسلی بخش ہے۔ انھیں یہ بات اسی وقت معلوم ہوئی جب وہ یونیسکو کے ایشین کو پبلی کیشن پروگرام میں شرکت کی غرض سے جا رہے تھے تو جہاز میں ان کی ملاقات ایک بنگلہ دیشی نامہ نگار سے ہوئی۔ اس نے انھیں بتایا کہ وہ ٹیلی ویژن سیٹ جو پاکستان میں سولہ سترہ سو روپے کا ملتا ہے وہاں اس کی قیمت چھ ہزار روپے ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ میں نے پاکستانی سوتی کپڑے کی ایک پتلون پہن رکھی تھی جو ہمارے حساب سے زیادہ مہنگی نہیں تھی۔ وہ شخص میری پتلون کے کپڑے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگا اور کہنے لگا کہ اب بھلا ہمیں ایسا اعلیٰ پاکستانی سوتی کپڑا کہاں دستیاب؟۔ اب تو ہمیں مجبوراً بھارت کا کھردرا کپڑا ہی پہننا پڑتا ہے جس پر وہ میڈ ان پاکستان کی مہر لگا کر بیچتے ہیں۔ یوں انشا کو مہنگائی کے حوالے سے بنگلہ دیش اور پاکستان میں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

پھر وہ مہنگائی کے حوالے سے پاکستان اور جاپان کا تقابل بھی کرتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جاپان میں بھی پاکستان کے مقابلے میں زیادہ مہنگائی ہے۔ پاکستان میں جن چیزوں کی قیمت ارزاں ہے انھی کی قیمت جاپان میں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ اس حقیقت کا ادراک انھیں ٹوکیو میں ایک چڑیا گھر میں غبارہ خریدتے ہوئے ہوا۔ وہ بتاتے ہیں کہ

میں نے دکاندار سے ایک غبارے کی قیمت پوچھی تو اس نے جواب میں پانچ انگلیاں اٹھا دیں۔ میں یہ سمجھا کہ شاید پچاس ین کا تقاضا کر رہا ہے، بعد میں پتا چلا کہ پانچ انگلیوں سے مراد پچاس ین نہیں بلکہ پانچ سو ین ہے یعنی ہمارے حساب سے پندرہ روپے۔ انشا بتاتے ہیں کہ قیمت سننے کے بعد میں نے اس دکاندار کا شکریہ ادا کرنے میں ہی غنیمت جانی۔ بہرحال انھیں کو مہنگائی کے حوالے سے پاکستان اور جاپان میں اختلاف ہی نظر آیا۔

انشا کو مہنگائی کے حوالے سے جہاں پاکستان میں صورتحال بہتر نظر آئی ہیں کچھ اشیاء کی قیمت کے حوالے سے پاکستان میں غیر تسلی بخش صورتحال بھی نظر آئی۔ جب وہ پٹرول کی قیمت کے حوالے سے پاکستان اور انڈونیشیا کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ پتا چلتا ہے کہ پاکستان میں تو اس کی قیمت بہت زیادہ ہے لیکن انڈونیشیا میں اس کی قیمت بہت کم ہے یوں انھیں پٹرول کی قیمت کے حوالے سے پاکستان اور انڈونیشیا میں خاصا اختلاف نظر آیا۔

الغرض انشا کو پاکستان، مشرق بعید اور کئی دیگر ممالک کے معاشی نظام میں اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں ہی نظر آئیں۔

مذہب:

دنیا کا تقریباً ہر مہذب انسان کسی نہ کسی قانون، ضابطے یا مذہب کو اختیار کر کے اپنی زندگی گزارتا ہے۔ دنیا میں اس وقت کئی مذاہب موجود ہیں۔ انشا نے دوران سیاحت مختلف ملکوں اور خطوں کے لوگوں کے مذہب، مذہبی اعتقادات اور مذہبی تہواروں کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور کئی جگہ ان کا تقابل اپنے ملک کے مذہب اور مذہبی زندگی سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت بھی کی۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

انشا جب مذہب اور مذہبی زندگی کے حوالے سے پاکستان اور جاپان کے لوگوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آتے ہیں۔ اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ جاپانیوں کے ہاں کسی خدا کا تصور موجود نہیں ہے جو خوف خدا کا باعث بن سکے لیکن پھر بھی یہ لوگ جرائم کے ارتکاب سے گھبراتے ہیں۔ جبکہ ہم لوگ ایک خدا پر ایمان رکھتے ہیں جو ہمارے دل میں خوف خدا کا باعث ہونا چاہیے لیکن پھر بھی ہم بڑی بہادری اور دلیری سے گناہ پر گناہ کیے جاتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ پاکستانیوں اور جاپانیوں دونوں کے لیے مذہب صرف ایک تبرک کی حیثیت رکھتا ہے جس کا اطلاق صرف خوشی اور غمی کی چند تقریبات تک ہی محدود رہتا ہے۔ انشا بتاتے ہیں کہ پاکستان اور جاپان کے لوگ پہلے کسی اور مذہب سے وابستہ تھے لیکن بعد میں انھوں نے ایک نیا مذہب قبول کیا۔ مثال کے طور پر جاپان کے لوگ پہلے بدھ مذہب سے وابستہ تھے اور بعد میں انھوں نے شنتو مذہب قبول کر لیا۔ اسی طرح پاکستان کے اکثر

لوگ بھی پہلے ہندو مت یا کسی اور مذہب سے منسلک تھے اور بعد میں انھوں نے اسلام قبول کیا البتہ پاکستانیوں اور جاپانیوں میں فرق یہ ہے کہ پاکستانیوں نے مذہب اسلام کو قبول کرنے کے بعد پچھلے مذہب کو بالکل چھوڑ دیا۔ جبکہ جاپانی لوگ مذہب کے معاملے میں دو عملی کا شکار ہیں۔ وہ بدھ مذہب سے بھی اپنا تعلق قائم رکھتے ہیں اور شنتو مذہب سے بھی۔ انشا مذہب کے معاملے میں جاپانیوں کی اس دو عملی کو سفر نامہ *نگری نگری پھرا مسافر* کے درج ذیل حوالے میں بڑے طنزیہ انداز میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:

''مزید تحقیق پر معلوم ہوا کہ جاپان کے لوگ صلح کل ہیں۔ بدھ مذہب کو بھی مانتے ہیں اور پرانے بزرگوں کے دین شنتو مذہب سے بھی نہیں بگاڑتے دونوں جگہ ڈنڈوت کرتے ہیں اور متھا ٹیکتے ہیں۔ شادی بیاہ یا کوئی اور خوشی کا موقع ہو تو شنتو مذہب کی رسوم بجالاتے ہیں۔ کوئی موقع غمی اور ناشادی کا ہو تو بدھ مذہب کو اپناتے ہیں۔ گنگا گئے تو گنگا رام، جمنا گئے تو جمنا داس۔'' ۲۹

دنیا کے ہر مذہب میں تبلیغ کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ انشا جب تبلیغی طریقوں کے حوالے سے پاکستان اور جاپان کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ پتا چلتا ہے کہ ان دونوں ملکوں میں وعظ کرنے والے نثر کو اتنے مترنم انداز میں پڑھتے ہیں کہ نثر پر شاعری کا گمان گزرتا ہے۔ اس بات کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب انھوں نے جاپان کے مشہور گولڈن ٹمپل میں ایک بوڑھے گائیڈ کو بڑے مترنم انداز میں مندر کا احوال بیان کرتے دیکھا۔ انشا پہلے تو یہ سمجھے کہ شاید یہ شخص کوئی مثنوی پڑھ رہا ہے لیکن بعد میں انھیں معلوم ہوا کہ وہ نثر میں ہی احوال بیان کر رہا تھا۔ اس گائیڈ کو دیکھ کر انھیں یاد آیا کہ پاکستان میں بھی شفیع اوکاڑوی ایسے ہی مترنم انداز میں وعظ کیا کرتے تھے۔ البتہ جب وہ جاپانی گائیڈ اور شفیع اوکاڑوی کی آواز کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں شفیع اوکاڑوی کی آواز اس جاپانی گائیڈ سے بہتر معلوم ہوتی ہے کیونکہ جاپانی گائیڈ کو تو لاؤڈ سپیکر جیسے مصنوعی سہارے کی ضرورت تھی لیکن شفیع اوکاڑوی کی آواز اتنی بلند ہوتی تھی کہ انھیں لاؤڈ سپیکر کی بھی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ یوں انشا کو پاکستان اور جاپان میں تبلیغی طریقے کے حوالے سے تو اشتراک نظر آیا البتہ شفیع اوکاڑوی اور جاپانی گائیڈ کی آواز میں اختلاف نظر آیا۔

اس کے بعد انشا مذہبی اعتقادات اور توہم پرستی کے حوالے سے پاکستان اور جاپان کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جاپانی بھی ہماری طرح روحانیت پسند ہیں اور توہم پرستی کا شکار ہیں۔ اس بات کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب انھوں نے جاپان میں گیون مستوری نامی میلہ دیکھا۔ یہ میلہ وہاں ہر سال وہاں ۱۶ جولائی کو منعقد کیا جاتا ہے۔ اس میلے کی روایت جاپان میں صدیوں پرانی ہے۔ انشا اس میلے کا تقابل جب محرم الحرام کے جلوس سے کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں کیا اشتراک اور اختلافات نظر آئے اسے انھوں نے سفر نامہ *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے۔

''یہاں وہی دھوم دھام تھی۔وہی از دہام تھا۔مشتاقِ سخن خلق چلی آتی تھی۔آپ ہجوم میں ایک بار پھنس گئے تو سمجھئے کہ فٹ ہو گئے اِدھر اُدھر ہلنا ناممکن۔تھورے تھوڑے فاصلے پر تعزیے بھی کھڑے تھے۔ صاحبوان تعزیوں کا سلسلہ عزاداری سے نہ ہم ملاتے ہیں نہ تم ملانا۔ان لوگوں کو سبھی غم ہیں، غم حسین کے سوا۔یہ دومنزلہ کھٹولے ہوتے ہیں۔زرق برق کاغذوں اور جھنڈیوں سے آراستہ۔ان کو کاندھوں پر اٹھاتے ہیں۔ریڑھوں پر گھماتے ہیں اور ثواب کماتے ہیں۔لوگ نذریں بھی دیتے ہیں۔اور پھر ان کو ایک خانقاہ میں لے جا کر ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ہماری تو ہمت نہ ہوئی۔ ہمارے ساتھی مع کشفی صاحب کے قطار میں لگ کر ان کے اُوپر گئے جہاں کچھ ناؤنوش، باجے گاجے کا سامان بھی تھا۔ان لوگوں نے پیسے نذر کیے اور تبرک پایا، کچھ آپ کھایا کچھ ہمیں چکھایا۔''[۲۸]

انشا کو درجہ بالا حوالے میں گیون مستوری کے میلے اور محرم الحرام کے جلوس میں اشتراک کی کئی صورتیں نظر آئیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہ دونوں ہی کسی تاریخی واقعے کی یاد میں صدیوں سے منائے جا رہے ہیں، واقعے کی نوعیت البتہ دونوں جگہ مختلف ہے۔دونوں جگہ لوگوں کی تعداد، تعزیے، علم، برکات، منتوں اور نیازوں کے مناظر انھیں بالکل ایک جیسے نظر آئے۔ یوں انھیں جاپانی میلے گیون مستوری اور محرم الحرام کے جلوس میں کافی حد تک اشتراک کا پہلو نظر آیا۔

توہمات پرستی کے حوالے سے بھی انشا کو پاکستانیوں اور جاپانیوں میں اشتراک کا پہلو ہی نظر آیا۔کیونکہ کیوٹو میں بھی انھوں نے ایسی خانقاہیں دیکھیں جیسے ہمارے ملک میں ہوتی ہیں اس کے علاوہ انھوں نے وہاں بھی لوگوں کو درختوں سے تعویذ باندھتے، منتیں مانگتے اور کھانے تقسیم کرتے دیکھا۔یوں انھیں توہمات پرستی کے حوالے سے پاکستانیوں اور جاپانیوں میں زیادہ تر اشتراک کا پہلو ہی نظر آیا۔

کسی بھی مذہب میں اس کے مذہبی اجتماع کو خاص اہمیت دی جاتی ہے اور تقریباً ہر مذہب کے ماننے والے اپنے مذہبی اجتماع میں بڑے ذوق وشوق سے شرکت کرتے ہیں۔انشا جب مذہبی اجتماعات میں شرکت کے حوالے سے پاکستان اور ہانگ کانگ کے لوگوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ملکوں کے لوگ اپنے سالانہ اجتماع میں بڑے شوق سے شرکت کرتے ہیں۔ ہانگ کانگ قیام کے دوران انھوں نے وہاں کے باشندوں کو زرق برق لباس میں نوروز کے میلے میں جاتے دیکھا۔وہ بتاتے ہیں کہ کولون جانے والی ریلوے اسٹیشنوں پر مسافروں کے علاوہ ان کے لواحقین بھی موجود تھے، قلی ہر طرف سامان اٹھائے نظر آ رہے تھے اور ہر طرف ٹریفک جام تھا۔انشا کو یہ مناظر دیکھ کر یاد آیا کہ پاکستان میں بھی حج کے موقع پر حاجیوں میں ایسا ہی ذوق وشوق دیکھنے کو ملتا ہے اور ریلوے اسٹیشنوں اور ہوائی اڈوں پر ایسے ہی مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ بہر حال انشا کو پاکستان اور ہانگ کانگ کے لوگوں میں یہ اشتراک نظر آیا کہ دونوں ہی اپنے سالانہ مذہبی اجتماع میں بڑے ذوق وشوق سے شرکت کرتے ہیں۔

دنیا میں کئی مذاہب ایسے بھی ہیں جن کے ماننے والے دنیا کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں اسلام بھی ایسا ہی

مذہب ہے۔ انشا کو سیر وسیاحت کے دوران دنیا کے مختلف ممالک کے مسلمانوں سے ملنے اوران کے طرزِ زندگی کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے پاکستانی اورچینی مسلمانوں کا تقابل بھی کیااور یہ بتانے کی کوشش کی کہ چینی مسلمان جوایک غیر مسلم ملک میں رہ رہے ہیں ہم پاکستانیوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر مسلمان ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کینٹین میں مجھے چند چینی مسلمانوں سے ملنے کے بعد یہ پتا چلا کہ چینی مسلمان اسلامی نام رکھتے ہیں لیکن نام کے آخر میں کچھ چینی الفاظ کا اضافہ کر دیتے ہیں، اسلامی وضع قطع اختیار کرتے ہیں۔ پھر میں نے یہ جاننے کے لیے کہ انھیں قرآن مجید پر کس قدر عبور حاصل ہے ان سے ایک سورۃ پڑھوائی جو ابراہیم نامی شخص نے بالکل صحیح سنادی لیکن ہم میں سے صرف ایک شخص کو یہ سورت آتی تھی۔ پھر میں نے ان سے آٹوگراف لیے تاکہ یہ جان سکوں کہ انھیں عربی رسم الخط سے کتنی واقفیت حاصل ہے لیکن اس میں بھی میرے ہاتھ ان کی کوئی کمزوری نہ آئی۔ ان چینی مسلمانوں میں سے ایک نے بتایا کہ وہ عربی زبان بول بھی سکتا ہے۔ انشا بتاتے ہیں کہ میں نے اس کا امتحان لینا مناسب نہ سمجھا کیونکہ خود میری استعداد اس زبان پر صرف الحمدللہ اور جزاک اللہ تک ہی محدود تھی۔ یوں چینی مسلمانوں سے ملنے کے بعد ان کو یہ اندازہ ہوا کہ چینی مسلمان کئی حوالوں سے پاکستانی مسلمانوں سے بہتر مسلمان ہیں یوں ان میں اختلاف کا پہلو ہی نظر آیا۔

انشا کو چینی اور پاکستانی مسلمانوں میں بحیثیت مسلمان جہاں اختلاف نظر آیا وہیں پاکستان اور الماتا (قازقستان) کے مسلمانوں میں اشتراک کا پہلو بھی نظر آیا۔ وہ اس اشتراک کی تفصیل بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان دونوں ملکوں کے لوگ اپنی زندگی کو اسلام کے عملی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ صرف وضع قطع کی حد تک ہی اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں ان دونوں ممالک میں یہ اشتراک بھی نظر آیا کہ ان کی مساجد میں عام دنوں میں تو نمازیوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے البتہ جمعہ یا عیدین کے موقع پر اس تعداد میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ ان دونوں ملکوں کے مسلمان اسلام کو صرف خوشی اور غمی کی چند رسومات کے موقع پر ہی یاد رکھتے ہیں لیکن عملی زندگی میں اسلام کے اصولوں پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔

دنیا کے ہر مذہب کے پیروکاروں میں کچھ خوبیاں ہوتی ہیں اور کچھ خامیاں۔ انشا جب مسلمانوں، عیسائیوں اور بدھ مذہب کے پیروکاروں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے کبھی بھی کسی غیر مسلم ملک میں اپنی ذاتی مفاد کی خاطر اپنی اسلامی شناخت کو نہیں چھپایا۔ جبکہ عیسائی اور بدھ مذہب کے پیروکار اپنے مفادات کی خاطر اپنے نام تبدیل کرلیتے ہیں تاکہ اپنی مذہبی شناخت کو چھپا سکیں۔ اس بات کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب وہ سری لنکا میں آسٹین جے وردھنا کو عیسائی سمجھے لیکن بعد میں پتا چلا کہ ان کا تعلق بدھ مذہب سے تھا۔ انشا نے جب ان سے اس طرح کے نام رکھنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ ایسے نام رکھنے کا رواج پرتگیزوں کے دور میں ہوا جو کسی غیر مذہب کو نوکری نہیں دیتے تھے اس لئے ایسے نام رکھنے کا رواج ہوا۔ یہ بات سن کر انشا نے سوچا کہ ہمارے ملک کے عیسائی بھی ایسے نام رکھتے ہیں جن

میں نام کا آدھا حصہ اسلامی اور آدھا حصہ کرسچین ہوتا ہے۔مثلاً پیٹر فضل دین وغیرہ وغیرہ۔یوں انھیں عیسائیوں اور بدھ مذہب کے ماننے والوں میں یہ اشتراک نظر آیا کہ دونوں ہی اپنے مفاد کی خاطر اپنی مذہبی شناخت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مسلمان اس اعتبار سے عیسائیوں اور بدھ مذہب سے بہتر ہیں کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اپنی مذہبی شناخت کو قطعاً نہیں چھپاتے۔

اس کے بعد انؔشا مسلمانوں کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔وہ اختلاف رائے کو ان کی سب سے بڑی خامی قرار دیتے ہیں۔وہ بتاتے ہیں کہ اس خامی کا مظاہرہ زیادہ تر عید کے تہوار پر دیکھنے میں آتا ہے جب اس تہوار کے ہونے یا نہ ہونے کا انحصار صرف اور صرف چاند کے نظر آنے یا نہ نظر آنے پر ہوتا ہے۔انؔشا عید کے تہوار کے موقع پر ہونے والے اختلاف رائے کے حوالے سے جب سعودی عرب، ترکی ، ایران ، پاکستان اور جاپان کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ سعودی عرب نے ۴ جنوری کو عید منانے کا اعلان کیا اور ترکی نے ۵ جنوری کو، بعض ممالک نے سعودی عرب کے ساتھ عید منائی اور بعض نے ترکی کے ساتھ لیکن جاپان اور پاکستان میں رہنے والے بعض لوگوں نے ۴ جنوری کو سعودی عرب کے ساتھ اور بعض نے ۵ جنوری کو ترکی کے ساتھ عید منائی۔اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یوں تو تمام مسلمانوں میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے لیکن پاکستان اور جاپان کے مسلمان اختلاف رائے کے معاملے میں باقی ممالک کے مسلمانوں سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔یوں اختلاف رائے جیسی خامی کے حوالے سے پاکستان اور جاپان کے مسلمانوں میں تو اشتراک موجود ہے لیکن باقی ممالک کے مسلمانوں میں اس حوالے سے اختلاف کی صورت موجود ہے۔

شہر اور دیہات:

شہر اور دیہات، دونوں ہی کسی ملک کی پہچان ہوا کرتے ہیں۔شہروں میں جہاں جدید طرز زندگی کی جھلک نظر آتی ہے وہیں دیہات، دیہاتی طرزِ زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔انؔشا نے دوران سیاحت پاکستان اور مشرق بعید کے ممالک کے شہروں اور دیہاتوں کا تقابل مختلف حوالوں سے کیا ہے اور ان میں موجود اشتراکات اور اختلافات کو واضح کیا۔ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو بیان کیا جاتا ہے۔

انؔشا جب پاکستان کے شہر لاہور اور سری لنکا کے شہر سیلون کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں شہر اپنے ملک کے ثقافتی مرکز ہیں۔ان شہروں میں پہلے وقتوں کے بادشاہوں اور مہاراجاؤں کے محلات موجود ہیں جو اس دور کی تہذیب وثقافت کی مکمل عکاسی کرتے ہیں لیکن پھر بھی ان شہروں میں آنے والے اکثر سیاح یہاں کے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو دیکھنے کی بجائے زیادہ تر یہاں کی مشہور جگہوں ہی کو دیکھتے ہیں۔مثال کے طور پر لاہور میں آنے والے سیاح زیادہ تر بادشاہی مسجد یا شالامار باغ کی سیر کرتے ہیں اور سیلون میں آنے والے سیاح یا تو پیری ڈینیا کے باغات کی سیر کو جاتے ہیں

یا پھر بدھ کے مندر کی زیارت کرتے ہیں۔ یوں انشا کو لاہور اور سیلون شہر میں دو مماثلتیں نظر آئیں پہلی تو یہ کہ دونوں شہر اپنے ملک کے ثقافتی مرکز ہیں اور دوسری یہ کہ ان دونوں شہروں میں آنے سیاح یہاں کے ثقافتی ورثے کو دیکھنے کی بجائے زیادہ تر یہاں کی مشہور جگہوں ہی کو دیکھنے جاتے ہیں۔

دوران سیاحت انشا کو یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض شہر ایسے بھی ہیں جو اپنی کسی نہ کسی خصوصیت کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اس حوالے سے جب وہ پاکستان، بھارت اور سری لنکا کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ان تینوں ممالک میں یہ اشتراک نظر آتا ہے کہ ان کے بعض شہر کسی نہ کسی خاص چیز کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اس اشتراک کو انھوں نے سفر نامہ ابن بطوطہ کے تعاقب میں کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے۔

> ''جس طرح دہلی لال قلعے کی وجہ سے، آگرہ تاج محل کے نام پر، لاہور شالا مار باغ کی نسبت سے، خورجہ شلجم کے اچار اور قصور اپنی میتھی کی خوشبو سے مشہور ہے، اسی طرح کینڈی کی شہرت کا رشتہ مہاتما بدھ کے دانت کے مندر سے بندھا ہے۔''[۱۳]

دیہات اور دیہاتی طرز زندگی کے حوالے سے جب انشا پاکستان اور جاپان کے دیہات کا موازنہ کرتے ہیں تو انھیں یہ پتا چلتا ہے کہ ان دونوں ملکوں کے دیہات نہ صرف دیکھنے میں بالکل ایک جیسے ہیں بلکہ ان میں بسنے والے لوگوں کا اخلاق اور طرز عمل بھی بالکل ایک جیسا ہے۔ انھیں اس بات کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ ایک پاکستانی دوست مولانا ابوالخیر کشفی صاحب کے یہاں گئے جو جاپان کے ایک دیہاتی علاقے میں رہائش پذیر تھے۔ انشا نے مولانا صاحب کے ہمراہ اس دیہاتی علاقے کا سروے بھی کیا جس سے انھیں یہ پتا چلا کہ وہاں سب لوگ نہ صرف ایک دوسرے کو فرداً فرداً جانتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی خیریت بھی دریافت کرتے ہیں اور ان کے آپس کے تعلقات بھی بڑے گہرے اور دوستانہ ہیں۔ پاکستان کی طرح یہاں کے دیہاتی لوگ بھی شہری لوگوں کی نسبت زیادہ ملنسار اور با اخلاق ہیں اور ایک دوسرے کے لیے محبت اور پرخلوص کے جذبات رکھتے ہیں۔ یوں انشا کو پاکستان اور جاپان کے دیہات نہ صرف دیکھنے میں ایک جیسے لگے بلکہ ان دونوں جگہ کے دیہاتی لوگوں کے اخلاق اور طرز عمل میں بھی انھیں اشتراک کا پہلو نظر آیا۔

چین قیام کے دوران انشا کنیٹن کے نواحی علاقوں میں بھی گئے۔ ان نواحی علاقوں میں انھیں پاکستانی دیہات کی پوری جھلک نظر آئی کیونکہ وہاں بھی بالکل ایسی ہی گلیاں تھیں جیسی ہمارے ہاں کے دیہاتی علاقوں میں ہوتی ہیں، یوں باہر سے دیکھنے پر یہ نواحی علاقے ہمارے دیہات ہی کا نقشہ معلوم ہو رہے تھے۔ البتہ جب انھوں نے ان دونوں ممالک کے دیہی علاقوں کے طرز زندگی کا مشاہدہ کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ چین کے نواحی علاقے زندگی کی جدید سہولیات سے محروم ہیں اور وہاں کا طرز زندگی بہت پسماندہ ہے اس کے مقابلے میں پاکستان کے دیہاتی علاقوں کا طرز زندگی نسبتاً بہتر اور ترقی یافتہ ہے۔ اس بات کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب انھوں نے کنیٹن کے نواحی علاقے میں ایک عورت کو چکی میں چاول پیستے

دیکھا۔ وہ بتاتے ہیں کہ جس چکی میں وہ عورت چاول پیس رہی تھی اس سے ہمارے دیہاتی علاقوں میں استعمال ہونے والی چکیاں زیادہ بہتر اور ترقی یافتہ ہیں۔ انشا اس چکی کی ساخت کے بارے میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ چکی کیا ہے؟ سمجھئے ایک گڑھا، جس میں لکڑی کا ایک ہتھوڑا سا لگا ہوا ہے جس میں وہ عورت بڑی مشکل سے چاول پیس رہی تھی ۔ یوں انھیں پاکستان اور چین کے نواحی علاقے دیکھنے میں تو ایک جیسے لگے لیکن ان دونوں جگہوں پر بسنے والے لوگوں کے طرز زندگی میں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔ بہرحال انشا کو پاکستان اور مشرق بعید کے ممالک کے شہروں اور دیہات میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو نظر آئے۔

سڑکیں:

کسی ملک کے ذرائع آمدورفت میں سڑکوں کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر سڑکیں اعلیٰ معیار کی ہوں تو سفر انتہائی تیز رفتار اور آرام دہ ہوگا اور اگر ناقص ہوں گی تو سفر اتنا ہی سست رفتار اور تکلیف دہ ہوگا۔ انشا نے سڑکوں کی اسی اہمیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے دوران سفر پاکستان اور دیگر ممالک کی سڑکوں کا تقابل کئی حوالوں سے کیا اور ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو واضح کیا۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو بیان کیا جا رہا ہے۔

انشا پاکستان اور منیلا (فلپائن) کی سڑکوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ملکوں کی سڑکیں اپنے ناقص معیار کی وجہ سے بالکل ایک جیسی لگتی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ فلپائن میں بھی پاکستان کی طرح ایسی ناقص معیار کی سڑکیں بنائی جاتی ہیں جو معمولی سے سیلاب کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتیں اور ایک ہی ریلے میں بہہ جاتی ہیں۔ انھیں ان دونوں ممالک میں سڑکوں کے ناقص معیار کی وجہ ایک ہی دکھائی دیتی ہے جسے وہ سفر نامہ *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''چنانچہ اب نئی سڑکیں سیمنٹ کی بنائی جا رہی ہیں۔ چونکہ سیمنٹ کی سڑکیں بھی ٹھیکیدار ہی بنائیں گے اور ٹھیکیدار اور اہلکاروں کے درمیان خیر سگالی اور امداد باہمی کا یہاں ہمارے ملک سے بھی زیادہ رواج ہے۔ لہٰذا سیمنٹ کی کارکردگی بھی دیکھنا چاہیے۔''[۳۲]

انشا کی سرکاری مصروفیات نے انھیں کوریا کے سفر کا موقع بھی فراہم کیا۔ جب وہ سیول کے ہوائی اڈے سے شہر جانے والی سڑک پر سے جا رہے تھے تو انھیں اس سڑک میں راولپنڈی کی مری روڈ کا نقشہ نظر آیا۔ اشتراک کی پہلی صورت تو انھیں یہ نظر آئی کہ دونوں جگہ ٹریفک بہت زیادہ تھی اور دوسری یہ کہ دونوں جگہ کی سڑکوں پر لوگوں کی بھیڑ بھاڑ بھی بہت زیادہ تھی۔

سڑکیں یوں تو آمدورفت کا ذریعہ ہوتی ہیں لیکن بعض سڑکیں اپنی چہل پہل اور چکا چوند کے سبب منفرد مقام رکھتی ہیں۔ انشا جب رونق اور چہل پہل کے حوالے سے جاپان کی گنزا اسٹریٹ، برطانیہ کی الفنسٹن اسٹریٹ اور پاکستان کی

انارکلی کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس حوالے سے تینوں ممالک کی سڑکوں میں اشتراک کا پہلو نظر آیا۔ البتہ الفنسٹن اسٹریٹ کو وہ گنزا اسٹریٹ اور انارکلی سے بڑھ کر قرار دیتے ہیں بلکہ بقول انؔشا الفنسٹن اسٹریٹ کو انارکلی اور گنزا اسٹریٹ کے مساوی قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے آغا حشر کو شیکسپیئر کہہ دیا جائے۔

بہر حال انؔشا کو پاکستان، مشرق بعید اور کئی دیگر ممالک کی سڑکوں میں مختلف حوالوں سے اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

بازار:

بازار نہ صرف خرید و فروخت کا مرکز ہوتے ہیں بلکہ کسی ملک کی پہچان بھی ہوتے ہیں۔ انؔشا نے سیر و سیاحت کے دوران پاکستان اور بیرونی ممالک کے بازاروں کا تقابل مختلف حوالوں سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراک اور اختلاف کی صورتوں کو واضح کرنے کی کوشش بھی کی۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کا بیان کیا جا رہا ہے۔

انؔشا نے انڈونیشیا قیام کے دوران یہ دیکھا کہ وہاں رات کو پھیری والے بازار لگتے ہیں جنھیں وہاں پاسا مالم کہا جاتا ہے جس کے معانی شبینہ بازار یا نائٹ مارکیٹ کے ہیں۔ اس قسم کے شبینہ بازار انڈونیشیا کے شہر کوالپور میں بہت زیادہ ہیں جو ہر ہفتے وہاں ایک نئی جگہ پر لگائے جاتے ہیں۔ جب وہ پاکستان میں ایسے بازاروں کی موجودگی کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں یاد آتا ہے کہ ہمارے ہاں بھی پرانے وقتوں میں اس قسم کے بازار لگائے جاتے تھے جنھیں گزری کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد انؔشا صفائی کے حوالے سے پاکستان اور انڈونیشیا کے بازاروں کا تقابل کرتے ہیں تو اس حوالے سے بھی انھیں ان دونوں ملکوں کے بازاروں میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو نظر آتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ انڈونیشیا میں بھی بازار کے ایک طرف قطار در قطار کباب والوں اور دہی بڑھے والوں کی دکانیں تھیں جن میں صفائی کا انتظام بہت ہی ناقص تھا لیکن پھر بھی میں پیٹ بھرنے پر مجبور تھا۔ اگر ایسی دکانیں کراچی میں بھی ہوتی اور وہاں صفائی کی صورتحال ایسی ہوتی تو میں وہاں سے کچھ نہ کھاتا لیکن انڈونیشیا میں ایسا نہ کر سکا کیونکہ پردیس کی ہر چیز انوکھی ہوتی ہے۔ انؔشا درست فرماتے ہیں واقعی ہم اپنے ملک اور اس کی چیزوں پر تو بہت تنقید کرتے ہیں لیکن اگر ایسی ہی صورتحال ہمیں دیارِ غیر میں نظر آ جائے تو ہم اسے بڑی آسانی سے گوارا کر لیتے ہیں۔

اس کے بعد انؔشا پاکستان اور تھائی لینڈ کے بازاروں کا تقابل کرتے ہیں، اس تقابل میں انھیں دونوں ملکوں کی دکانوں کے ناموں کے حوالے سے اختلاف کا پہلو نظر آتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ تھائی لینڈ میں دکانوں کے نام تھائی زبان میں لکھے جاتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں زیادہ تر انگریزی زبان میں لکھے جاتے ہیں۔ انھیں پاکستان اور تھائی لینڈ کے بازاروں میں جہاں اختلاف کا پہلو نظر آیا وہیں اشتراک کا یہ پہلو نظر آیا کہ ان دونوں ملکوں کے بازاروں میں کچھ خاص قسم کی دکانیں

زیادہ تعداد میں ہوتی ہیں۔کراچی کے بازاروں میں پان کی دکانیں زیادہ تعداد میں ہوتی ہیں اور تھائی لینڈ کے بازاروں میں بار، نائٹ کلب اور حمام زیادہ ہوتے ہیں۔

بہرحال انشا کو پاکستان اور مشرق بعد کے بازاروں میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

محنت کش طبقہ:

کسی ملک کی ترقی وخوشحالی میں جہاں وہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ اہم کردار ادا کرتا ہے وہیں وہاں کے محنت کش طبقے کی خدمات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔انشا نے دنیا بھر کی سیاحت کے دوران پاکستان اور بیرونی ممالک کے محنت کشوں کا تقابل کیا اور اس تقابل کے نتیجے میں آنے والے اشتراکات اور اختلاف کو بھی بیان کیا ہے۔ان اشتراکات اور اختلافات کو ذیل میں بیان کیا جارہا ہے۔

ٹیکسی ڈرائیوروں کے ذکر میں وہ پاکستان اور روس کے ٹیکسی ڈرائیوروں کا تقابل کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ ان دونوں ملکوں کے ٹیکسی ڈرائیور بہت بے ایمانی کرتے ہیں اور جان بوجھ کر کم فاصلے کو زیادہ بتاتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ روس میں مقیم ایک پاکستانی بزرگ نے مجھے بتایا کہ یہاں کے ٹیکسی ڈرائیور بے ایمانی کے نئے نئے ڈھنگ اپناتے ہیں۔یہ لوگ ۲ میل کے فاصلے کو جان بوجھ کر ۸ میل بتاتے ہیں۔اگر کوئی شخص ان سے اس سلسلے میں کوئی احتجاج کرے تو وہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے بلکہ انھیں دیکھ کر یہ ڈر لگتا ہے کہ کہیں مار پیٹ پر ہی نہ اتر آئیں۔اس کے بعد وہ پاکستانی ڈرائیور حضرات کے طرز عمل کے بارے میں بتاتے ہیں کہ بے ایمانی تو یہ لوگ بھی کرتے ہیں لیکن ان کا طرز عمل روسی ڈرائیوروں کے مقابلے میں قدرے بہتر ہے کیونکہ جب کوئی مسافر ان سے احتجاج کرتا ہے اور انھیں کڑوی کسیلی سناتا ہے تو یہ بڑے حوصلے سے یہ سب کچھ سن لیتے ہیں اور کسی قسم کے احتجاج یا منفی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کرتے۔بہرحال انشا کو پاکستان اور روس کے ٹیکسی ڈرائیوروں کے طرز عمل میں بے ایمانی کے حوالے سے تو اشتراک نظر آیا لیکن تنقید برداشت کرنے کے حوالے سے انھیں پاکستانی ڈرائیور روسی ڈرائیوروں سے بہتر نظر آئے۔

انشا کو سری لنکا کے سفر کے دوران وہاں کے ٹیکسی ڈرائیوروں سے بھی واسطہ پڑا۔جب وہ بے ایمانی کرنے کے حوالے سے پاکستان اور سری لنکا کے ٹیکسی ڈرائیوروں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں پتا چلتا ہے کہ کولمبو کے ٹیکسی ڈرائیور بے ایمانی کرنے میں کراچی کے ٹیکسی ڈرائیوروں سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔وہ ان کی بے ایمانی کی بابت بتاتے ہیں کہ یوں تو سری لنکا کی حکومت نے ان کی بے ایمانی کو روکنے کے لیے ٹیکسیوں میں میٹر لگائے ہیں لیکن پھر بھی یہ لوگ بے ایمانی کرنے سے باز نہیں آتے۔یہ لوگ اپنی من مانی کرتے ہوئے کم فاصلے کو بڑھا کر بتاتے ہیں۔وہ کہتے ہیں جب آپ نے انھیں آواز دی تو پہلا میٹر وہیں سے شروع ہو جاتا ہے، جب ٹیکسی رکتی ہے تو دوسرا، یہاں تک کہ بیٹھنے تک چوتھے میٹر کا آغاز ہو جاتا ہے

۔اس کے علاوہ ان کے ہاں میٹر کی لمبائی بھی وہ نہیں جو انگریزوں نے مقرر کر رکھی ہے یعنی ۶۰ے۱ گز بلکہ وہ اس میں بھی من مانی کرتے ہیں اور کم فاصلے کو بڑھا کر بتاتے ہیں۔ یوں انشا نے پاکستان اور سری لنکا کے ٹیکسی ڈرائیوروں کے تقابل سے یہ ثابت کیا ہے کہ بے ایمانی کرنے کے حوالے سے پاکستان اور سری لنکا کے ڈرائیوروں میں اشتراک کا پہلو موجود ہے البتہ کولمبو کے ٹیکسی ڈرائیور بے ایمانی کرنے میں کراچی کے ٹیکسی ڈرائیوروں سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔

اس کے بعد انشا پاکستان اور سری لنکا کے دکانداروں کا تقابل کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ ان دونوں ملکوں کے دکاندار یہ گاہکوں کی مجبوری سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور مطلوبہ چیز کے ساتھ ساتھ غیر مطلوبہ چیز کو بھی جبراً فروخت کرتے ہیں۔اس کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب کنیڈی جاتے ہوئے ریل گاڑی میں ایک چائے والے کو انھوں نے چائے کا آرڈر دیا تو چائے والے نے انھیں بتایا کہ چائے کے ساتھ انھیں کیک بھی خریدنا پڑے گا۔ انشا نے یہ سننے کے بعد اسے بتایا کہ مجھے بھوک نہیں ہے اس لئے میں کیک نہیں خریدنا چاہتا صرف چائے پینا چاہتا ہوں لیکن اس نے جواب دیا کہ جناب اگر آپ نے چائے پینی ہے تو کیک بھی خریدنا پڑے گا۔ یوں انشا چائے کے ساتھ ساتھ کیک بھی خریدنا پڑا لیکن انھیں یاد آیا کہ پاکستان میں بھی کتب فروش کتابوں کے ساتھ خلاصے بھی جبراً فروخت کرتے ہیں۔ یوں انھیں کو پاکستان اور سری لنکا کے دکانداروں میں اشتراک کی یہ صورت نظر آئی کہ یہ دونوں ہی گاہکوں کی مجبوری سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور مطلوبہ چیز کے ساتھ غیر مطلوبہ چیز بھی جبراً فروخت کرتے ہیں۔

محنت کش طبقے میں اگر قلی کا ذکر نہ کیا جائے تو زیادتی ہوگی۔ انشا نے دوران سیاحت پاکستان اور دیگر ممالک کے قلیوں کا تقابل بھی کیا اور ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو واضح کرنے کی کوشش بھی کی۔ جب وہ پاکستان اور سری لنکا کے قلیوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں پاکستانی قلی سری لنکا کے قلیوں کی نسبت بہتر معلوم ہوتے ہیں کیونکہ وہ ان کی نسبت زیادہ سامان اٹھاتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ لاہور اور کراچی کے قلی ایک ہی بار دو، دو بستر، دو تین سوٹ کیس، پھلوں کی ٹوکریاں، ناشتہ دان اور ٹفن اٹھا لیتے ہیں جبکہ کولمبو کے قلی زیادہ سامان نہیں اٹھاتے اور تھوڑے سے سامان کے لیے بھی بہت سے قلی دوڑے آتے ہیں۔ اس کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب وہ اور ان کے دوست اختر حسین رائے پوری کینڈی جانے کے لیے کولمبو ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ انشا اور ان کے دوست اختر حسین رائے پوری کے پاس صرف ایک ایک بریف کیس تھا۔ اتنے سامان کے لیے اول تو انھیں قلی کی ضرورت ہی نہ تھی اور اگر ہوتی بھی تو ایک قلی کافی تھا۔ لیکن انشا بتاتے ہیں کہ جب ہم ریلوے اسٹیشن پہنچے تو ہمیں آتا دیکھ کر چھ قلی ہمارے طرف دوڑے اور ہمارا سامان اٹھانے لگے۔ یہ سامان انھوں نے کیسے اٹھایا اور کتنا کتنا اٹھایا اسے انھوں نے سفر نامہ *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے۔

''ایک نے ہمارا بریف کیس تھاما، جس میں دو قمیصیں اور دو پاجامے تھے، ایک نے ڈاکٹر صاحب کا۔ ہمارے

ہاتھ میں ایک اخبار تھا، ایک قلی اسے اٹھانے پر مصر تھا اور ڈاکٹر اختر حسین کے ہاتھ میں تھری کیسل کی سگریٹ کی ڈبی تھی ایک اس کے در پے ہوا۔''۳۳

بہر حال انشاؔ کو پاکستان اور مشرق بعید کے محنت کشوں میں مختلف حوالوں سے اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

آثار قدیمہ:

جس ملک کی تہذیب جس قدر قدیم ہوگی وہ ملک تہذیبی اعتبار سے اتنا ہی معتبر ہوگا۔ انشاؔ جب عجائبات ونودرات کے حوالے سے پاکستان، عراق، مصر اور یونان کا تقابل کرتے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ پاکستان کو اس اعتبار سے ان ممالک پر برتری حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ باغات اور محلات تو دنیا کے باقی بڑے شہروں میں مل جاتے ہیں لیکن بیل گاڑی وہ چیز ہے جو بغدار، ایتھنز اور قاہرہ میں بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتی جبکہ پاکستان میں یہ ہر جگہ نظر آتی ہے۔ یوں انشاؔ بیل گاڑی کو دنیا کی سب سے پرانی اور انوکھی چیز قرار دیتے ہوئے پاکستان کے آثار قدیمہ کی اس حوالے سے برتری ثابت کرتے ہیں۔

عجائبات ونوادرات کے حوالے سے جب انشاؔ پاکستان کے قدیم آثار موہنجوداڑو کا تقابل چین کے عہد پامیان کے قدیم آثار سے کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں اشتراک کی صورت نظر آتی ہے کیونکہ دونوں ملکوں کے آثار میں مٹی کی چند صراحیاں، پیالے اور کچھ انجر پنجر ہی شامل تھے۔ انشاؔ بتاتے ہیں کہ ہمارے وفد کے ایک رکن کو جب ان آثار میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی تو وہ کہنے لگے کہ ایسے پیالے اور مٹکے تو ہمارے گاؤں کا کمہار بھی بنا سکتا ہے۔

یوں انشاؔ کو آثار قدیمہ اور نودرات کے حوالے سے پاکستان، مشرق بعید اور کئی دیگر ممالک میں اشتراک کے ساتھ ساتھ اختلاف کے پہلو بھی نظر آئے۔

جانور:

بعض جانور بعض ممالک کی پہنچان بن جاتے ہیں۔ انشاؔ چوپایہ پرستی کے حوالے سے جب پاکستان اور سری لنکا کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ پتا چلتا ہے کہ ان دونوں ملکوں میں جانوروں کو قومی شناخت کا درجہ دیا گیا ہے۔ سری لنکا میں یہ مقام ہاتھیوں کو دیا گیا ہے اور کراچی میں یہ مقام اونٹ کو حاصل ہے۔ البتہ سری لنکا میں جو عزت واحترام ہاتھیوں کو دیا جاتا ہے اس کا ہمارے ہاں کے اونٹ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ سری لنکا میں ہاتھیوں کی قدر افزائی کو انشاؔ نے بڑے مزاحیہ انداز میں سفر نامہ *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے۔

> ''کولمبو میں پہلے روز جس چیز کی زیارت ہوئی وہ ہاتھی تھے اور اس کے بعد جتنے روز ہم سیلون میں رہے ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں رہا۔ ایک کپڑا پسند آیا اس پر بھی ہاتھی کی چھاپ تھی۔ ہاتھی مارکہ سگریٹ

بھی، جو ایک صاحب کے کہنے کے مطابق ہاتھی کی لید سے بنتا ہے جگہ جگہ نظر آیا۔ فورٹ کے علاقے میں جہاں جہاں سے گزرے نوادر کی دکانوں میں جو فقط سیاحوں کی جیبیں کاٹنے کا شائستہ بہانہ ہیں، ہاتھی ہی نظر آئے۔ چھڑی پر ہاتھی، سنگار دان پر ہاتھی، ایش ٹرے پر ہاتھی، کالے ہاتھی، پیلے ہاتھی، خاکستری ہاتھی، رنگ برنگے ہاتھی، معلوم ہوا کہ سفید ہاتھی بھی بہت ہیں لیکن دفتروں میں کام کرتے ہیں۔ آسٹن جیسے وردھنا نے از راہ محبت ایک سگریٹ کیس خرید کر دیا لیکن دیکھا تو اس پر بھی ایک ہاتھی براجمان تھا۔ ہم نے نہایت ادب سے کہا کیا آپ اسے بدل نہیں سکتے۔ بولے ہم نے تو خاص طور پر یہ اس لئے چنا تھا کہ اس پر ہمارے قومی جانور کی تصویر ہے۔'' ۳۴

یوں انشا کو پاکستان اور سری لنکا میں چوپایہ پرستی کے حوالے سے اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

اس کے بعد انشا گدھے کی دستیابی کے حوالے سے پاکستان اور جاپان کا تقابل کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ پاکستان میں گدھے کو ایک عام جانور سمجھا جاتا ہے لیکن جاپان میں ان کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔ جاپان میں گدھے بالکل نہیں ہوتے بلکہ بقول جاپانی سفیر، گدھا ہی وہ جانور ہے جو جاپان میں پاکستان کو متعارف کروا سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ گدھوں کی قدر و قیمت کے حوالے سے پاکستان، جاپان اور امریکا کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں تو گدھوں کی کوئی قدر نہیں ہے جبکہ جاپان سمیت دنیا کے کئی دیگر ممالک میں اسے بڑے عزت واحترام کے نظر سے دیکھا جاتا ہے بلکہ امریکہ جیسے ملک کی تو ڈیموکریٹک پارٹی کا نشان بھی گدھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ مشقت طلب کام تو گدھوں سے لیتے ہیں لیکن نسلی برتری کے باعث عزت و احترام کا حقدار صرف گھوڑوں کو ٹھہراتے ہیں جبکہ جاپان اور امریکہ جیسے ملک میں نسلی امتیاز کی بجائے صرف محنت و مشقت اور صبر و تحمل کو برتری کا معیار قرار دیتے ہوئے گدھوں کو گھوڑوں پر فوقیت دی جاتی ہے۔ تاہم انشا گدھے کے ذکر کو اس وقت اور بھی دلچسپ اور مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں جب وہ پاکستانی دفتروں میں موجود محنتی کارکنوں کو بھی گدھے قرار دیتے ہیں۔ جن کو ان تھک محنت کے باوجود کوئی عزت نہیں دی جاتی جبکہ پڑھے لکھے افسروں کے ناز نخرے برداشت کیے جاتے ہیں حالانکہ وہ گھوڑوں کی طرح اتنا کام نہیں کرتے۔

یوں انشا کو گدھوں کی دستیابی اور عزت و احترام کے حوالے سے پاکستان، جاپان اور امریکہ میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں ہی پہلو نظر آئے۔

صحافت:

آج کل کے دور میں اخبارات ہماری زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ دنیا کے اکثر ممالک میں اخبارات نہ صرف شائع کیے جاتے ہیں بلکہ بڑی دلچسپی سے پڑھے بھی جاتے ہیں۔ انشا کو دنیا کے مختلف ممالک کی سیاحت کے دوران ان

ممالک کے اخبارات کو دیکھنے اور جانچنے کا موقع بھی ملا۔ اس دوران انھوں نے پاکستان اور دیگر ممالک کے اخبارات کا تقابل کیا اور ان میں موجود اشتراکات اور اختلافات کو اپنے سفرناموں میں بیان کر دیا ہے۔ ان اشتراکات اور اختلافات کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

انشا پاکستان اور چین کے اخبارات کا تقابل کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ان دونوں ممالک کے اخبارات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پاکستان میں اخبارات صبح سویرے آتے ہیں اور چین میں اخبارات رات کو نکلتے ہیں اور دوسرے یہ کہ چین میں اخبارات صرف چینی زبان میں ہوتے ہیں جبکہ پاکستان میں اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی اخبارات شائع کیے جاتے ہیں۔ وہ بڑے مزاحیہ انداز میں کہتے ہیں کہ پاکستان میں میرے صبح سویرے اٹھنے کی واحد وجہ صرف اور صرف ہمارے ملک کے اخبارات ہیں جن کی چٹ پٹ خبریں ہمیں سونے نہیں دیتیں۔ اس کے بعد وہ پاکستانی اور چینی اخبارات میں خبروں کے دائرہ کار اور نوعیت کے بارے میں جاننے کے لئے ایک ترجمان سے کہتے ہیں کہ وہ انھیں اخبار کی سرخیاں پڑھ کر سنائے۔ سرخیاں سننے کے بعد انھیں یہ معلوم ہوا کہ وہاں کے اخبارات میں نہ تو چوری، قتل، ڈکیتی اور اغواء جیسے جرائم کی خبریں تھیں اور نہ ہی ٹریفک کے حادثات کی خبریں۔ یہی وجہ ہے کہ انشا کو چین کے اخبارات کی خبریں بہت پھیکی معلوم ہوئیں۔ پاکستانی اخبارات میں خبروں کا دائرہ کار اور نوعیت کیا ہے اسے وہ سفرنامہ چلتے ہو تو چین کو چلیے کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''یہاں تو اگر کہیں واردات ہو جائے تو ایک فرلانگ دُور جس دودھ والے کی دکان ہے اس کی، اس کے بچوں، اس کے دُور کے رشتہ داروں کی تصویریں اور سوانح چھپتے ہیں۔ باقی رہے سیاسی واقعات اور لیڈروں کی تقریریں۔ جن لوگوں کے پاس فالتو وقت ہوتا ہے۔ وہ ان پر بھی ایک غلط انداز نظر ڈال لیتے ہیں۔ ورنہ حادثوں کی خبریں اور تصویریں دیکھیں، آج کے فلمی اشتہارات پر نظر ڈالی۔ تاجر نے بونس واؤچر کا بھاؤ دیکھا، سکول کے لڑکے نے کھیلوں کا صفحہ نکال لیا۔ کوئی بڑے میاں ہوتے تو جائیدادوں اور ضرورتِ رشتہ کے اشتہارات بھی سہی، باقی بس۔'' ۳۵

یوں انشا کو پاکستان اور چین کے اخبارات میں ان کی اشاعت کے اوقات، خبروں کی نوعیت اور دائرہ کار کے حوالے سے صرف اختلاف کے پہلو ہی نظر آئے۔

انشا نے پاکستان اور فلپائن کے اخبارات کا تقابل بھی کیا۔ اس تقابل سے انھیں یہ پتا چلا کہ منیلا میں شائع ہونے والے اخبارات پاکستانی اخبارات کے مقابلے میں زیادہ طویل ہوتے ہیں۔ مثلاً منیلا ٹائمز جو وہاں کا کثیر الاشاعت ہے ۲۴ سے ۲۷ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ اس کے اتوار ایڈیشن میں صفحات کی تعداد بڑھ کر ۱۱۲ تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ منیلا کرانیکل، فلپائن ہیرلڈ، مرر اور نیو ایوننگ نیوز جیسے اخبارات میں صفحات کی تعداد منیلا ٹائمز سے تو کم ہے لیکن پاکستانی

اخبارات سے پھر بھی دوگنی تگنی ہوتی ہے اور یہی حال اس اخبار کے اتوار ایڈیشنوں کا ہے۔ اخبارات کے علاوہ انھوں نے پاکستان اور فلپائن کے کالم نگاروں کا تقابل بھی کیا جس میں انھیں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔ اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ فلپائن میں کالم نگار حکومت اور لوگوں سے بڑے بڑے مفادات حاصل کرتے ہیں مثال کے طور پر ایک کالم نگار نے اپنا بنک بنالیا اور ایک کو حکومت نے ائرپورٹ کا منیجر بنادیا۔ انشا بتاتے ہیں کہ مجھ سے وہاں کسی شخص نے پوچھا کہ آپ بھی تو اپنے ملک کے کالم نگار ہیں کیا آپ کے ملک والے آپ کو کسی ائرپورٹ کا منیجر بنادیں گے؟ تو میں نے جواب دیا کہ جناب منیجر بنانا تو دور کی بات ہے، مجھے تو ائرپورٹ کے اندر جانے کے لئے بھی پاس کی ضرورت پڑتی ہے۔ یوں اس صورتحال سے انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ پاکستان اور فلپائن میں کالم نگاروں کی قدر افزائی کے حوالے سے اختلاف موجود ہے۔ البتہ جب وہ فلپائن کے مشہور کالم نگار میکسمو سولیون اور پاکستان کے مشہور کالم نگار جمیل الدین عالی کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں کالم نگاروں میں اشتراک کی یہ صورت نظر آتی ہے کہ دونوں کا انداز تحریر بہت تیکھا اور بے باک ہے۔

اس کے بعد وہ خبروں کی صحت کے حوالے سے پاکستان، جاپان اور امریکہ کے اخبارات کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی اخبارات خبروں کی صحت کے سلسلے میں بہت محتاط طرز عمل اپناتے ہیں اور جس خبر پر انھیں ذرا سا بھی شک ہو وہ اس کے ساتھ وہ مبینہ کا لیبل لگا دیتے ہیں یا پھر یہ لکھ دیتے ہیں کہ اس خبر کی اب تک تصدیق نہیں ہوسکی۔ جبکہ جاپانی اور امریکی اخبارات خبروں کی صحت کے معاملے میں بہت غیر ذمہ دار طرز عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ غیر مصدقہ خبر کو بھی مصدقہ خبر کہہ کر شائع کردیتے ہیں۔ انشا ان کے غیر ذمہ دارنہ طرز عمل کی وضاحت آئے دن چینی وزیراعظم موزے تنگ کے قتل کی خبروں سے کرتے ہیں جنھیں جاپانی اور امریکی اخبارات شائع کرتے رہتے ہیں اور سچائی سامنے آنے پر وہ اس کی تردید بھی کردیتے ہیں۔ یوں انشا کو خبروں کی صحت کے حوالے سے پاکستان اور جاپان کے اخبارات میں تو اختلاف نظر آیا لیکن اسی حوالے سے جاپان اور امریکہ کے اخبارات میں مکمل اشتراک کی صورت بھی نظر آئی۔

انشا کو پاکستان اور جاپان کے اخبارات میں ایک فرق یہ بھی نظر آیا کہ جاپانی اخبارات غیر معیاری اور فحش لٹریچر چھاپ دیتے ہیں لیکن وہاں نہ تو اسی قسم کے لٹریچر کی اشاعت پر کوئی پابندی ہے اور نہ ہی وہاں کے لوگ ایسے لٹریچر کی اشاعت پر کسی قسم کے ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جبکہ پاکستانی اخبارات میں اول تو ایسے لٹریچر کی اشاعت پر پابندی ہے اور دوسرا اگر کہیں ایسا لٹریچر چھپ بھی جائے تو یہاں کے لوگوں کا طرز عمل جاپانی قارئین سے بالکل مختلف ہوتا ہے کیونکہ یہاں کے لوگ نہ صرف احتجاج کرتے ہیں بلکہ اس سلسلے میں دیگر عملی اقدامات بھی کرتے ہیں۔ انشا فحش اور غیر معیاری لٹریچر کی اشاعت کے حوالے سے جاپانیوں کے طرز عمل کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک امریکی نے ٹائم نامی رسالے میں نائٹ لائف اینڈ شاپنگ میں جاپانی مردوں اور خواتین کے بارے میں بہت سی نازیبا باتیں لکھیں لیکن

جاپانیوں نے اس پر کسی قسم کے ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انؔشا نے ان لوگوں سے اس صبر وتحمل کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے جواب دیا کہ جاپانی لوگ اول تو کتابچے پڑھتے ہی نہیں اور دوسرے یہ لوگ پابندیوں کے قائل نہیں ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ اگر ہمارے ملک میں ایسا لٹریچر شائع ہو جائے تو پورے ملک میں اس کے خلاف احتجاج شروع ہو جائے اور فوراً ایسے لٹریچر پر پابندی لگ جائے۔ یوں انؔشا کو فحش وغیر معیاری لٹریچر کی اشاعت کے حوالے سے پاکستانی اور جاپانی لوگوں کے طرزِ عمل میں کافی اختلاف نظر آیا۔

انؔشا کو پاکستان اور جاپان کے اخبارات میں جہاں اختلاف نظر آیا وہیں اشتراک کی ایک صورت بھی نظر آئی۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان دونوں ملکوں کے اخبارات میں ستاروں کی مدد سے قسمت کا حال بتایا جاتا ہے البتہ پاکستان کو جاپان پر یہ برتری حاصل ہے کہ یہاں قسمت کا حال معلوم کرنے کے کئی اور ذرائع بھی ہیں مثلاً طوطے اور جنتریاں وغیرہ۔

الغرض انؔشا کو پاکستان، مشرق بعید اور کئی دیگر ممالک کے اخبارات میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

زبان:

زبان اظہارِ خیال کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ باہمی تعلقات اور تجارتی لین دین میں اس کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انؔشا نے دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر اختیار کیا، اس دوران انھیں دنیا کے مختلف ممالک کی زبانوں کے بارے میں جاننے کا موقع بھی ملا۔ انھوں نے اپنے ملک کی قومی زبان اردو اور دیگر علاقائی زبانوں کا تقابل ان ممالک کی زبانوں سے کیا اور اس کے نتیجے میں آنے والے اشتراکات اور اختلافات کو اپنے سفرناموں میں بیان کر دیا۔

انؔشا جب رسم الخط کے حوالے سے پاکستان کی قومی زبان اردو اور سری لنکا کی قومی زبان سنگھالی کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں زبانوں کے رسم الخط میں خاصا اختلاف نظر آتا ہے۔ اس اختلاف کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ صادق اور علی دونوں مسلم نام ہیں لیکن سری لنکا کے لوگ جب ان ناموں کو اپنے رسم الخط میں لکھتے ہیں تو صادق Sadick اور علی، ایلی بن جاتا ہے۔ یوں ان ناموں کا نہ صرف تلفظ بدل جاتا ہے بلکہ ان کے معانی بھی بدل جاتے ہیں جس سے کئی بار صورتحال کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ یہاں قیام کے دوران انھیں اس بات کا بھی پتا چلا کہ یہاں کے لوگ اردو زبان سے تو بالکل ناواقف ہیں البتہ انگریزی زبان کی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ انؔشا جب اردو زبان سے واقفیت کے حوالے سے سری لنکا اور بنگلہ دیش کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ پتا چلتا ہے کہ بنگلہ دیش کے لوگ تو اردو زبان سمجھ لیتے ہیں لیکن سری لنکا کے لوگ اردو زبان بالکل نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ انؔشا کو بنگلہ دیش میں تبادلہ خیال کرتے ہوئے تو کوئی مشکل پیش نہ آئی لیکن سری لنکا قیام کے دوران انھیں کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑا، البتہ انگریزی زبان سے واقفیت نے

تبادلہ خیال میں کسی قدر سہولت پیدا کر دی۔

انشا رسم الخط کے حوالے سے اردو اور جاپانی زبان کا تقابل بھی کرتے ہیں اس تقابل سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جاپانی رسم الخط اردو رسم الخط کے مقابلے میں بہت پیچیدہ اور گنجلک ہے۔ اس رسم الخط میں حروف کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے جس کے باعث یہ رسم الخط نہایت پیچیدہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جاپانی لوگ پھر بھی اسے تبدیل کرنے کا نہیں سوچتے اور اسی پیچیدہ اور گنجلک رسم الخط میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور وہاں ملک کے تقریباً سبھی افراد پڑھے لکھے ہیں۔ جبکہ ہمارا یہ حال ہے کہ ہم اردو کے سادہ اور آسان رسم الخط کو بھی پیچیدہ قرار دیتے ہیں اور بار بار اسے بدلنے پر مصر رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں سادہ اور آسان رسم الخط کے باوجود ۱۰۰ میں سے صرف ۱۷ افراد پڑھے لکھے ہیں۔

انشا کو اردو اور جاپانی زبان میں جہاں رسم الخط کے حوالے سے اختلاف نظر آیا وہیں اشتراک کی کئی صورتیں بھی نظر آئیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان دونوں زبانوں کے رسم الخط میں اوپر سے نیچے اور دائیں سے بائیں کی طرف لکھا جاتا ہے اور ان کی کتابیں دائیں ہاتھ سے کھلتی ہیں۔ انشا اردو کے علاوہ پنجابی زبان کا تقابل بھی جاپانی زبان سے کرتے ہیں جس میں انھیں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو نظر آتے ہیں۔ اشتراک کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ لفظ ٹوبہ کو پنجابی اور جاپانی زبان میں ایک ہی لہجے اور تلفظ سے ادا کیا جاتا ہے اور اس نام کی جگہیں جاپان اور پنجاب دونوں میں ہیں۔ البتہ اس لفظ کے معنی دونوں زبانوں میں مختلف ہیں، پنجابی میں اس لفظ کے معنی جوہڑ کے ہیں اور جاپانی زبان میں اس کے معانی پرندے کا پر کے ہیں۔

انشا پاکستانی اور جاپانی باشندوں کا تقابل اس حوالے سے بھی کرتے ہیں کہ ان دونوں ملکوں کے باشندے ایک دوسرے کی زبان پر کتنا عبور رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے انھیں دونوں جانب مکمل اشتراک نظر آتا ہے کیونکہ ان دونوں ملکوں کے باشندے ایک دوسرے کی زبان بالکل نہیں جانتے۔ جاپان قیام کے دوران انھیں اس بات کا اندازہ بھی ہوا کہ جاپانی لوگ انگریزی زبان بالکل نہیں جانتے وہ لوگ تو اعداد کے انگریزی ناموں سے بھی واقف نہیں ہیں جبکہ پاکستانی لوگ جاپانیوں کی نسبت انگریزی زبان سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں۔ اس زبان میں اپنی قوم کی مہارت اور استعداد کو وہ طنز وتنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے ہموطنوں کو کچھ آئے یا نہ آئے لیکن انگریزی ضرور آتی ہے بلکہ اس زبان میں تو ان کی مہارت ایسی ہے کہ خود انگریز بھی ان کی انگریزی سن کر حیران بلکہ پریشان رہ جاتے ہیں۔ انشا کو زبان کے حوالے سے پاکستان اور جاپان کے لوگوں میں یہ اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

جب انشا اردو اور چینی زبان کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں زبانوں کے رسم الخط میں خاصا اختلاف موجود ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ چینی زبان چین کے مختلف علاقوں میں مختلف لہجوں سے بولی جاتی ہے جس کے سبب وہاں کے مختلف علاقوں کے لوگ ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ اگر اس زبان کو لکھا جائے تو اس لکھی ہوئی تحریر کو

چین کے سبھی علاقوں کے لوگ بآسانی سمجھ لیتے ہیں۔ انشا کے نزدیک اس زبان کے حروف الفاظ کی بجائے تصویروں ہی کے شاٹ ہینڈ ہیں۔ اس لئے اس زبان کی مکتوبی صورت کو تو چین کے سبھی علاقوں کے لوگ سمجھ لیتے ہیں البتہ بولتے ہوئے اس زبان کا لہجہ مختلف علاقوں میں مختلف ہو جاتا ہے۔ جبکہ اردو زبان کی صورتحال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ زبان بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے البتہ ان دونوں ملکوں میں اس زبان کا رسم الخط مختلف ہے۔ جس کے سبب بھارت کے رہنے والے پاکستانی رسم الخط میں لکھی ہوئی اردو کو نہیں سمجھ سکتے اور پاکستان میں بسنے والے لوگ بھارتی رسم الخط میں لکھی ہوئی اردو کو نہیں سمجھ سکتے۔

انشا کو اردو اور چینی زبان کے تقابل سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چینی لوگ اردو زبان بولنے میں بہت دقت محسوس کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ کئی الفاظ تو وہ صحیح تلفظ سے ادا ہی نہیں کر سکتے اس لئے وہ ان کے کچھ حصوں کو حذف کرنا شروع کر دیتے ہیں، اسی لئے وہ مجھے صرف مسٹر خان اور جسیم الدین کو الدین ہی کہتے رہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ میرا نام بولتے تو ٹھیک تھے لیکن جب لکھتے تو یہ نام مسٹر ہنسا یا مسٹر انسا بن جاتا تھا۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان کے لفظ مسٹر کا متبادل لفظ صاحب اردو میں بھی موجود ہے البتہ انگریزی زبان میں یہ لفظ اصل نام سے پہلے اور اردو زبان میں اصل نام کے بعد آتا ہے۔ البتہ انھیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ چینی زبان میں اس لفظ کا متبادل لفظ موجود ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو یہ لفظ اصل نام سے پہلے آتا ہے یا بعد میں۔

چین قیام کے دوران انشا کو یہ بھی معلوم ہوا کہ چینی لوگ نہ صرف اردو زبان سمجھ لیتے ہیں بلکہ پاکستان کی دیگر علاقائی زبانوں مثلاً سندھی، پنجابی اور جالندھری کے لہجے کو بھی بآسانی سمجھ لیتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب چین کے ایک ہوٹل میں پیر حسام الدین راشدی، اعجاز بٹالوی اور انشا نے بیرے کو مختلف اشیاء کا آرڈر کبھی پنجابی، کبھی سندھی اور کبھی جالندھری زبان میں دیا اور ہر بار بیرا ان کی مطلوبہ چیز ہی لے کر آیا۔ جس سے انھیں یہ اندازہ ہو گیا کہ چینی لوگ اردو کے علاوہ پاکستان کی دیگر علاقائی زبانوں کو بھی سمجھ لیتے ہیں جب کہ ہم لوگ ان کی زبان نہیں سمجھ سکتے۔

کسی نئی زبان پر مکمل عبور حاصل کرنا اور اس میں استعداد پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ انشا جب اس حوالے سے پاکستان اور چینی باشندوں کی استعداد کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں چینی باشندے پاکستانی باشندوں سے بہتر نظر آتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب چینی باشندے اردو زبان سیکھتے ہیں تو اس پر مکمل عبور حاصل کرتے ہیں اور اس زبان کی تمام باریکیوں سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جب کہ ہم لوگ صرف چند الفاظ سیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس زبان پر مکمل عبور حاصل ہو گیا ہے۔ انشا اس سلسلے میں خود اپنی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ خود میں نے بھی چین کے سفر سے پہلے صرف تین لفظ سیکھ لیے تھے، پہلا نی ہاؤ (یعنی مزاج شریف) دوسرا چاچائی چن (پھر ملیں گے) اور تیسرا لفظ شے شے (یعنی شکریہ شکریہ) اور پھر ان الفاظ کا موقع بے موقع استعمال کر کے میں نے خود چینیوں کو بھی حیران کر دیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ چین قیام کے دوران

مجھے باہمی مکالمت میں کبھی دشواری پیش نہیں آئی کیونکہ اس مقصد کے لیے میں نے ایک خاص طریقہ اپنالیا تھا، وہ طریقہ کار کیا تھا اسے انھوں نے سفرنامہ چلتے ہوتو چین کو چلیئے کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے۔

''ہاں تو چین میں ایسا بھی ہوا کہ ترجمان پاس نہ تھا پھر بھی ہم کو چینیوں سے مکالمت میں کبھی دِقت نہ ہوئی ۔ہم نی ہاؤ کہتے تھے۔اُدھر سے چینی زبان میں کچھ ارشاد ہوتا تھا۔ہم شے شے، شے شے کرتے جاتے حتیٰ کہ اس کی بات ختم ہو جاتی اور ہم چائی چن، چائی چن کر کے رخصت ہو جاتے۔''۳۶

انشا کہتے ہیں کہ میں تو چین صرف چند سرکاری فرائض کی انجام دہی کی غرض سے گیا تھا اس لیے میں نے وقت گزارنے کے لئے صرف چند الفاظ سیکھ لیے لیکن جو پاکستانی وہاں صرف چینی زبان سیکھنے کے لیے گئے تھے ان کا حال بھی مجھ سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ جب میں نے اس زبان میں ان کی استعداد معلوم کرنے کے لئے انھیں چینی زبان کا اخبار پڑھنے کو دیا تو ان ہموطنوں نے صرف چند الفاظ پر انگلی رکھ کر یہ کہہ دیا کہ یہ الفاظ انھیں آتے ہیں۔انشا طنزیہ لہجے میں یہ کہتے ہیں کہ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں مجھے امید ہے کہ کبھی نہ کبھی تو قطرہ قطرہ دریا ضرور بن جائے گا۔ پھر وہ چینیوں کی اردو زبان میں استعداد کی وضاحت میں پیکنگ یونیورسٹی کے طلبا و طالبات کے مثال پیش کرتے ہیں جو نہ صرف بڑی روانی سے اردو بولتے تھے بلکہ اسے لکھنا بھی جانتے تھے، کئی طالب علم ایسے بھی تھے جن کی املا میں ہجوں کی کوئی غلطی نہ تھی اور ان کا خط بھی ہماری نسبت زیادہ پختہ تھا۔اس یونیورسٹی میں اردو کی کتابوں کی ایک لائبریری بھی تھی اس کے علاوہ یہاں جنگ اخبار آتا تھا جس کے مختلف مضامین، اداریوں اور خبروں کو سائیکلو اسٹائل کرا کر طالب علموں کو پڑھنے کے لیے دیا جاتا تھا کہ وہ اس زبان میں مہارت حاصل کر سکیں۔

انشا انڈونیشیا کی زبان کا تقابل بھی اردو زبان سے کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ ان دونوں زبانوں میں اس حوالے سے اشتراک کا پہلو موجود ہے ان پر دوسری زبانوں کے اثرات موجود ہیں۔ اردو زبان پر انگریزی زبان کے اثرات ہیں اور انڈونیشیا کی زبان پر ڈچ زبان کے اثرات۔انشا کے مطابق اب انڈونیشیا کی زبان بھی انگریزی زبان سے قریب ہو رہی ہے جس سے لازماً اس کے تلفظ پر بھی اثر پڑے گا اور ہجوں کی اصلاح بھی ہوگی۔ وہ بتاتے ہیں کہ اردو اور رومن میں OE کی آواز ڈچ زبان کے حساب سے وہی ہے جو U کی ہے البتہ جو کتابیں نئی شائع ہو رہی ہیں ان میں U ہی ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان کے لوگ سوکارنو کو سویکارنو اس لئے لکھتے ہیں کہ رومن حروف میں SOEKARNO ہی لکھا جاتا ہے۔ البتہ جب سوکارنو صاحب کو دستخط کرنا ہوں گے تو نیچے انگریز ٹائپ میں SUKARNO ہی لکھا ہوگا لیکن دستخط میں OE کو برقرار رکھتے ہوں گے۔

اس کے بعد انشا پاکستان، انڈونیشیا اور ملائیشیا کی زبان کا تقابل کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ پاکستان کی قومی زبان اردو اور انڈونیشیا کی زبان انگریزی زبان سے قریب ہونے کے باعث رومن رسم الخط کو اپنا رہی ہے، جبکہ ملائیشیا میں

عربی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔اس کے علاوہ ان تینوں ممالک کی زبانوں میں یہ اشتراک بھی ہے کہ ان میں ہندی، سنسکرت الاصل الفاظ اور عربی الفاظ موجود ہیں البتہ ان تینوں زبانوں میں فرق یہ ہے کہ ملائیشیا میں رسم الخط عربی ہے اور پاکستان اور انڈونیشیا میں رومن۔

انؔشا پاکستان اور انڈونیشیا کی زبان میں عرب اور ہندی الفاظ کی موجودگی کے حوالے سے موجود اشتراک کو سفر نامہ دنیا گول ہے کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں۔

''حاصل۔واجب۔مکان۔عمر۔کتاب۔عموم وغیرہ ان سب ناموں سے ہمارے کان آشنا ہیں۔دنوں کے نام تو خالص عربی ہیں۔پیر کو اثنین کہتے ہیں منگل ثلاثہ ہے۔بدھ رابع، جمعرات خامس اور جمعہ کو جمعہ لکھا اور بولا جاتا ہے۔ہفتے کو سبتو کہتے ہیں۔اتوار کے لیے البتہ عربی لفظ احد بھی استعمال ہوتا ہے اور مقامی لفظ منگو بھی۔کچھ اور الفاظ سنئے: زبان، فقیر، مشاورت، تعلیم، قلم، تقوے، مسکین، عادۃ وغیرہ ہندی اثرات کے ثبوت ہیں روتی (روٹی) مریچا (مرچ) اور دُوت سفیر کو پیش کیا جاسکتا ہے۔''۳۷

یوں انؔشا کو پاکستان، انڈونیشیا اور ملائیشیا کو زبان کے تقابل میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

انؔشا نے پاکستان اور کوریا کی زبان کا تقابل بھی کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان دونوں زبانوں میں عربی اور ہندی زبان کے الفاظ موجود ہیں اور یوں ان دونوں زبانوں کے الفاظ کی موجودگی کے باعث انھیں پاکستان اور کوریا کی زبان میں بھی اشتراک کا پہلو نظر آیا۔اس بات کا اندازہ انھیں اور ان کے دوست باری صاحب کو کوریا سے تعلق رکھنے والی ایک ائرہوسٹس سے بات چیت کر کے ہوا۔وہ بتاتے ہیں کہ جب میں نے اس ائرہوسٹس سے پوچھا کہ آپ کی زبان میں شکریہ ادا کرنے کے لئے کون سے الفاظ استعمال ہوتے ہیں تو اس نے بتایا کہ ہماری زبان میں خمسہ حمیدہ کا لفظ اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔پھر انھوں نے خیریت دریافت کرنے کا مترادف پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کے لئے اینو ہاشم جیسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔جب انؔشا نے ان الفاظ کا تجزیہ کیا تو انھیں پتا چلا کہ ان الفاظ میں سے تو آدھے لفظ ہندی زبان کے اور آدھے عربی زبان کے ہیں۔یوں انھیں کو اردو اور کوریائی زبان میں عربی اور ہندی الفاظ کی موجودگی کے حوالے سے اشتراک کی صورت نظر آئی۔

انؔشا نے افغانستان قیام کے دوران پاکستان اور افغانستان کی زبان کا تقابل بھی کیا۔اس تقابل سے ان پر یہ حقیقت کھلی کہ یہ دونوں ہی قومیں ایک دوسرے کی زبان سے بالکل ناواقف ہیں۔اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ کابل قیام کے دوران مجھے کئی بار مقامی محاورے سے عدم واقفیت نے منفی صورتحال سے دوچار کر دیا۔ایک بار میں کسی سنجیدہ مسئلے پر اظہار خیال کر رہا تھا کہ کسی صاحب نے کہہ دیا بلے بلے گپ بزیند یعنی ہاں ہاں گپ مارو۔یہ الفاظ سنتے ہی میں تو آپے سے باہر ہو گیا لیکن بعد میں پتا چلا کہ وہاں کے مقامی محاورے میں اس کا مطلب ہے ارشاد فرمائیے یوں ان

الفاظ سے کسی کی توہین کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔

بہر حال انشا کو زبان کے حوالے پاکستان، مشرق بعید اور کئی دیگر ممالک میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

فنون لطیفہ

انسانی جذبات اور احساسات کے اظہار کے کئی ذرائع ہیں جن میں موسیقی، مصوری، ثقافتی، مجسمہ سازی، فن تعمیر اور شاعری شامل ہیں۔ فنون لطیفہ کسی ملک کی پہچان ہوا کرتے ہیں جو درحقیقت اس ملک میں بسنے والی قوم کے ذوق جمال کی عکاسی کرتے ہیں۔ انشا نے دوران سیاحت مختلف ممالک کے فنون لطیفہ کا نہ صرف مشاہدہ کیا بلکہ ان کا تقابل پاکستان کے فنون لطیفہ سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو اپنے سفرناموں میں بیان کر دیا۔ پاکستان اور دیگر ممالک کے فنون لطیفہ کے تقابل کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

فن مصوری، نقاشی اور ظروف سازی:

انشا نے چین قیام کے دوران وہاں کے شاہی محلات کی سیر بھی کی۔ ان محلات میں انھوں نے فن مصوری، نقاشی اور ظروف سازی کے نمونے ایک بڑی تعداد میں دیکھے۔ جب وہ فنون لطیفہ کے ان ذخیروں کا تقابل اپنے ہاں کے ایرانی اور راجپوت مصوری کے نمونوں سے کرتے ہیں تو انھیں چینی فنون لطیفہ کے نمونے پاکستانی فنون لطیفہ سے معیار اور مقدار دونوں لحاظ سے زیادہ بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ یوں انشا کو پاکستان اور چین کے فنون لطیفہ میں مقدار اور معیار دونوں حوالوں سے صرف اختلاف کا پہلو ہی نظر آیا ہے۔

ماسک یا نقاب سازی:

ماسک یا نقاب سازی کا شمار بھی فنون لطیفہ میں ہی ہوتا ہے۔ فنون لطیفہ کی اس شاخ کو دنیا کے کئی ممالک میں تو بہت پزیرائی حاصل ہوئی لیکن پاکستان میں اس فن کو سراہنے کی بجائے اس میں منفی پہلو تلاش کیے جاتے ہیں۔ سری لنکا میں تو اس فن کو عوامی آرٹ کی حیثیت حاصل ہے اور یورپ کے لوگ تو ان لوگوں کے فنی نمونوں کو دیکھنے اور سراہنے کے لیے خود سری لنکا آتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس فن کی قدر افزائی کرنا تو درکنار اسے بچوں کو ڈرانے کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ یوں انشا کو نقاب یا ماسک سازی کی پذیرائی کے حوالے سے یورپ اور سری لنکا میں تو اشتراک نظر آیا لیکن پاکستان میں اسی حوالے سے اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

فن تعمیر:

فنِ تعمیر سے بھی کسی قوم کے ذوقِ جمال کا اندازہ ہوتا ہے۔فن تعمیر میں بلند و بالا عمارات کو ایک شاہکار سمجھا جاتا ہے۔انشا نے فن تعمیر کی اس جہت کے حوالے سے جب پاکستان اور چین کا تقابل کیا تو انھیں یہ پتا چلا کہ اس حوالے سے چین کو پاکستان پر برتری حاصل ہے۔وہ کہتے ہیں کہ بلند و بالا عمارات یوں تو پاکستان میں بھی موجود ہیں لیکن چین میں ایسی عمارات اول تو تعداد میں زیادہ ہیں اور دوسرے یہ پاکستان میں موجود عمارات کے مقابلے میں زیادہ بلند ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں اسٹیٹ بنک اور نیشنل بنک کی عمارت کو بلند و بالا عمارات میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اگر ان عمارات کا تقابل چین کی بلند عمارات سے کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ان کی ایک عمارت میں پاکستان کی ایسی کئی بلند عمارات سما سکتی ہیں۔یوں انھیں یہ معلوم ہوا کہ فن تعمیر خصوصاً بلند و بالا عمارات کی تعمیر کے حوالے سے چین کو پاکستان پر برتری حاصل ہے اور اس حوالے سے ان دونوں ممالک میں اختلاف کا پہلو موجود ہے۔

انڈونیشیا قیام کے دوران انشا نے وہاں کے فن تعمیر کا بھی بڑے قریب سے مشاہدہ کیا۔انھوں نے اس بات کا اندازہ لگایا کہ وہاں کے فن تعمیر پر ہندو اثرات نمایاں ہیں۔اس کی وجہ ان کی نزدیک یہ تھی کہ وہاں اسلام چھٹی یا ساتویں صدی میں آیا تھا اور اس سے پہلے تک وہاں ہندو بادشاہوں کی حکومت تھی۔جس کی وجہ سے فن تعمیر سمیت فنون لطیفہ کی دیگر تمام شاخوں پر بھی ان کے اثرات غالب رہے لیکن اب وہاں کے فن تعمیر پر مغربی اثرات اپنا اثر دکھا رہے ہیں۔جب انشا ان دونوں اسلامی ممالک میں تعمیر ہونے والی مساجد کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں ممالک کی مساجد میں اختلاف کا پہلو نظر آتا ہے،اس اختلاف کو وہ سفرنامہ *دنیا گول ہے* کے درج ذیل میں حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں۔

> ''مسجدوں کا طرز تعمیر بھی وہاں ہم سے الگ ہے۔بیچ گنبد تو خاصا بڑا ہوتا ہے بلکہ نصف کُرے سے زیادہ لیکن کونوں کے منارے اونچے ہوتے ویسے مسجدیں بھی ایک وضع کی نہیں،کئی وضعوں کی دیکھنے میں آئیں۔''[۳۸]

موسیقی:

انسانی جذبات کے اظہار کا ایک ذریعہ موسیقی بھی ہے۔دنیا کے اکثر ممالک کے لوگ موسیقی سے حظ اٹھاتے ہیں۔کسی بھی فن کو پروان چڑھانے کے لئے اس کے فنکاروں کی پذیرائی بہت ضروری سمجھی جاتی ہے۔انشا اس فن سے وابستہ فنکاروں کی پذیرائی کے حوالے سے جب پاکستان اور دنیا کے دیگر ممالک کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان اور قازقستان میں گلوکاروں کو سراہنے کی رسم موجود ہے۔پاکستان میں گلوکاروں کو پیسے دیئے جاتے ہیں جنھیں بیل کہا جاتا ہے اور قازقستان میں اس مقصد کے لیے پھولوں اور تالیوں سے مدد لی جاتی ہے۔انشا کو اس کا اندازہ قازقستان میں ایک کنسرٹ دیکھ کر ہوا جہاں مغربی لباس کی نمائش کے ساتھ ساتھ نغمے بھی گائے جا رہے تھے۔اس کنسرٹ میں اچھا گانے

والوں کو سراہنے کے لئے پھولوں اور تالیوں کا تحفہ پیش کیا جا رہا تھا۔ یوں انؔشا کو پاکستان اور قازقستان میں فنکاروں کو پذیرائی کے حوالے سے اشتراک کی صورت نظر آئی۔

شاعری:

انسانی جذبات کے اظہار کے کئی طریقے ہیں جن میں ایک اہم ذریعہ شاعری بھی ہے۔ ہر فن کی طرح شاعری کو پروان چڑھانے کے لیے بھی شعراء کی تحسین و تعریف ضروری ہے۔ انؔشا شعراء کی قدر و منزلت کے حوالے سے پاکستان اور سنگاپور کے لوگوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ جان کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ سنگاپور میں تو شعراء کو بہت عزت و احترام دیا جاتا ہے لیکن پاکستان میں ایسا نہیں کیا جاتا۔ پھر وہ اس حوالے سے پاکستان اور انڈونیشیا کا تقابل بھی کرتے ہیں تو یہاں بھی انھیں شعراء کی قدر منزلت دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک بار مجھے جکارتہ کی گیروڈا ائر لائن سے سفر کرنا تھا اور مجھے تقریباً ۲۰ منٹ کی تاخیر ہوگئی۔ میں یہ سمجھا کہ شاید جہاز روانہ ہو چکا ہوگا لیکن جب میں ائیرپورٹ پہنچا تو جہاز کو وہیں کھڑا دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ البتہ بعد میں جب مجھے بتایا گیا کہ یہ تاخیر صرف میرے ہی اعزاز میں کی گئی تھی تو یہ سن کر بجائے خوش کے مجھے افسوس ہوا کیونکہ اپنے ملک میں مجھے ایک بار صرف پانچ منٹ کی تاخیر ہوگئی تو پی آئی اے والوں نے جہاز کے دروازے بند کر کے سیڑھی کھینچ لی تھی۔ میں نے ان سے جب بے مروتی کی وجہ پوچھی اور خود کو بطور شاعر خصوصی رعایت کا حقدار ثابت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم لوگ تو کسی لاٹ صاحب کے لئے بھی جہاز کے وقت میں تاخیر نہیں کرتے، یہ شاعر کس چیز کا نام ہے۔ اس کے بعد انؔشا شعراء کی قدر افزائی کے حوالے سے پاکستان اور فلپائن کے لوگوں کے طرز عمل کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں اشتراک کا پہلو نظر آتا ہے۔ وہ یوں کہ ان دونوں ملکوں کے لوگ اپنے شعراء کی قدر نہیں کرتے حتیٰ کہ ان کا کلام تک سننے کے روادار نہیں ہوتے البتہ باہر سے اگر کوئی شاعر آ جائے تو اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، اس کا کلام بڑے شوق سے سنتے ہیں اور مکرر مکرر کہہ کر اس کی عزت افزائی کرتے ہیں۔ انؔشا بتاتے ہیں کہ کراچی میں کوئی میرا کلام سننے کو تیار نہ تھا لیکن منیلا میں لوگوں نے فرمائش کر کر کے میرا کلام سنا بلکہ میرے دوست جی الانا صاحب کو تو انھوں نے ملک الشعراء کا خطاب بھی دے دیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ مجھے بھی وہاں کئی مشاعروں میں مہمان خصوصی بننے کا شرف بخشا گیا حالانکہ کئی مقامی شعراء کا کلام مجھ سے کہیں بہتر تھا، لیکن مجھے پاکستانی شاعر ہونے کے باعث ساری عزت و تکریم کا حقدار ٹھہرایا گیا۔ اس کے بعد انؔشا منیلا میں منعقد کیے گئے مشاعروں میں شامل سامعین کا احوال بڑے مضحکہ خیز انداز میں سفرنامہ *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* میں یوں بیان کرتے ہیں۔

''اتنے بڑے مشاعروں میں پڑھنے کا بھی یہ ہمارا پہلا موقع تھا۔ ایک روز تو تیس آدمی تھے۔ ایک روز اس

سے بھی زیادہ۔ اگر ہم غوری کی تین سالہ بچی کو جو جاگ رہی تھی اور دو سالہ بیٹے کو جو سو رہا تھا شامل کر لیں تو پورے پچاس سامعین تھے۔ پاس والے گھر میں رہنے والے چاہے ہماری زبان نہ جانتے تھے، فلپائن کے مقامی باشندے تھے لیکن ہماری گرجدار اور کھرج دار آواز ان کے کانوں تک پہنچتی ہوگی۔ اگر آپ شعر سمجھنے کی شرط نہ لگائیں تو اس طرح سامعین کی تعداد ستر بہتر گنی جاسکتی ہے۔ یہ شرط بھی نہیں لگنی چاہیے کیونکہ آپ کی زبان سمجھنے والوں میں بھی سارے لوگ شعر سمجھنے والے نہیں ہوتے۔ مرد ہوں تو ٹک ٹک دیکھتے رہتے ہیں عورتیں ہوں تو سوئیٹر بنتی رہتی ہیں۔'' ۳۹

بہر حال انشا کو پاکستان اور فلپائن کے لوگوں کے طرز عمل میں یہ اشتراک نظر آیا کہ دونوں ہی اپنے ملک کے شعراء کی تو قدر نہیں کرتے لیکن بیرونی ممالک کے شعراء کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔

شاعری دلی جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہے لیکن یہ اظہار کسی نہ کسی ہیت یا سانچے کو اختیار کر کے ہی کیا جاتا ہے۔ انشا نے چینی نظموں کے تراجم بھی کیے، جب وہ ان تراجم کا تقابل پاکستانی شاعری سے کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ملکوں کے شعراء نے بارہ ماسہ کی ہیت میں طبع آزمائی کی ہے۔ چینی نظموں کے تراجم میں ایک نوحہ بھی شامل ہے جو ایک چینی خاتون مینگ چیانگ نے اپنے شوہر دان جی کے غم میں کہا، جو دیوار چین کی تعمیر میں مارا گیا تھا۔ یہ نوحہ بارہ بندوں پر مشتمل تھا اور اس میں بارہ ماسے کی ہیت کو اختیار کیا گیا تھا۔ اس نوحے میں دسمبر سے جنوری تک کے مختلف موسموں کی کیفیت کو بیان کیا گیا تھا، اسے چینی لوک ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

ذیل میں اس نوحے میں سے نمونہ کلام پیش کیا جا رہا ہے۔

''آج پورا ہے بستی کا ہر خانداں
ایک میرا ہی دل زار و مہجور ہے
دان کو لے گئے ہیں وہ بیگار میں
اب وہ دیوارِ اعظم کا مزدور ہے
میرے دل کو بے کلی کھا گئی
جنوری آ گئی ! '' ۴۰

انشا بتاتے ہیں کہ پاکستان میں بھی پنجابی، سندھی اور اردو شاعری میں بارہ ماسے موجود ہیں بلکہ سلام مچھلی شہری کے لکھے ہوئے ایک بارہ ماسے کو تو اردو ادب میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ یوں انشا کو پاکستان اور چین کی شاعری کے تقابل سے یہ پتا چلا کہ ان دونوں ملکوں کی شاعری میں بارہ ماسے کی ہیت کو اظہار خیال کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔

اس کے بعد انشا پاکستان اور بھارت کی شاعری کا تقابل کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ دوہا وہ صنف شاعری ہے

جو پاکستان اور بھارت دونوں کی شاعری میں موجود ہے۔ البتہ اس صنف شاعری کے حوالے سے جب وہ بھارتی شاعر کبیر اور پاکستانی شاعر جمیل الدین عالی کا تقابل کرتے ہیں تو جمیل الدین عالی انھیں کبیر سے زیادہ بہتر دوہا کہنے والے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ کبیر کے دوہے تو صرف پند و نصیحت کے موضوعات پر مبنی تھے لیکن جمیل الدین کی موضوعاتی رنگارنگی کی بابت وہ بتاتے ہیں کہ جو بات میرے دل میں ہوتی تھی وہ ان کی زبان پر ہوتی تھی بلکہ کئی بار تو میرے دل سے بھی پہلے ان کی زبان پر آجاتی تھی۔ یوں انشا نے ثابت کیا کہ جمیل الدین عالی نہ صرف کبیر سے اچھے دوہے کہتے ہیں بلکہ ان کے دوہے موضوعاتی اعتبار سے بھی کبیر سے بہتر ہیں۔ ذیل میں کبیر کے دوہوں سے نمونہ کلام کے اشعار ہیں۔

''سبد سبد کوئی کہے سبد کے ہاتھ نہ پاؤں
ایک سبد اوشدھ کرے ایک سبد کر گھاؤ''[41]

''متا ہمارا منتر ہے ہمسا ہوئے سو لیے
سبد ہمارا کلپ ترو جو چاہے سو دیئے''[42]

''وہ موتی مت جانیے پُہے پوت کے ساتھ
یہ تو موتی سبد کا بیدھ رہا سب گات''[43]

ذیل میں جمیل الدین عای کے دوہوں سے اشعار

''بول ہزاروں روپ پھرے ہر دھرم ہے میرا بیت
نامری بانی غزل ہے پیارے، نا دوہے نا گیت''[44]
''اردو والے ہندی والے دونوں ہنسی اڑائیں
ہم دل والے اپنی بھاشا کس کس کو سکھلائیں''[45]

''ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے''[46]

الغرض، انشا نے مشرق بعید کے ممالک کی سیاحت کے دوران پاکستان، مشرق بعید اور کئی دیگر ممالک کی معاشرت کا تقابل مختلف حوالوں سے کیا۔ اس تقابل میں انھیں پاکستان، مشرق بعید اور کئی دیگر ممالک میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

☆☆☆☆

حواشی وحوالہ جات

۱۔ ابن انشا، چلتے ہو تو چین کو چلیے، طبع سوم، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۲۰۱۰ء ص، ۱۱، ۱۲

۲۔ ابن انشا نگری نگری پھرا مسافر، طبع دہم، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۹ء ص ۸۹

۳۔ ابن انشا، دنیا گول ہے، طبع، بست و یکم، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۹۱ء، ص، ۱۴۳

۴۔ ایضاً ص، ۲۱۷

۵۔ انشا کے سفرنامہ دنیا گول ہے میں ہے میں طباعت کی غلطی کے باعث اس لفظ کے دو املاء منورہ اور منوڑہ ملتے ہیں ۔ درست لفظ منوڑہ ہے لیکن اس حوالے میں اس لفظ کا املاء منورہ ہے اسی لئے اسی کو اختیار دیا گیا ہے۔

۶۔ انشا کے سفرنامہ دنیا گول ہے میں طباعت کی غلطی کے باعث اس لفظ کے املاء کیماری اور کیماڑی دونوں ملتے ہیں ۔ درست لفظ کیماڑی ہے لیکن حوالے میں چونکہ اس لفظ کا املاء کیماری ہے اس لئے اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

۷۔ ایضاً ص، ۸۱

۸۔ ابن انشا، ابن بطوطہ کے تعاقب میں، طبع سیز دہم، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۹۱ء ص، ۱۶۲

۹۔ ابن انشا، دنیا گول ہے، طبع، بست و یکم، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۱ء ص، ۲۳۵

۱۰۔ ابن انشا، ابن بطوطہ کے تعاقب میں، طبع، سیز دہم، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۹۱ء، ص ۸۴

۱۱۔ ایضاً ص، ۱۷۲، ۱۷۳

۱۲۔ ایضاً ص، ۱۳۱

۱۳۔ ابن انشا، دنیا گول ہے، طبع بست و یکم، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۱ء، ص ۵۹

۱۴۔ ابن انشا، ابن بطوطہ کے تعاقب میں، طبع، سیز دہم، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۹۱ء، ص ۸۳

۱۵۔ ایضاً ص، ۱۰۶

۱۶۔ ابن انشا، چلتے ہو تو چین کو چلیے طبع سوم، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۲۰۱۰ء ص، ۲۷

۱۷۔ ابن انشا، ابن بطوطہ کے تعاقب میں، طبع سیز دہم، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۹۱ء، ص، ۱۲۶، ۱۲۷

۱۸۔ ایضاً ص، ۱۸۱

۱۹۔ ابن انشا،دنیا گول ہے،طبع بست ویکم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۲۰۰۱ء،ص،۱۳۳

۲۰۔ ابن انشا،ابن بطوطہ کے تعاقب میں،طبع سیزدہم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۱۹۹۱ء،ص۴۳

۲۱۔ ابن انشا،نگری نگری پھرا مسافر،طبع دہم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۲۰۰۹ء،ص،۱۱۴

۲۲۔ ابن انشا،دنیا گول ہے،طبع بست ویکم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۲۰۰۱ء،ص،۵۶

۲۳۔ ابن انشا،ابن بطوطہ کے تعاقب میں،طبع سیزدہم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۱۹۹۱ء،ص،۲۰۰

۲۴۔ ابن انشا،نگری نگری پھرا مسافر،طبع دہم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۲۰۰۹ء،ص،۱۳۲

۲۵۔ ایضاً ص،۷۰

۲۶۔ ابن انشا،ابن بطوطہ کے تعاقب میں،طبع سیزدہم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۱۹۹۱ء،ص،۱۰۸،۱۰۹

۲۷۔ ابن انشا،چلتے ہو تو چین کو چلیئے،طبع سوم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۲۰۱۰ء،ص،۶۰

۲۸۔ ابن انشا،دنیا گول ہے،بست ویکم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۲۰۰۱ء،ص،۱۳۵

۲۹۔ ابن انشا،نگری نگری پھرا مسافر،طبع دہم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۲۰۰۹ء،ص،۶۶

۳۰۔ ابن انشا،ابن بطوطہ کے تعاقب میں،طبع سیزدہم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۱۹۹۱ء،ص،۱۳۲

۳۱۔ ایضاً ص،۱۸۹

۳۲۔ ایضاً ص،۹۵

۳۳۔ ایضاً ص،۱۷۶

۳۴۔ ایضاً ص،۲۰۳

۳۵۔ ابن انشا،چلتے ہو تو چین کو چلیئے،طبع سوم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۲۰۱۰ء،ص،۱۶۰

۳۶۔ ایضاً ص،۴۱

۳۷۔ ابن انشا،دنیا گول ہے،طبع بست ویکم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۲۰۰۱ء،ص،۷۶

۳۸۔ ایضاً ص،۷۵

۳۹۔ ابن انشا،ابن بطوطہ کے تعاقب میں،طبع سیزدہم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۱۹۹۱ء،ص،۹۹،۱۰۰

۴۰۔ ریاض احمد،ڈاکٹر،ابن انشا احوال وآثار،طبع اول،کراچی،انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۸۸ء،ص،۸۵۶

۴۱۔ ہری اودھ(مترجم: سرسوتی سرن کیف)،بھگت کبیر فلسفہ وشاعری،لاہور،فکشن ہاؤس،۲۰۰۲ء،ص،۲۷

۴۲۔ ایضاً ص،۲۷

۴۳۔ ایضاً ص،۲۷

۴۴۔ جمال، پانی پتی (انتخاب وترتیب)، عالی کلام،طبع اول، کراچی، اکادمی بازیافت،۲۰۰۲ء،ص،۹۹

۴۵۔ ایضاً ص،۱۰۱

۴۶۔ ایضاً ص،۹۵

باب سوئم

مشرقِ وسطیٰ کے سفرنامے

انشا نے اپنے سرکاری فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر اختیار کیا۔ ان ممالک کے سفر کے دوران جہاں انھوں نے مشرق بعید کے ممالک کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا وہیں مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کی سیاحت کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ گو کہ ان کی دفتری مصروفیات کچھ ایسی تھیں جن کے سبب ان کی سیر وسیاحت کا دائرہ کار زیادہ تر مشرق بعید اور یورپی ممالک کے گرد ہی رہا جہاں انھیں مختلف سیمیناروں، کانفرنسوں، میلوں اور نمائشوں میں شرکت کی غرض سے جانا پڑا۔ البتہ جب بھی ان کی دفتری مصروفیات نے انھیں مشرق وسطیٰ کے ممالک کی سیاحت کا موقع فراہم کیا تو انھوں نے بحیثیت مسلمان ان ممالک کے سفر اور سیاحت میں خصوصی شوق اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ مشرق وسطیٰ وہ خطۂ ارض ہے جس میں ایران، عراق، مصر، لبنان، ترکی اور شام جیسے مسلم ممالک شامل ہیں۔ ان ممالک کی سیاحت کے دوران جب انھوں نے ان ممالک کی معاشرت کا مطالعہ ومشاہدہ کیا تو انھیں یہ جان کر بڑی حیرانی ہوئی کہ پاکستان اور ان مسلم ممالک کی معاشرت میں بھی اشتراکات اور اختلافات کے پہلو موجود ہیں۔ یہ اشتراکات اور اختلافات صرف تہذیب وثقافت، لباس، زبان، موسم اور آب وہوا، فنون لطیفہ، سماجی واخلاقی قدروں، رہن سہن، عادات واطوار اور دیگر حوالوں تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ مذہبی اعتبار سے بھی ہیں۔ حالانکہ مذہبی اعتبار سے بحیثیت مسلمان انھیں پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک میں اشتراکات کی توقع تو تھی لیکن اختلافات کی توقع ہرگز نہ تھی۔ بہر حال انشا نے مشرق وسطیٰ کے ممالک کے سفر اور سیاحت کے دوران ان مسلم ممالک کی معاشرت کا مطالعہ ومشاہدہ بڑی گہرائی سے کیا ان کا تقابل پاکستانی معاشرت سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی تاکہ ہم ان اسلامی ممالک کو بہتر طور پر جان سکیں۔ انھوں نے ان ممالک کے سفر کے دوران جو معلومات اور کوائف حاصل کیے وہ نہ صرف مسافروں اور سیاحوں کے لیے معاون ثابت ہو سکتے ہیں بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی دلچسپی کا سامان فراہم کر سکتے ہیں جو کسی وجہ سے ان ممالک میں جا تو نہیں سکتے البتہ ان سفرناموں کو پڑھ کر گھر بیٹھے ان ممالک کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم نے ابن انشا کے سفرناموں کی روشنی میں پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کی معاشرت کا تقابل مطالعہ جس عنوانات کے تحت کیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

موسم آب وہوا، آبادی، باشندے، لباس، خوراک، عادات واطوار، اخلاقی اقدار، سماجی اقدار، رہن سہن، بازار، ہوٹل، سڑکیں، ڈاک کا نظام، معاشی نظام، ذرائع آمد ورفت، مذہب، فنون لطیفہ، زبان

ذیل میں ان تمام عنوانات کا تقابلی مطالعہ الگ الگ پیش کیا جا رہا ہے۔

موسم اور آب وہوا

کسی شہر یا ملک کی انفرادیت میں کبھی کبھی وہاں کے موسم اور آب وہوا جیسے عوامل کا بھی بہت عمل دخل ہوتا ہے کیونکہ دنیا کے چند مقامات ایسے بھی ہیں جو صرف اپنے مخصوص موسم اور آب وہوا کی وجہ ہی سے مشہور ہیں۔ بعض مقامات ایسے ہیں جہاں شدید گرمی پڑتی ہے اور بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں شدید سردی پڑتی ہے۔ یوں ان مقامات کا موسم ہی ان کی انفرادیت کا سبب بن جاتا ہے۔ آنشا کو مشرق وسطیٰ کے موسم اور آب وہوا کا تجربہ اور مشاہدہ کرنے کا موقع بھی ملا اور انھوں نے اس خطے کے موسم اور آب وہوا کا تقابل پاکستان کے موسم وآب ہوا سے کر کے ان کے درمیان اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کرنے کی کوشش بھی کی۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو بیان کیا جا رہا ہے۔

آنشا کو ان کی کاروباری مصروفیات نے ایران کے سفر کا موقع بھی فراہم کیا اور یوں انھیں وہاں کے موسم اور آب و ہوا کا تجربہ کرنے کا اتفاق بھی ہوا۔ جب وہ پاکستان کے شہر کراچی کے موسم کا تقابل ایران کے شہر طہران کے موسم سے کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں شہروں کے موسم میں گرمی کی شدت کے حوالے سے کافی حد تک اشتراک کا پہلو نظر آتا ہے۔ اس بات کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب انھوں نے موسم گرما میں ایران کا سفر اختیار کیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک بار میں پہلے بھی ایران آیا تھا لیکن ان دنوں یہاں موسم سرما کا دور دورہ تھا۔ یہاں پڑنے والی شدید سردی سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے مجھے کسی نے برف خانے میں رکھ دیا ہو۔ میں نے قیاس کر لیا کہ اگر یہاں موسم سرما میں اتنی شدید ترین سردی پڑ سکتی ہے تو موسم گرما میں بھی یہاں اگر شدید سردی نہیں تو کم از کم ایسا موسم ضرور ہوتا ہوگا جو یقیناً سرد ہوگا۔ لہٰذا ایران روانہ ہونے سے پہلے میں نے مختلف قسم کے گرم اور اونی کپڑوں کا انتظام کر لیا تاکہ وہاں کے سرد موسم سے بچاؤ ممکن ہو سکے اور کسی قسم کی ناقابل برداشت صورتحال سے بھی دوچار نہ ہونا پڑے۔ آنشا بتاتے ہیں کہ میں ایران میں پڑنے والی شدید سردی سے اس قدر خوفزدہ تھا کہ وہاں روانہ ہونے سے پہلے ہی میں نے گرم کپڑے پہن لیے تاکہ دوران سفر بھی کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے لیکن پورے سفر کے دوران نہ تو موسم میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی واقع ہوئی اور نہ ہی مجھے سردی کا احساس ہوا۔ بلکہ جو گرم اور اونی کپڑے میں نے زیب تن کر رکھے تھے ان کے سبب مجھ پر بے چینی اور گھبراہٹ کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اتنے میں جہاز طہران ایئرپورٹ پہنچ گیا۔ جب میں جہاز سے باہر آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ طہران کا موسم تقریباً کراچی جیسا ہی ہے، یعنی خاصا گرم۔ وہ بتاتے ہیں کہ گرم موسم اور اونی کپڑوں میں ملبوس ہونے کے باعث میری حالت غیر ہو رہی تھی لہٰذا میں نے ان گرم اور اونی کپڑوں سے چھٹکارا پانے کے لیے ہوٹل کی طرف دوڑنا شروع کر دیا اور وہاں پہنچ کر سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ جو بھاری بھرکم اونی کپڑے میں نے پہن رکھے تھے ان کو اتار پھینکا اور پھر کہیں جا کر

سکون کا سانس لیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایران روانہ ہونے سے پہلے جو گرم اور اونی ملبوسات میں نے اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے وہ وہاں قیام کے دوران جوں کے توں پڑے رہے اور ذرا بھی کام نہ آسکے۔ یوں انشا کو طہران اور کراچی کے موسم کے تقابل میں گرمی کی شدت کے حوالے سے اشتراک کا پہلو موجود ہے۔ اس تقابل کو انھوں نے جس مزاحیہ لب و لہجے میں بیان کیا ہے وہ قابل داد ہے۔

آبادی

ہماری زمین پر اربوں کی تعداد میں لوگ آباد ہیں جن کی تعداد کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یوں تو دنیا کے مختلف ممالک میں لوگ آباد ہیں لیکن ہر جگہ آبادی کا تناسب یکساں نہیں ہے، کسی علاقے میں زیادہ لوگ آباد ہیں تو کسی میں کم۔ دنیا کے کچھ ممالک ایسے بھی ہیں جن کی انفرادیت کا باعث صرف ان کی آبادی ہی ہے کیوں کہ کئی ممالک کی انفرادیت کا سبب صرف وہاں کی آبادی کا زیادہ ہونا ہے اور کئی ممالک کی انفرادیت کا سبب صرف وہاں کی آبادی کا کم ہونا ہے۔ انشا کسی ملک کی ترقی و خوشحالی میں وہاں کی آبادی کے تناسب کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مشرق وسطیٰ کے ممالک کے سفر کے دوران روداد سفر کے ساتھ ساتھ جہاں دیگر اشیاء و مظاہر کے مطالعہ کو اہمیت دی وہیں اس خطے کے بعض ممالک کی آبادی کے متعلق معلومات بھی حاصل کیں اور پھر ان حاصل شدہ معلومات اور کوائف کا تقابل پاکستان کی آبادی اور اس سے متعلقہ امور و مسائل سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ البتہ اس تقابلی مطالعے میں وہ خود کو کسی ایک جغرافیائی حدود کا پابند نہیں کر سکے یہی وجہ ہے کہ پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے ساتھ ساتھ وہ کئی دیگر ممالک کو بھی اس تقابلی مطالعے کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو بیان کیا جا رہا ہے۔ جو آبادی کے حوالے سے انھیں پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کے درمیان نظر آئے۔

انشا نے مشرق وسطیٰ کے ممالک میں ایران کو بطورِ خاص اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ انھیں متعدد بار ایران جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں قیام کے دوران انھوں نے وہاں کی آبادی کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ گو کہ یہ معلومات کسی سروے کا نتیجہ نہیں تھیں اور نہ ہی ان معلومات کو مقداری انداز میں بیان کیا گیا تھا بلکہ یہ معلومات صرف ان کے ذاتی تجربے، مشاہدے اور اندازے پر مبنی تھیں۔ اس سلسلے میں وہ پاکستان کے شہر لاہور، بھارت کے شہر دہلی اور ایران کے شہر اصفہان کی آبادی کا تقابل کرتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اصفہان کی آبادی، لاہور اور دہلی دونوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ آبادی کے کم ہونے کا اندازہ انھوں نے اس بات سے لگایا کہ وہاں کے بازاروں میں بھی انھیں لوگوں کی بھیڑ بھاڑ نظر نہ آئی حالانکہ کسی بھی جگہ کے بازار وہاں پر لوگوں کی آمد و رفت، چہل پہل اور بھیڑ بھاڑ کا مرکز سمجھے جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عام طور پر کسی جگہ کی آبادی کا اندازہ وہاں کے بازاروں میں موجود لوگوں کی تعداد سے ہی لگایا جا سکتا

ہے اگر کسی جگہ کے بازار آباد ہوں تو سمجھئے کہ وہاں لوگوں کی تعداد ضرور زیادہ ہوگی اور اگر کسی جگہ کے بازار ہی ویران اور بے رونق نظر آئیں تو جان جائیے کہ یقیناً یہاں کی آبادی ہی کم ہوگی۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اگر اصفہان شہر کے بازار ویران اور بے رونق ہیں تو یقیناً یہاں کی آبادی بھی کم ہوگی کیونکہ اگر وہاں لوگ موجود ہوتے تو بازاروں میں ضرور دکھائی دیتے۔ بہر حال انؔشا کو آبادی کے حوالے سے پاکستان کے شہر لاہور اور بھارت کے شہر دہلی میں تو اشتراک کی صورت نظر آئی کیونکہ ان دونوں شہروں کی آبادی بہت زیادہ ہے لیکن ایران کے شہر اصفہان میں اس حوالے سے اختلاف نظر آیا کیونکہ اس شہر کی آبادی بہت کم تھی۔

باشندے

دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف رنگ و نسل کے لوگ آباد ہیں۔ یہ لوگ کئی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ انؔشا نے مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کی سیاحت کے دوران ان ممالک میں بسنے والے لوگوں کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا اور ان لوگوں کے بارے میں بڑی دلچسپ اور مفید معلومات حاصل کیں۔ انھوں نے ان ممالک میں بسنے والے لوگوں کا تقابل پاکستانی لوگوں سے کئی حوالوں سے کیا اور نتیجے میں آنے والے اشتراک اور اختلاف، دونوں کو ہی واضح کیا۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات دونوں کو بیان کیا جارہا ہے۔

انؔشا کی دفتری مصروفیات نے انھیں مصر کے سفر کا موقع بھی فراہم کیا۔ وہاں قیام کے دوران انھوں نے اس ملک کی اشیاء و مظاہر کے ساتھ ساتھ وہاں کے باشندوں کو بھی اپنی توجہ کا خاص مرکز بنایا۔ انھوں نے مصری باشندوں کی ظاہری وضع قطع سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ لوگ دنیا کے باقی لوگوں کے مقابلے میں زیادہ لحیم شحیم اور فربہ ہیں۔ وہ اس سلسلے میں بتاتے ہیں کہ جب کبھی بھی میں مصر ائیر لائن اور یونائیٹڈ عرب ائیر ویز میں سفر کرتا تھا تو اکثر یہی سوچا کرتا تھا کہ ان جہازوں کی سیٹوں کی پیٹیاں دوسرے ملکوں کے جہازوں کی پیٹیوں کی نسبت زیادہ لمبی کیوں ہوتی ہیں، لیکن جب مجھے مصر میں رہنے اور مصری باشندوں کی لحیم شحیم جسامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا تو پھر مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہ ہوئی کہ مصری ائیر لائن اور یونائیٹڈ عرب ائیر ویز میں سیٹوں کی پیٹیاں لمبی کیوں ہوتی ہیں۔ بہر حال انؔشا کو موٹاپے اور لحیم شحیم جسامت کے اعتبار سے مصر اور پاکستان سمیت دنیا کے باقی تمام ممالک کے لوگوں میں اختلاف نظر آیا۔

لباس

آج کے دور میں دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا معاشرہ ہوگا جہاں ستر پوشی کا رواج نہ ہو اور اس مقصد کے لیے وہاں لباس کا استعمال نہ کیا جاتا ہو۔ لباس ہمیں نہ صرف موسمی تغیرات سے بچاتا ہے بلکہ ہماری شخصیت کو زینت اور وقار بھی بخشتا ہے۔

انشا نے مشرق وسطیٰ کے ممالک کی سیاحت کے دوران ان ممالک کے لوگوں کے لباس کا بھی بغور مشاہدہ کیا اور ان کا تقابل پاکستانی لوگوں کے لباس سے کر کے ان کے درمیان موجود مماثلتوں اور اختلافات کی صورتوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔ لباس کے حوالے سے انھیں پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک میں جو اشتراکات اور اختلافات نظر آئے انھیں ذیل میں بیان کیا جارہا ہے۔

انشا کو ترکی قیام کے دوران وہاں کے لوگوں کے لباس کا مشاہدہ کرنے کا موقع بھی ملا۔ انھیں پاکستان اور ترکی کے لوگوں کے لباس میں اشتراک کا یہ پہلو نظر آیا کہ ان دونوں ممالک میں ٹوپی کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ ترکی ٹوپی خاص ترکی کا خاصہ ہے، جو دیکھنے میں نہ صرف خوب صورت معلوم ہوتی ہے بلکہ اسے پہننے والا بڑا جاذب نظر اور پر وقار بھی نظر آتا ہے۔ انشا جب پاکستان اور ترکی کے لوگوں کے لباس کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ترکی ٹوپی کے حوالے سے پاکستان اور ترکی کے لوگوں میں اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں ہی نظر آتی ہیں۔ جنھیں وہ سفر نامہ *دنیا گول ہے* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''کئی بزرگ بڈھے پھوس ترکی ٹوپی میں بھی دیکھے کہ ترکی میں اس کا نام کوئی جانتا بھی نہیں یا پاکستان میں کچھ وضعدار اسے ابھی تک سر (آنکھوں) پر جگہ دیتے ہیں۔'' ۲

انشا نے ایران قیام کے دوران وہاں کے لوگوں کے لباس کا بغور مشاہدہ بھی کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان اور ایران دونوں اسلامی ممالک ہیں، اس لحاظ سے تو ان دونوں اسلامی ممالک کے باشندوں کے لباس اور وضع قطع میں اسلامی رنگ کی جھلک نمایاں طور پر نظر آنی چاہیے تھی۔ لیکن جب میں نے ایرانی لوگوں کے ظاہری حلیے اور لباس کا مشاہدہ کیا تو مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ ایرانی مسلمان اپنے لباس اور وضع قطع میں اسلامی رنگ ڈھنگ کو اپنانا بالکل پسند نہیں کرتے بلکہ زیادہ تر مغربی لباس پہنتے ہیں اور وضع قطع میں بھی مغرب کی تقلید کرتے ہوئے داڑھی رکھنے کی بجائے شیو کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی لیے وہاں لبادوں اور داڑھیوں والے لوگ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے اور اگر ایسے لوگ ہیں بھی تو زیادہ تر مزاروں یا خانقاہوں میں ہی نظر آتے ہیں۔ جبکہ پاکستان میں انھیں اسلامی لباس اور وضع قطع کے حوالے سے صورتحال ایران کے مقابلے میں نسبتاً بہتر نظر آتی ہے۔ بہر حال انشا کو یہ جان کر دکھ ہوا کہ پاکستان اور ایران یوں تو دونوں اسلامی ممالک ہیں لیکن ان دونوں ممالک کے مسلمانوں میں اسلامی لباس اور وضع قطع کے حوالے سے اختلاف کی صورت موجود ہے۔

المختصر، پاکستان، ترکی اور ایران تینوں ہی اسلامی ممالک ہیں لیکن انشا کو ان تینوں اسلامی ممالک کے لوگوں کے لباس اور وضع قطع کے تقابل میں اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں ہی نظر آئیں۔

خوراک

ہر انسان کو زندہ رہنے کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ یوں خوراک ہر انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں اور ممالک میں بسنے والے لوگ انواع واقسام کی اشیاء بطورِ خوراک استعمال کرتے ہیں۔ انشا کو ان کے سرکاری فرائض نے دنیا کے بیشتر ممالک کے سفر اور سیاحت کا موقع فراہم کیا۔ اس دوران انھیں ان ممالک میں قیام وطعام کا موقع بھی درآیا۔ جس سے انھیں ان ممالک میں استعمال کی جانے والی خوراک اور وہاں کے لوگوں کی غذائی عادات کے بارے میں بھی بڑی دلچسپ اور مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ یہ معلومات ان ممالک میں استعمال ہونے والے مختلف قسم کے اناج، پھل، سبزیوں، مشروبات، کھانوں، لوگوں کی غذائی عادات اور کئی دیگر حوالوں سے تھیں۔ انھوں نے ان معلومات کا تقابل پاکستان میں استعمال کی جانے والی خوراک اور اس سے متعلقہ امور ومسائل سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کی۔ مختلف غذائی اجزاء کے حوالے سے انھیں جو اشتراکات اور اختلافات محسوس ہوئے ذیل میں انھیں بیان کیا جارہا ہے۔

روٹی:

اناج ہماری خوراک کا ایک لازمی جزو ہے۔ اس میں گندم، چاول، جوار، باجرہ اور دیگر کئی اقسام کی چیزیں شامل ہیں۔ دنیا میں بسنے والے تقریباً تمام لوگ ہی اپنی خوراک میں اناج کا استعمال کرتے ہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک میں اناج کو مختلف شکلوں میں پکا کر کھایا جاتا ہے۔ گندم اناج کی وہ قسم ہے جو پاکستان سمیت دنیا کے بیشتر ممالک میں کثرت سے کھائی جاتی ہے البتہ اس کے کھانے کا طریقے اور انداز مختلف جگہوں پر مختلف ہیں۔ دنیا کے کئی ممالک میں گندم کو روٹی کی شکل میں بھی پکا کر کھایا جاتا ہے۔ انشا کو مشرق وسطیٰ کے ممالک کے سفر کے دوران اس بات کا بھی علم ہوا کہ پاکستان کے علاوہ ایران بھی ایک ایسا ملک ہے جہاں گندم کو روٹی کی شکل میں پکا کر کھایا جاتا ہے۔ تاہم جب وہ پاکستان اور ایران میں بننے والی روٹی کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں ممالک میں بننے والی روٹی کی اقسام، سائز اور دستیابی کے حوالے سے اختلاف کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں پاکستان اور ایران کے لوگوں کی غذائی عادات میں بھی خاصا اختلاف نظر آتا ہے۔ روٹی کے حوالے سے ان دونوں ممالک میں موجود اشتراکات اور اختلافات کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

انشا روٹی کی دستیابی کے حوالے سے پہلے ایران میں موجود صورتحال کا احوال بتاتے ہیں کہ اول تو وہاں دکانوں پر پوری روٹی دستیاب ہی نہیں ہوتی وہاں تو صرف روٹی کے ٹکڑے فروخت کیے جاتے ہیں۔ اگر کسی شخص کا دل یہ چاہے کہ وہ

ایران میں بننے والی پوری روٹی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ نانبائی کی دکان پر چلا جائے۔ کیوں کہ ایران میں پوری روٹی کو دیکھنے کا نادر موقع تو اسے صرف نانبائی کی دکان پر ہی میسر آسکتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں پاکستان میں روٹی کی دستیابی کے حوالے سے صورتحال ایران سے بالکل مختلف ہے کیونکہ یہاں پوری روٹی عام دستیاب ہوتی ہے۔ یوں انھیں روٹی کی دستیابی کے حوالے سے پاکستان اور ایران میں خاصا اختلاف نظر آیا۔

اس کے بعد انشا روٹی کی اقسام اور نوعیت کے حوالے سے پاکستان اور ایران کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ یہ بتاتے ہیں کہ ایران میں تو مختلف اقسام کی روٹیاں دستیاب ہوتی ہیں، مثلاً نرم روٹی، موٹی روٹی اور پارچوں کی طرح بالکل باریک روٹی ۔جبکہ پاکستان میں انھیں روٹی کی اتنی متنوع اقسام نظر نہیں آتیں۔ بہرحال انشا کو روٹی کی اقسام اور نوعیت کے حوالے سے ایران میں تو جدت اور تنوع نظر آیا لیکن اسی حوالے سے پاکستان میں صورتحال انھیں بالکل برعکس معلوم ہوئی۔

اس کے بعد انشا روٹی کے سائز کے اعتبار سے پاکستان اور ایران کا تقابل کرتے ہیں۔ اس تقابل میں بھی انھیں پاکستان کے مقابلے میں ایران زیادہ بہتر نظر آتا ہے۔ کیوں کہ ایران قیام کے دوران انھیں وہاں کے موزۂ مردم شناسی میں مختلف سائز کی روٹیاں دیکھنے کا اتفاق ہوا جن کا احوال انھوں نے سفر نامہ *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں قلمبند کیا ہے۔

> ''موزۂ مردم شناسی سے آتے میں ایک کوچے میں دیکھا کہ ایک کیل سے کوئی لمبی سی چیز لٹک رہی ہے۔ بظاہر نان معلوم ہوتا تھا اور تھا بھی نان لیکن کوئی ڈھائی تین گز لمبا۔ یہ محض اشتہار کے طور پر تھا۔ اندر دیکھا کہ ہر وضع قطع کی روٹیاں ہیں۔ کوئی توے کے برابر ہے کوئی پرات کے برابر۔''[۳۴]

اس کے بعد انشا روٹی کی پیش کش کے حوالے سے پاکستان اور ایران کا تقابل کرتے ہیں تو اس تقابل میں بھی انھیں ان دونوں ممالک میں روٹی کی پیش کش کا انداز ایک دوسرے سے بالکل مختلف نظر آیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایران میں لوگ روٹیوں کو دیواروں پر ٹانگتے ہیں اور اس مقصد کے لیے دیوار میں کیلیں ٹھونکی جاتی ہیں، پھر ان ٹھونکی ہوئی کیلوں میں روٹیوں کو بڑی خوبصورتی سے ٹانگا جاتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں روٹی کی پیش کش اور سجاوٹ کے انداز کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس کے علاوہ ایک اختلاف انھیں یہ بھی نظر آیا کہ وہاں روٹی کو کسی کپڑے، دسترخوان یا اخبار میں لپیٹنے کا رواج نہیں ہے بلکہ دکاندار گاہکوں کو روٹی ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایران قیام کے دوران میں نے ایک شخص کو دیکھا جو نانبائی کی دکان پر روٹی خریدنے آیا۔ نانبائی نے روٹی کسی کپڑے، دسترخوان یا اخبار میں لپٹنے کی بجائے یونہی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس نے روٹی لی، سائیکل کے کیریئر پر رکھی اور سائیکل چلاتے ہوئے میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ انشا بتاتے ہیں کہ روٹی رکھنے کے طریقۂ کار میں اس لاپروائی اور بے تکلفانہ انداز کا مظاہرہ، ایرانی شاید اس لئے بھی کرتے ہیں کہ اول تو وہاں صفائی وستھرائی کا انتظام اتنا اعلیٰ ہے کہ کہیں بھی گرد، مٹی، دھول اور گندگی دکھائی نہیں دیتی اور دوسرے یہاں کا سرد اور

خشک موسم بھی چیزوں کو خراب ہونے سے بچاتا ہے۔ یوں انشا کو روٹی کی پیش کش اور روٹی رکھنے کے انداز کے حوالے سے بھی پاکستان اور ایران میں نمایاں فرق نظر آیا۔

اس کے بعد انشا روٹی کھانے کے حوالے سے پاکستان اور ایران کے لوگوں کی غذائی عادات کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس حوالے سے بھی ان دونوں ممالک کے لوگوں میں خاصا اختلاف نظر آتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ہاں تو لوگ عام طور پر تازہ اور گرم روٹی کو پسند کرتے ہیں اس لئے عموماً تازہ اور گرم روٹی ہی کھائی جاتی ہے لیکن ایران کے لوگوں کی غذائی عادات پاکستانیوں سے مختلف ہیں۔ ایران میں ایک بار کی پکی ہوئی روٹی کو کئی کئی روز تک کھایا جاتا ہے۔ امیر لوگ تو ایک بار کی پکی ہوئی روٹی کو تین سے چار دن تک یا زیادہ سے زیادہ ہفتہ بھر کھاتے رہتے ہیں جبکہ غریب لوگ اسے ایک ماہ تک کھاتے رہتے ہیں۔ ایران قیام کے دوران جب انشا نانبائی کی دکان پر روٹی خریدنے گئے اور ہر جگہ ٹھنڈی روٹی پا کر نانبائی سے تازہ اور گرم روٹی کی فرمائش کرنے لگے تو جواب میں نانبائی نے ان سے کیا کہا؟ اسے سفر نامہ *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں ملاحظہ کیجئے۔

> ''ہم نے درخواست کی کہ اچھا ذرا گرم ٹکڑے لائیے۔ بولے۔ گرم چہ معنی دارد، ٹھنڈی ہے لیکن تازہ ہے۔ ابھی کل شام ہی تو آئی ہے۔''[۴]

یوں انشا نے درجہ بالا اقتباس سے یہ بتایا کہ ان دونوں ممالک کے لوگوں کی غذائی عادات میں خاصا اختلاف موجود ہے۔ روٹی کھانے کے سلسلے میں پاکستانی لوگوں کی غذائی عادات کے حوالے سے وہ بتاتے ہیں کہ میرے ایران کے سفر کے تھوڑی دیر بعد ہی ایرانی سفارت کار، ہوشنگ کا پاکستان آنا ہوا۔ میں ہوشنگ کو کھانا کھلانے کے لیے کراچی کے ایک ہوٹل لے گیا تاکہ ان کی میزبانی کا حق ادا کرسکوں۔ تاہم جب کھانا کھانے کا مرحلہ آیا تو ایرانی سفارت کار، ہوشنگ کو دونوں ملکوں کے لوگوں کی غذائی عادات میں موجود اختلاف کے باعث ایک اختلافی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اختلافی صورتحال کیا تھی؟ اسے انشا نے سفر نامہ *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

> ''ہوشنگ چند روز ہوئے پاکستان آئے تو ہوٹل فاروق کے نان سے ہاتھ جلا بیٹھے۔ بولے ہاں تم واقعی گرم روٹی کھاتے ہو لیکن کیوں؟''[۵]

یوں انشا نے درجہ بالا حوالے میں یہ بتایا کہ پاکستان اور ایران کے لوگوں کی غذائی عادات میں بھی خاصا اختلاف موجود ہے۔

المختصر، انشا نے روٹی کی دستیابی، اقسام، سائز، پیش کش، رکھنے کے انداز اور لوگوں کی غذائی عادات کے حوالے سے پاکستان اور ایران کا تقابل کیا، اور اس تقابل میں انھیں صرف اختلاف کی صورتیں ہی نظر آئیں۔ اشتراک کی صورت اگر انھیں نظر آئی تو وہ صرف یہ کہ ان دونوں ممالک میں گندم کو روٹی کی شکل میں پکا کر کھایا جاتا ہے۔

غذائی عادات کے حوالے سے انشا کو پاکستان اور ایران کے لوگوں میں یہ اختلاف بھی نظر آیا کہ ہمارے ہاں تو لوگ رات کا کھانا اکثر گھر پر ہی کھاتے ہیں لیکن ایران میں لوگ رات کا کھانا اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ کسی پُر فضا مقام پر کھاتے ہیں تا کہ کھانے کے ساتھ ساتھ تفریح کا ساماں بھی ہو سکے۔ البتہ کھانے میں یہاں کے لوگ زیادہ تکلفات سے کام نہیں لیتے بلکہ سادگی اور کفایت شعاری ہی کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ رات کے کھانے میں یہاں عموماً سینڈوچ کھایا جاتا ہے جسے یہاں سیندوچ کہا جاتا ہے۔ اس سینڈوچ کے سائز کے بارے میں وہ بتاتے ہیں کہ یہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ ایک شخص کی ایک وقت کی غذائی ضروریات با آسانی پورا کر سکتا ہے۔ اگر کسی شخص نے کچھ بھی نہ کھایا ہو اور وہ یہ سینڈوچ کھالے تو اسے کھا کر اس کا شکم پوری طرح سیر ہو جاتا ہے بلکہ بعض اوقات تو اس سینڈوچ کا کچھ حصہ بچ بھی جاتا ہے۔ اس سینڈوچ کی قیمت بھی یہاں بہت کم ہے۔ یوں ایرانیوں کو ہر رات باہر کا کھانا اور پُر فضا مقام کی سیر زیادہ مہنگی نہیں پڑتی۔

مشروبات:

آج کل کے دور میں مشروبات بھی ہماری خوراک کا ایک لازمی حصہ بن چکے ہیں۔ دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف اقسام کے مشروبات استعمال کیے جاتے ہیں۔ جن میں موسم اور لوگوں کی منشا کے مطابق ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ انشا کو مشرق وسطیٰ کے ممالک کی سیاحت کے دوران یہاں کے مختلف ممالک میں قیام وطعام کا موقع ملا۔ جس سے انھیں ان ممالک میں استعمال کیے جانے والے مشروبات سے نہ صرف لطف اٹھانے کا موقع ملا بلکہ ان مشروبات کے بارے میں جاننے اور معلومات حاصل کرنے کا موقع بھی ملا۔ انھوں نے ان ممالک میں استعمال کیے جانے والے مشروبات کا تقابل پاکستان میں استعمال ہونے والے مشروبات سے کر کے ان میں موجود اشتراکات اور اختلافات کو واضح بھی کیا۔ مشروبات میں یوں تو مختلف انواع و اقسام کے مشروبات شامل ہیں لیکن اس تقابل کو آسان اور قابلِ فہم بنانے کے لیے ہم ان مشروبات کو دو گرہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

ا۔ گرم مشروبات

ب۔ ٹھنڈے مشروبات

ا۔ گرم مشروبات:

گرم مشروبات کا استعمال زیادہ تر موسم سرما میں کیا جاتا ہے۔ ہر موسم کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں، موسم سرما میں چونکہ شدید سردی پڑتی ہے اس لیے اس موسم میں ایسے مشروبات استعمال کیے جاتے ہیں جو جسم کو گرم اور چاک وچوبند رکھتے ہیں۔ چائے کا شمار گرم مشروبات میں ہوتا ہے گو کہ یہ ایسا مشروب ہے جو سردیوں کے علاوہ گرمیوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے، تاہم اس کا زیادہ استعمال موسم سرما میں ہی کیا جاتا ہے۔ یہ مشروب مختلف ناموں سے پاکستان سمیت دنیا کے مختلف

ممالک میں بڑے شوق سے پیا جاتا ہے۔ البتہ ان ممالک میں اس مشروب کے اجزائے ترکیبی، ذائقے، مقدار اور پیش کش کے حوالے سے اختلاف ضرور موجود ہے۔

انشا نے ایران کا سفر بھی اختیار کیا اور وہاں قیام کے دوران انھیں مختلف گھروں، دفتروں اور ہوٹلوں میں کئی بار چائے پینے کا موقع ملا۔ اس مشروب کے حوالے سے جب وہ پاکستان اور ایران کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں ممالک میں اس حوالے سے اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں ہی نظر آتی ہیں۔ اشتراک کی صورت تو انھیں یہ نظر آئی کہ ان دونوں ممالک میں چائے کو ایک عام مشروب کی حیثیت حاصل ہے اور اختلاف یہ نظر آیا کہ دونوں جگہ اس مشروب کی قیمت، ذائقے، اجزائے ترکیبی، مقدار اور پیش کش کے حوالے سے زیادہ تر اختلاف کی صورتیں موجود تھیں۔ اس اختلاف کو انشا سفر نامہ *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''آپ کسی دفتر میں جائیں یا دکان میں۔ فوراً ایک آدمی سینی میں چائے کی چھوٹی چھوٹی گلاسیاں اور ایک پیالے میں شکر، بالعموم شکر کے کیوب لے کر آپ کے پاس پہنچے گا۔ ''بفرمائید بفرمائید''۔ دودھ وہاں نہیں ڈالتے۔ ہم نے معلوم کیا عموماً ایسا چھوٹا گلاس ہمارے کپ کا تین چوتھائی سمجھیے ایک ریال یعنی ایک آنے میں دیتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے قومی مشروب بن گیا ہے۔ چائے اچھی ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں کی طرح کاڑھا یا جوشاندہ نہیں بناتے۔ لیکن ہوٹل میں ذرا زیادہ قرینہ ہوتا ہے۔ دو چائے دانیاں آتی ہیں۔ اصل میں چائے دانی ایک ہی ہوتی ہے دوسری پانی دانی کہیے کیونکہ اس میں خالی گرم پانی رہتا ہے۔ اگر آپ چائے کا رنگ ہلکا کرنا چاہتے ہیں تو اس میں تھوڑا پانی ملا لیجیے۔ ہم ہلکی چائے پسند کرتے ہیں ہمیں تو یہ طریقہ پسند آیا۔ ایک آدھ بار دودھ مانگا تو فوراً مہیا کیا گیا لیکن سچ یہ ہے کہ جو مزا بلا دودھ پینے میں آیا۔ دودھ کے ساتھ نہیں آیا۔ لہٰذا پھر ہم نے بھی دودھ سے کنارا کیا۔''[۲]

انشا نے درجہ بالا حوالے میں یہ بتایا ہے کہ ایران میں بننے والی چائے پاکستانی چائے سے اپنے ذائقے، اجزائے ترکیبی، مقدار، پیش کش اور قیمت غرض ہر اعتبار سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ زیادہ بہتر بھی ہے۔ یوں اس مشروب کے حوالے سے انھیں پاکستان اور ایران میں اشتراک کی صرف یہی صورت نظر آئی کہ ان دونوں ممالک میں یہ مشروب عام استعمال کیا جاتا ہے، باقی ہر حوالے سے انھیں صرف اختلاف کی صورتیں ہی نظر آئیں۔

ب۔ ٹھنڈے مشروبات:

ہر موسم کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ سردیوں میں جس طرح جسم کو گرم اور چاق و چوبند رکھنے کے لیے گرم مشروبات کا استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح موسم گرما میں جسم کو ٹھنڈا رکھنے اور طبیعت کو فرحت و تازگی بخشنے کے لیے ٹھنڈے مشروبات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں اس موسم میں مختلف اقسام کے ٹھنڈے مشروبات استعمال کیے

جاتے ہیں۔ انؔشا نے مشرق وسطیٰ کے ممالک کی سیاحت کے دوران جن ٹھنڈے مشروبات سے لطف اٹھایا ان کا تقابل پاکستان میں استعمال کیے جانے والے ٹھنڈے مشروبات سے کر کے ان میں موجود اشتراکات اور اختلافات کی صورتوں کو واضح بھی کیا جنھیں ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

ٹھنڈے مشروب میں لسّی وہ مشروب ہے جو پاکستان سمیت دنیا کے کئی دیگر ممالک میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ انؔشا کو مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کی سیّاحت کے دوران یہ پتا چلا کہ یہ مشروب پاکستان کے علاوہ ایران اور ترکی میں بھی بڑے شوق سے پیا جاتا ہے۔ البتہ جب وہ اس مشروب کے حوالے سے پاکستان، ایران اور ترکی کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشروب ان تینوں ممالک میں مختلف ناموں سے پیا جاتا ہے۔ البتہ ان تینوں ممالک میں انھیں اس مشروب کے ذائقے، اجزائے ترکیبی، مقدار اور پیش کش کے انداز کے حوالے سے اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں ہی نظر آئیں۔ سب سے پہلے تو وہ یہ بتاتے ہیں کہ ان تینوں ممالک میں اس مشروب کے نام کے حوالے سے ہی اختلاف موجود ہے۔ پاکستان میں اس مشروب کو لسّی کہا جاتا ہے، ایران میں دوغ اور ترکی میں اسے آئرن کہتے ہیں۔ نام کے بعد وہ ذائقے کے اعتبار سے ان تینوں ممالک میں اس مشروب کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایران اور پاکستان میں بننے والی لسّی کے ذائقے میں تو اشتراک کی صورت موجود ہے کیوں کہ دونوں ممالک میں بننے والی لسّی کا ذائقہ نمکین ہوتا ہے اور تھوڑا سا ترش ذائقہ بھی گھلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جبکہ ترکی میں اس کا ذائقہ بہت میٹھا، مزیدار اور فرحت بخش ہوتا ہے۔ یوں اس مشروب کے ذائقے کے حوالے سے انھیں پاکستان اور ایران میں تو اشتراک کی صورت نظر آئی ہے لیکن ترکی میں اختلاف کی صورت نظر آئی۔

اس کے بعد انؔشا لسّی کی دستیابی کے حوالے ان تینوں ممالک کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں تو یہ مشروب ہر جگہ کھلے عام دستیاب ہوتا ہے اور ہر شخص اسے خرید کر لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ جبکہ ایران میں یہ مشروب دونوں طرح بآسانی مل جاتا ہے یعنی بند بوتل میں بھی اور کھلے عام بھی۔ یوں ہر شخص اپنی منشا کے مطابق جس ذریعے کو پسند کرے اسی سے یہ مشروب حاصل کرسکتا ہے۔ البتہ جب وہ ترکی میں اس مشروب کی دستیابی کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں یہ پتا چلتا ہے کہ وہاں یہ مشروب کھلے عام نہیں ملتا صرف بند بوتلوں میں ہی ملتا ہے۔ یوں اس مشروب کی دستیابی کے حوالے سے انھیں پاکستان، ایران اور ترکی میں مختلف صورتحال نظر آئی۔

اس کے بعد انؔشا لسّی کی مقدار اور طریقۂ استعمال کے حوالے سے ان تینوں ممالک کا تقابل کرتے ہیں تو اس تقابل میں انھیں اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں نظر آتی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہ وہ مشروب ہے جو ایران اور پاکستان کے لوگ نہ صرف بڑے شوق سے پیتے ہیں بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی پلاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لسّی پاکستان اور ایران دونوں میں ہی بہت کثرت سے پی جاتی ہے بلکہ پاکستان کے صوبہ پنجاب میں تو یہ لوگوں کا دل پسند مشروب ہے۔ یہاں لسّی کا

استعمال اس کثرت سے کیا جاتا ہے کہ شاید پورے ملک میں اتنی کثرت سے نہیں کیا جاتا۔ البتہ جب وہ لسّی کی مقدار اور استعمال کے لحاظ سے پاکستان کے صوبہ پنجاب اور ترکی کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس لحاظ سے دونوں جگہوں میں خاصا اختلاف نظر آتا ہے۔ انشاؔ اس اختلاف کو سفر نامہ *دنیا گول ہے* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> ''وہی بوتل میں بند اور لسّی بھی، جو ہر کھانے کے ساتھ پی جاتی ہے اور آئرن کہلاتی ہے۔ بوتل میں جتنی لسّی ہم نے اب کے ترکی میں پی۔ پنجاب میں عمر بھر میں پی ہوگی۔ نہایت مفرح اور خوش ذائقہ'' ؎

یوں درجہ بالا حوالے سے انشاؔ نے یہ بتایا ہے کہ پاکستان اور ایران کے مقابلے میں ترکی میں لسّی کا استعمال زیادہ کثرت سے کیا جاتا ہے۔

المختصر، انشاؔ نے گرمیوں کے اس ٹھنڈے مشروب یعنی لسّی کے حوالے سے پاکستان، ایران اور ترکی کا تقابل کئی حوالوں سے کیا۔ اس تقابل میں انھیں صرف لسّی پینے کے حوالے سے تو پاکستان، ایران اور ترکی میں اشتراک نظر آیا لیکن اس مشروب کے نام، ذائقے، دستیابی، پیش کش کے انداز اور طریقۂ استعمال کے حوالے سے ان تینوں ممالک میں کہیں اشتراک اور کہیں اختلاف کی صورت نظر آئی۔

پھل:

پھل قدرت کا انمول تحفہ ہیں۔ یہ ہماری خوراک کا ایک اہم حصہ ہیں۔ اور ہمارے جسم کی صحیح نشوونما اور مدافعتی نظام کے لیے بہت اہم تصور کیے جاتے ہیں۔ دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف انواع و اقسام کے پھل پائے جاتے ہیں جن کے رنگ، ذائقے، خوشبو اور خوب صورتی میں قدرت کی ثنائی کا رنگ جھلکتا ہے۔ پھل نہ صرف اپنے خوشنما رنگوں اور دل پسند ذائقوں کے باعث ہمیں مرغوب ہوتے ہیں بلکہ یہ انسانی جسم کو کئی طرح کی بیماریوں سے بھی بچاتے ہیں۔ گو کہ تندرست لوگوں کے لیے بھی پھلوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن بیماروں کے لیے ان کی ضرورت اور افادیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

انشاؔ کو مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کی سیاحت کے دوران جہاں مختلف ملکوں اور شہروں کو دریافت کرنے کا موقع ملا وہیں ان ممالک میں پائے جانے والے پھلوں سے محظوظ ہونے کا موقع بھی در آیا۔ مشرق وسطیٰ کے خطے میں انواع و اقسام کے پھل پائے جاتے ہیں۔ ان میں بعض پھل اپنے ذائقے، خوشبو اور خوشنما رنگوں کے باعث دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس خطے کے بعض ممالک میں جو پھل کھائے ان کا تقابل پاکستان میں پائے جانے والے ان ہی پھلوں سے کئی حوالوں سے کیا اور ان میں موجود اشتراکات اور اختلافات کو واضح کیا۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو بیان کیا جاتا ہے۔

ایران قیام کے دوران انشاؔ پر یہ حقیقت کھلی کہ کئی پھل ایسے بھی ہیں جو پاکستان اور ایران دونوں میں پائے جاتے

ہیں لیکن دونوں ملکوں میں ان پھلوں کے نام مختلف ہیں۔ اس سلسلے میں وہ بتاتے ہیں کہ جس پھل کو ہمارے ہاں سردا کہا جاتا ہے اس کو ایران میں خربوزہ کہا جاتا ہے یوں پھل تو ایک ہی ہے لیکن دونوں ملکوں میں صرف ان کے نام مختلف ہیں۔ البتہ جب وہ پاکستانی سردے اور ایرانی خربوزے کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ایرانی خربوزہ، پاکستانی سردے سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے کیوں کہ ایرانی خربوزہ پاکستان سردے کے مقابلے میں زیادہ خوش ذائقہ، میٹھا اور خستہ ہوتا ہے۔ گو کہ پاکستانی سردے کا ذائقہ بھی بہت مزیدار اور میٹھا ہوتا ہے لیکن پھر بھی یہ خستگی اور مٹھاس میں ایرانی خربوزے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ ایرانی خربوزے کی مٹھاس کے بارے میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ اتنا میٹھا ہے کہ جیسے گڑ۔

یوں انشا کو ایرانی خربوزے اور پاکستانی سردے کے تقابل میں ان کے نام، ذائقے اور نوعیت غرض ہر حوالے سے اختلاف کی صورت ہی نظر آئی۔ اشتراک کا پہلو تو انھیں یہ نظر آیا کہ یہ پھل ان دونوں ممالک میں دستیاب تھا۔ البتہ دونوں جگہ اس پھل کے نام، ذائقے اور نوعیت میں اختلاف کی صورت موجود تھی۔

کھانے:

قدیم زمانے میں انسان کھانا پکانے کے فن سے آشنا نہیں تھا اس لیے وہ خوراک کو کچا ہی کھایا کرتا تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے نہ صرف دیگر علوم وفنون سیکھے بلکہ وہ کھانا پکانے کے فن سے بھی آشنا ہوا۔ انسان نے اپنی قوت مخترع سے کام لے کر طرح طرح کے نمکین کھانے، میٹھے پکوان، مٹھائیاں اور دیگر چیزیں بنا ڈالیں۔ یوں دنیا میں انواع واقسام کے کھانوں کی کثرت ہوگئی اور انسان طرح طرح کے کھانوں سے لطف اندوز ہو کر دنیا میں ہی جنت کے مزے لینے لگا۔

انشا کو ان کی سرکاری مصروفیات نے جہاں مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع فراہم کیا وہیں ان ممالک کے لذیذ اور مزیدار کھانے کھانے کا موقع بھی فراہم کیا۔ انھوں نے اس خطے کے بعض ممالک میں جو کھانے کھائے ان کا تقابل پاکستانی کھانوں سے کر کے ان میں موجود اشتراکات اور اختلافات کی صورتوں کو واضح کیا جنھیں ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

انشا نے مصر قیام کے دوران وہاں کے بہت سے کھانے کھائے۔ جس سے نہ صرف انھیں ان کھانوں سے لطف اٹھانے کا موقع ملا بلکہ ان کے بارے میں بہت سی معلومات بھی حاصل ہوئیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ مصر میں کچھ کھانے ایسے بھی ہیں جو بالکل پاکستانی کھانوں جیسے ہیں یعنی ان کھانوں کے اجزائے ترکیبی، ذائقہ اور ظاہری نوعیت بالکل ایک جیسی ہے۔ اگر ان میں کوئی اختلاف ہے تو وہ صرف یہ کہ ان دونوں جگہ ان کھانوں کے نام مختلف ہیں۔ اس بات کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب وہ مصر گئے اور وہاں ایک پاکستانی دوست سردار انور خان نے ایک ہوٹل میں ان کی دعوت کی۔ انشا بتاتے ہیں کہ میں نے

کھانے کا آرڈر دیا لیکن دونوں ملکوں میں ایک ہی کھانے کے نام مختلف ہو جانے کے سبب بڑی دلچسپ اور مضحک صورتحال پیش آئی۔ اس صورتحال کو انھوں نے سفرنامہ آوارہ گرد کی ڈائری کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

''بولے'' کیا کھاؤ گے؟''

ہم نے کہا ''تکّہ کھائیں گے۔''

بولے'' تکّے کو یہاں کباب کہتے ہیں!''

ہم نے کہا ''کباب بھی کھائیں گے۔''

بولے'' کباب کو یہاں کوفتہ کہتے ہیں۔''

ہم نے کہا ''کوفتہ بھی کھائیں گے۔''

اب وہ چپ ہو گئے کہ ہم نے اس کا مصری نام بتایا تو یہ اس کو بھی کھائیں گے۔ ہم نے بہت پوچھا کہ کوفتے کو یہاں کیا کہتے ہیں۔ وہ ٹال ہی گئے''۔ ۸

یوں انؔشا نے درجہ بالا حوالے میں بتایا ہے کہ بعض کھانے پاکستان اور مصر دونوں میں بالکل ایک جیسے تھے یہاں تک کہ ان کا ذائقہ، ظاہری ساخت اور اجزائے ترکیبی بھی بالکل ایک جیسے تھے۔ فرق تھا تو صرف یہ کہ دونوں جگہ ان کھانوں کے نام مختلف تھے۔

ایران قیام کے دوران بھی انؔشا کو وہاں کے مزیدار اور اشتہا انگیز کھانوں سے لطف اٹھانے کا موقع ملا۔ جس سے انھیں یہ معلوم ہوا کہ یہاں بھی کچھ کھانے ایسے ہیں جو بالکل پاکستانی کھانوں جیسے ہیں۔ اگر فرق ہے تو وہی کہ دونوں جگہ ان کے نام مختلف ہیں۔ اس کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب ایران قیام کے دوران انھیں وہاں کے مشہور چیلو کباب کھانے کا موقع ملا۔ انھیں یہ کباب اپنے ہاں کے چپل کباب جیسے ہی معلوم ہوئے۔ یہاں تک کہ ان دونوں کبابوں کی ظاہری شکل بھی بالکل ایک جیسی تھی یعنی چپٹی۔ یوں انؔشا کو پاکستانی چپلی کباب اور ایران کے چیلو کباب کے تقابل میں ان کی ظاہری ساخت کے حوالے سے اشتراک کی ایک صورت نظر آئی۔

کھانوں کے بعد انؔشا پاکستان اور ایران میں موجود کباب کی دکانوں، ان میں موجود ساز و سامان اور دکانداروں کے لباس کا تقابل کرتے ہیں، اس تقابل میں انھیں اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں ہی نظر آتی ہیں۔ اشتراک کی صورت تو انھیں صرف یہی نظر آئی کہ جس طرح ایران میں خیابان شاہ رضا پر کباب کی دکانیں موجود تھیں اسی طرح پاکستان میں بھی ایسی دکانیں سڑکوں پر جا بجا دکھائی دیتی ہیں۔ البتہ جب وہ کراچی کی جامع مسجد کے قریب کباب بنانے والے مشہور ''جانی کباب'' کے لباس اور ساز و سامان کا تقابل خیابان شاہ رضا پر موجود کباب بنانے والے کے لباس اور ساز و سامان سے کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں حوالوں سے دونوں جگہ واضح اختلاف نظر آتا ہے۔ کیوں کہ خیابان شاہ رضا پر موجود ایرانی تکہ بنانے والے کو انھوں نے گیس کے شعلوں پر تکے سینکتے دیکھا جبکہ کراچی کے جانی کبابی کے تکہ سینکنے کا طریقہ وہی پرانا

تھا۔اس کے بعد وہ جانی کباب اور خیابان شاہ رضا پر موجود تکہ بنانے والے شخص کے لباس کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس حوالے سے بھی دونوں جانب کافی اختلاف نظر آتا ہے۔ انشا بتاتے ہیں کہ ایرانی تکہ بنانے والے نے مغربی طرز کا نہایت ہی خوبصورت لباس یعنی کوٹ اور پتلون پہن رکھا تھا جبکہ اپنے ملک کے جانی کباب صاحب کے لباس کا حال ملاحظہ کرنے کے بعد وہ اتنا کہنا ہی مناسب سمجھتے ہیں کہ وہ صرف اپنے کام پر دھیان دیتے ہیں۔ جہاں تک سوال رہا ان کے لباس کا تو سادہ طرز زندگی کو اپناتے ہوئے وہ لباس میں بھی تکلفات برتنے سے اجتناب کرتے ہیں لہٰذا سادگی اور ستر پوشی کے خیال سے وہ صرف ایک لنگی اور ایک پھینٹا پہننے کو ہی کافی سمجھتے ہیں۔انشا نے ہنسی مزاح میں جانی کبابی کے لباس کو خوب تنقید کا نشانہ بناڈالا۔البتہ اس تنقید میں کہیں خالص مزاح کے ذریعے لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کی گئی ہے اور کہیں طنز لطیف کے ذریعے پاکستانی عوام کی توجہ اس طرف دلائی گئی ہے کہ ہمارے ہاں کے محنت کش بشمول جانی کبابی اپنے لباس کی موزونیت اور صفائی کا ذرا بھی خیال نہیں رکھتے۔

المختصر، انشا کو پاکستان، مصر اور ایران کے کھانوں، دکانوں، ان میں موجود ساز وسامان، کاریگروں کے لباس اور دیگر کئی حوالوں سے اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں ہی نظر آئیں۔

مٹھائیاں:

انسان ہمیشہ سے تبدیلی اور تنوع کا خواہاں رہا ہے۔اس کی اسی عادت نے اسے نئی سے نئی چیزیں اختراع کرنے کی طرف راغب کیا۔ یہی حال اس کی حسِ ذائقہ کا بھی ہے جو نت نئے ذائقوں کی خواہشمند رہتی ہے۔جس کی بدولت نہ صرف مختلف اقسام کے نمکین اور میٹھے پکوان اختراع کیے گئے بلکہ مختلف اقسام کی مٹھائیاں بھی بنائی گئیں۔مٹھائیاں، میٹھے پکوان کی وہ قسم ہے جو پاکستان سمیت دنیا کے کئی ممالک میں بڑے شوق سے کھائی جاتی ہیں۔انشا نے مشرق وسطیٰ کے ممالک کی سیاحت کے دوران وہاں کی مختلف مٹھائیاں بھی کھائیں اور ان کا تقابل پاکستان میں بننے والی مٹھائیوں سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کی۔ ذیل میں ان کی تفصیل ملاحظہ کیجیے۔

انشا کو ایران قیام کے دوران وہاں بننے والی مٹھائیاں کھانے کا موقع بھی ملا جس سے انھیں ان کے بارے میں بہت سی معلومات بھی حاصل ہوئیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ کچھ مٹھائیاں تو دونوں ممالک میں بالکل ایک جیسی تھیں صرف دونوں جگہ ان کے نام مختلف تھے۔اس بات کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب وہ ایک ایرانی گائیڈ، مرتضیٰ نکوئی کے ہمراہ اصفہان کے ایک بازار گئے۔وہ بتاتے ہیں کہ جب میں نے بازار کی راہ لی تو یہ گائیڈ بہلا پھسلا کر مجھے ایک حلوائی کی دکان پر لے گیا اور مٹھائی خریدنے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ وہ ایسا اس لیے کر رہا تھا کیونکہ اس کا اپنا دل مٹھائی کھانے کو چاہ رہا تھا۔انشا بتاتے ہیں کہ اس نے حلوائی کی دکان سے ایک قند کی بھیلی اٹھائی اور مجھے دکھانے کے بعد کہنے لگا کہ اس مٹھائی کا نام

گز ہے، یہ بہت ہی میٹھی اور مزیدار مٹھائی ہے۔ میں نے اس کے کہنے پر اس مٹھائی کو خوب الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن مجھے اس مٹھائی میں کوئی ایسی خاص بات دکھائی نہ دی کہ میں اس کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملاتا۔ میں نے خوب چھان بین کرنے کے بعد مرتضیٰ نکوئی کو بتایا کہ یہ مٹھائی تو ہمارے ہاں بھی عام ملتی ہے جسے ہمارے ہاں گزک کہا جاتا ہے البتہ ہم میں سے اکثر لوگ اسے گچک بھی کہتے ہیں۔ یہ مٹھائی واقعی بڑی خوش ذائقہ اور مزیدار ہوتی ہے اور ہمارے ہاں یہ مٹھائی زیادہ تر سردیوں میں کھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد میں نے اس دکان پر سجائی گئی کئی دوسری مٹھائیوں کا بھی جائزہ لیا۔ ان مٹھائیوں میں سے ایک مٹھائی مجھے دیکھنے میں اپنے ہاں کے لڈو جیسی ہی معلوم ہوئی۔ لیکن اس کا نام یہاں کیا تھا میں اس سے میں واقف نہ ہو سکا لیکن میں اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کا نام یہاں لڈو نہیں ہوگا۔ بہر حال یہ مٹھائی دیکھنے میں مجھے اپنے ہاں کے لڈو جیسی معلوم ہوئی۔

المختصر، انؔشا نے ایران کی مختلف مٹھائیوں کا تقابل پاکستان میں بننے والی مختلف مٹھائیوں سے کیا۔ اس تقابل میں انھیں مٹھائیوں کی ظاہری شکل وصورت کے حوالے سے تو اشتراک کا پہلو نظر آیا لیکن ان کے ناموں کے حوالے سے انھیں اختلاف کی صورت نظر آئی۔

عادات واطوار

دنیا کا ہر انسان کسی نہ کسی اعتبار سے ایک منفرد شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ اور اس کی عادتیں اور طور طریقے بھی دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ انؔشا کو مشرق وسطیٰ کے ممالک کی سیاحت کے دوران مختلف رنگ ونسل اور اقوام کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس دوران انھوں نے ان لوگوں کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا اور ان کی عادات واطوار کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش بھی کی۔ انھوں نے ان ممالک کے لوگوں کی عادات واطوار کا تقابل اپنے ملک کے لوگوں کی عادات واطوار سے بھی کیا اور ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی صورتوں کو واضح بھی کیا۔ یہی نہیں بلکہ کئی تو بار انھوں نے ان معاشرتی اور ثقافتی پس منظر کی وضاحت بھی کی جو ان عادات واطوار کی تشکیل کا سبب ہوتے ہیں۔

انؔشا کو پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے بعض ممالک کے باشندوں کی عادات واطوار میں جو اشتراکات اور اختلافات نظر آئے انھیں ذیل میں الگ الگ بیان کیا جا رہا ہے۔

ا۔ غسل کرنا:

اسلام ایسا مذہب ہے جس میں صفائی اور پاکیزگی کو نصف ایمان قرار دیا گیا ہے۔ غسل سے نہ صرف جسمانی

صفائی کا موقع ملتا ہے بلکہ روحانی پاکیزگی بھی حاصل ہوتی ہے۔ یوں غسل کے ذریعے ایک مسلمان جسم اور روح دونوں کی صفائی اور پاکیزگی کا اہتمام کرتا ہے۔ انشا کہتے ہیں کہ پاکستان اور ایران دونوں اسلامی ممالک ہیں اس لیے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ان دونوں اسلامی ممالک کے باشندوں کی عادات و اطوار یقیناً اسلامی تعلیمات کے مطابق ہوں گی۔ البتہ جب وہ غسل کے حوالے سے پاکستان اور ایران کے باشندوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس حوالے سے ان دونوں اسلامی ممالک کے لوگوں کی عادات میں خاصا اختلاف نظر آتا ہے۔ انشا بتاتے ہیں کہ ایرانی لوگ تو صرف جمعہ کے روز نہاتے ہیں جبکہ پاکستانی لوگ ایرانیوں کے مقابلے میں زیادہ نہاتے ہیں اور میں تو ہر روز ہی نہاتا ہوں۔ اس بات کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ ایک دن مجھے نہانے کے لیے پانی کی ضرورت تھی، میں نے ایرانی سفارت کار، ہوشنگ کو اپنی اس ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھ سے نہانے کی وجہ پوچھی تو میں نے اسے بتایا کہ روز نہانا میری عادت ہے۔ یہ سن کر وہ بہت حیران ہوئے اور بتانے لگے کہ میں تو ہر روز نہیں، صرف جمعہ کے دن نہاتا ہوں اور وہ بھی گھر پر نہیں بلکہ حمام جاتا ہوں تا کہ اس سلسلے میں خاص اہتمام کرسکوں۔

یوں انشا کو پاکستانی اور ایرانی باشندوں میں غسل کرنے کی عادت اور اس کے اہتمام کے حوالے سے خاصا اختلاف نظر آیا حالانکہ بحیثیت مسلمان انھیں، اس اختلاف کی ہرگز توقع نہ تھی۔

۲۔ وقت کی پابندی:

وقت کی پابندی کرنا بہت اچھی عادت ہے۔ جو افراد اور اقوام وقت کی قدر کرتے ہیں وہ ترقی کی دوڑ میں ہمیشہ آگے رہتے ہیں اور ہر جگہ کامیابی اور کامرانی ان کے قدم چومتی ہے۔ جو افراد اور اقوام وقت کی قدر نہیں کرتے وقت ان کی قدر نہیں کرتا اور وقت کا ریلہ انھیں خس و خاشاک کی طرح بہا کر کے لے جاتا ہے۔ انشا جب اس عادت کے حوالے سے پاکستان اور ایران کے لوگوں کے طرزِ عمل کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ جان کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ ایرانی بھی ہماری طرح وقت کی بالکل قدر نہیں کرتے۔ اس عادت کے حوالے سے ان دونوں ممالک کے لوگوں میں نہ صرف اشتراک موجود ہے بلکہ ایرانی تو اس سلسلے میں پاکستانیوں سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ اس بات کا اندازہ انھیں ایران قیام کے دوران اس وقت ہوا جب ایک ایرانی سفارت کار، ہوشنگ انھیں وزارت تعلیم میں آقائے اردلان سے ملوانے لے گیا۔ انشا بتاتے ہیں کہ ہمیں ملاقات کے لیے نو بجے کا وقت دیا گیا۔ مسٹر ہوشنگ نے مجھے بتایا کہ کل صبح وہ خود انھیں ہوٹل لینے آئیں گے لیکن ساتھ ہی یہ بھی سمجھا دیا کہ یہاں ۹ بجے سے مراد پورے ۹ نہیں ہوتے کیونکہ ہم لوگ وقت کی پابندی کے اتنے قائل نہیں ہیں۔ انشا بتاتے ہیں کہ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ چلو اور نہیں تو وقت کی پابندی کے معاملے میں ہی سہی کہیں تو دونوں اسلامی ممالک کے لوگوں کا طرزِ عمل ایک جیسا ہوا۔ وہ بتاتے ہیں کہ اگلی صبح ہوشنگ صاحب خود ساڑھے ۹ بجے ہوٹل آئے اور تقریباً دس بجے

ہم آقائے اردلان کے دفتر پہنچے۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ آقائے اردلان اس وقت بھی اپنے دفتر میں موجود نہیں ہیں۔ اتنے میں ایک چپڑاسی اندر آیا اور سلام دعا کے بعد کہنے لگا کہ جناب آپ پریشان نہ ہوں، صاحب بس آنے ہی والے ہیں بلکہ یوں لگتا ہے کہ سامنے سے جو کار آ رہی ہے وہ غالباً ان ہی کی ہے۔ گویا تسلیاں دے دے کر وہ ہمارا دل بہلاتا رہا اور ہمیں مزید انتظار کرنے کی ترغیب دلاتا رہا۔ انؔشا نے جب اصل صورتحال بھانپ لی تو انھوں نے ایرانی سفارتکار، ہوشنگ سے کہا کہ یوں تو آپ کی قوم زندگی کے ہر میدان میں اہلِ مغرب کی تقلید کرتی ہے یہاں تک کہ ایک مسلم قوم ہونے کے باوجود لباس اور وضع قطع میں بھی اہلِ مغرب کی تقلید کو ترجیح دیتی ہے تو پھر وقت کی پابندی کے سلسلے میں ان کے طرزِ عمل کو کیوں نہیں اپناتے؟ انھوں نے جواب دیا کہ جناب آپ درست فرماتے ہیں، ہماری قوم نے واقعی ترقی وخوشحالی کی حد تک تو اہلِ مغرب کی تقلید ضرور کی ہے لیکن ہر معاملے میں دوسروں کی تقلید کرنا بھی مناسب نہیں ہوتا۔ ہر انسان کی طرح ہر قوم بھی اپنی شناخت کو قائم رکھنا چاہتی ہے اس لیے ہماری قوم نے بھی وقت کی پابندی کے سلسلے میں اس غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل کو اپنا کر اپنی انفرادیت قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔

بہرحال، انؔشا کو پاکستانیوں اور ایرانیوں میں وقت کی پابندی نہ کرنے کے حوالے سے مکمل اشتراک نظر آیا بلکہ انھوں نے ایک مضحک صورتحال سے یہ بھی ثابت کیا کہ ایرانی قوم اس معاملے میں ہم سے بھی بڑھ کر ہے۔

۴۔ انگلی سے اشارہ کرنا:

مختلف معاشروں کا تہذیبی اور معاشرتی پس منظر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک عادت جو کسی ایک معاشرے میں قابلِ قبول ہو لیکن کسی دوسرے معاشرے میں اسے ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہو۔ یوں مختلف عادات واطوار کے حوالے سے مختلف معاشروں کے لوگ متضاد خیالات رکھتے ہیں۔

انگلی سے اشارہ کرنا گو کہ ایک اچھی عادت نہیں ہے لیکن پھر بھی مختلف معاشروں کے افراد اس عادت کے بارے میں متضاد خیالات رکھتے ہیں۔ انؔشا جب اس عادت کے حوالے سے پاکستانی اور مصری باشندوں کے خیالات اور طرزِ عمل کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں ان دونوں ممالک کے لوگوں کے خیالات میں کافی اختلاف نظر آتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان میں اگر کوئی شخص انگلی سے اشارہ کر بھی دے تو یہاں کے لوگ اسے اتنا معیوب نہیں سمجھتے اور نہ ہی اس کے خلاف کسی قسم کے جارحانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ البتہ مصر میں اگر کوئی شخص انگلی سے اشارہ کرے تو اسے وہاں نہ صرف معیوب سمجھا جاتا ہے بلکہ اسے بد تمیزی کے زمرے میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ اس بات کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب مصر قیام کے دوران میں اپنے ہوٹل کا پتا بھول گیا۔ میں نے مدد کے لیے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو روکا تو اس نے مجھے ٹیکسی میں بیٹھنے کو کہا۔ ٹیکسی ابھی ذرا چلی تھی کہ اچانک رُک گئی۔ میں نے سوچا کہ شاید پٹرول ختم ہو گیا ہے اس لیے ٹیکسی والے نے ٹیکسی روک لی ہے۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ

ٹیکسی والا مجھ سے کہنے لگا کہ جناب آپ کا ہوٹل آ گیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بات بتانے کے لیے تم نے ٹیکسی کیوں روکی یہ بات تو تم مجھے صرف انگلی کے اشارے سے بھی بتا سکتے تھے۔ تو اس نے جواب دیا کہ جناب، یہاں ایسا کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے اس لیے میں نے ''انگلی کا شارہ'' نہیں کیا۔ یوں انشا کو انگلی سے اشارہ کرنے کی عادت کے حوالے سے پاکستان اور مصر کے لوگوں کے خیالات میں نہ صرف اختلاف نظر آیا بلکہ یہ بھی پتا چلا کہ جس عادت کو ہمارے ہاں ایک عام سی بات سمجھ کر اس پر کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا اسے مصری باشندے نہ صرف بہت بُرا سمجھتے ہیں بلکہ اسے بدتمیزی کے زمرے میں شمار کرتے ہوئے اس پر جارحانہ ردعمل کا مظاہرہ بھی کر سکتے ہیں۔

المختصر، انشا کو پاکستان، ایران اور مصر کے باشندوں کی عادات واطوار میں زیادہ تر اختلاف کی صورت ہی نظر آئی۔

اخلاقی اقدار

کوئی معاشرہ کتنا مہذب اور تعلیم یافتہ ہے اس کا اندازہ ہمیں اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ اخلاقی قدروں کا کس قدر احترام کرتا ہے۔ انشا نے مشرق وسطیٰ کی سیاحت کے دوران جہاں اس خطے کے بعض ممالک کی اشیاء اور مظاہر کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ ان ممالک میں اخلاقی قدروں کی صورتحال کا بھی جائزہ لیا اور ان کا تقابل پاکستانی معاشرے میں موجود اخلاقی قدروں کی صورتحال سے کر کے اشتراکات اور اختلافات کی صورتوں کو واضح کیا۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو بیان کیا جاتا ہے۔

عزت نفس:

ایران قیام کے دوران انشا کو وہاں کے معاشرے کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ انھوں نے ایرانی معاشرے کے بارے میں جہاں دیگر معلومات کو اہمیت دی وہیں وہاں اخلاقی قدروں کے حوالے سے موجود صورتحال کا جائزہ بھی لیا۔ جب وہ اخلاقی اعتبار سے پاکستانی اور ایرانی معاشرے کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں ہر شخص کی عزت نفس کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ وہاں کسی شخص کو محض اس کے کام یا پیشے کے باعث عزت وتکریم یا ذلت وتحقیر کا حق دار نہیں ٹھہرایا جاتا۔ جب کہ ہمارے ہاں کسی شخص کے عہدے اور مرتبے ہی کو اس کی عزت یا ذلت کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ انشا پاکستانی قوم کے اس غیر انسانی طرز عمل پر شدید طنز کرتے ہیں اور اخلاقی قدروں کے تقدس اور پاسداری کے حوالے سے پاکستانی قوم کے طرز عمل کو انتہائی گھٹیا اور ہیچ قرار دیتے ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں اخلاقی قدروں کے زوال کی صورتحال پر ان کا یہ طنز بالکل بجا ہے۔ واقعی ہمارے معاشرے میں کسی شخص کی عزت یا ذلت کی وجہ صرف اس کا عہدہ یا مرتبہ ہی ہوتا ہے۔ انشا عزت نفس کے حوالے سے ایرانیوں کے طرز عمل کی بابت بتاتے ہیں کہ وہاں ہر شخص کی عزت نفس کا خیال رکھا جاتا

ہے اور اس سلسلے میں ادنیٰ اور اعلیٰ کا امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔ وہ بڑے مزاحیہ انداز میں کہتے ہیں کہ وہاں تو شاید فقیروں اور گداگروں کو بھی آقا کہہ کر پکارا جاتا ہوگا اور بھیک دیتے ہوئے ان سے یہ درخواست کی جاتی ہوگی کہ حضور والا! یہ حقیر ساہدیہ قبول فرمائیں اور دعائیں لینے کی بجائے الٹا انھیں دعائیں دے کر رخصت کیا جاتا ہوگا۔ ایران میں یقیناً ہر شخص کی عزت نفس کا خیال رکھا جاتا ہوگا لیکن انشاؔ نے گداگروں اور فقیروں کی عزت وتکریم کے حوالے سے ایرانی قوم کے جس طرز عمل کا تذکرہ کیا ہے، وہ کافی حد تک زیبِ داستان معلوم ہوتا ہے۔ البتہ انھوں نے اس صورتحال کو اپنے مزاحیہ اسلوب میں جس طرح بیان کیا ہے اسے پڑھ کر قارئین خوب محظوظ ہو سکتے ہیں۔ بہر حال عزت نفس کے حوالے سے انھیں پاکستانی اور ایرانی معاشرے میں مکمل طور پر اختلاف کی صورت ہی نظر آئی۔

ذات پات کی تقسیم:

ذات پات کا نظام انسانوں کے درمیان باہمی شناخت کے لیے وضع کیا تھا۔ لیکن لوگوں نے اس نظام کو انسانوں کے درمیان باہمی عزت اور ذلت کا معیار مقرر کر لیا۔ آج پاکستان سمیت دنیا کے کئی دیگر معاشروں میں ذات پات کا نظام رائج ہے۔ انشاؔ کو مشرق وسطیٰ کے ممالک کی سیاحت کے دوران پاکستان اور اس خطے کے بعض ممالک میں ''ذات پات کے نظام'' کے بارے میں جاننے کا موقع بھی ملا۔ جب وہ ذات پات کے حوالے سے پاکستان، مصر، ایران اور بھارت کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان اور بھارت میں تو یہ نظام صدیوں سے رائج ہے اور ان دونوں ممالک میں ذات پات کا سلسلہ نسل در نسل چلا آ رہا ہے۔ البتہ جب وہ مصر میں ذات پات کے حوالے سے موجود صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی ایسا نظام رائج نہیں ہے جو انسان کی عزت یا ذلت کا سبب ہو بلکہ وہاں انسان کی صرف بحیثیت انسان عزت کی جاتی ہے یا پھر قابلیت اور اہلیت کو عزت و احترام کا معیار گردانا جاتا ہے۔ پھر وہ ایرانی معاشرے میں ذات پات کی صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ذات پات کا نظام موجود نہیں ہے، یہاں بھی ہر شخص کی عزت وتکریم کی جاتی ہے۔ انشاؔ بتاتے ہیں کہ ایران قیام کے دوران ایرانی لوگ میرا تعارف ''السیّد ابنِ انشاؔ'' کہہ کر کراتے رہے، جب وہ مجھے السیّد ابنِ انشاؔ کہہ کر پکارتے تو مارے خوشی کے میں تو پھولا نہ سماتا بلکہ اس قدر عزت واحترام پا کر میرا دل تو یہ چاہتا کہ میں یہاں سے کبھی نہ جاؤں۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان، ایران اور مصر، تینوں اسلامی ممالک ہیں لیکن پھر بھی مجھے ان تینوں اسلامی ممالک میں ذات پات کے حوالے سے مختلف صورتحال نظر آئی۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ مصر میں اگر کسی شخص کو اس کی قابلیت کی وجہ سے عزت واحترام دیا جاتا ہے تو اس قدر افزائی کی وجہ صرف اور صرف اس کا علم، قابلیت اور محنت ہوتی ہے، ذات پات کی بنا پر ایسا ہرگز نہیں کیا جاتا۔ جبکہ ایران میں تو یہ نظام سرے سے موجود ہی نہیں ہے وہاں تو ہر شخص کو عزت واحترام دیا جاتا ہے۔ البتہ جب میں خود اپنی ہی ذات کی عزت و

تکریم کے حوالے سے پاکستان اور ایران کا تقابل کرتا ہوں تو مجھے بہت افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اپنے ملک اور قوم نے تو میری قدر نہ کی حالانکہ میرا تعلق علم وادب سے ہے اور ایسے لوگوں کی تو دنیا کے تقریباً سب ہی معاشروں میں قدر کی جاتی ہے اور انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ ایران میں ہر شخص نے مجھے بہت عزت واحترام دیا یہاں تک کہ میرا شجرۂ نسب بھی سادات گھرانے سے جوڑ دیا۔ سچ پوچھیے تو میرے لیے اس سے بڑھ کر کیا عزت ہوسکتی ہے کہ کوئی مجھے السید ابنِ انشا کہہ کر پکارے۔ انشا بڑے مزاحیہ انداز میں کہتے ہیں کہ اگر ایران کے لوگوں نے میرے سیّد ہونے کی سند جاری کردی ہے تو پھر پاکستان کی انجمن وظیفہ المومنین اور بھارت کی انجمن امروہہ کو بھی چاہیے کہ وہ بھی میرے سید ہونے کی سند جاری کر دیں ورنہ میں جارحانہ طرزِ عمل کو اپناتے ہوئے سخت احتجاج کروں گا اور اپنے ساتھ ایسے سیّدوں کو بھی احتجاج میں شامل کروں گا جو صرف نام کے سیّد ہیں حالانکہ ان کا شجرہ نسب سادات گھرانے سے نہیں ملتا۔ انشا نے اس بات میں طنزِ خفیف کے ذریعے ایسے تمام معاشروں کی قلعی کھولی ہے جہاں ذات پات کا نظام رائج ہے اور اس نظام کے ذریعے نچلی ذات کے لوگوں کو اس قدر ذلت وتحقیر کا نشانہ بنایا جاتا ہے کہ بالآخر وہ لوگ اس ذلت ورسوائی سے چھٹکارا پانے کے لیے جھوٹ بولنے اور اپنی اصلیت کو چھپانے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

بہرحال، انشا نے جب ذات پات کے حوالے سے پاکستان، مصر اور ایران کا تقابل کیا تو انھیں اس تقابل میں مصر اور ایران میں تو کافی حد تک اشتراک نظر آیا لیکن پاکستان میں اس حوالے سے اختلاف کی صورت نظر آئی۔

ملاوٹ:

ملاوٹ کرنا ایک اخلاقی جرم ہے۔ ملاوٹ کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ شاید ملاوٹ کرکے وہ زیادہ منافع کما سکتا ہے حالانکہ یہ اس کی بھول ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسی آمدنی جو ناجائز طریقے سے کمائی جاتی ہے وہ خدا کی رحمت و برکت سے محروم رہتی ہے اس لیے بجائے فائدے کے الٹے نقصان کا باعث ہوتی ہے۔

انشا نے مشرقِ وسطیٰ کی سیاحت کے دوران اس خطے کے بعض ممالک میں اس اخلاقی برائی کی صورتحال کا جائزہ لیا اور اس کا تقابل پاکستانی معاشرے میں اس اخلاقی برائی سے پیدا شدہ صورتحال سے کرکے اس کے نتیجے میں آنے والے اشتراکات اور اختلافات کو واضح کیا۔ جب وہ ملاوٹ کے حوالے سے پاکستان، ترکی اور ایران کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ جان کر بڑی حیرانی ہوتی ہے کہ ترکی اور ایران میں تو ملاوٹ بالکل نہیں کی جاتی۔ یہاں تک کہ ان ممالک کے لوگ تو ملاوٹ کے لفظ سے بھی آشنا نہیں ہیں۔ جبکہ پاکستان کا حال یہ ہے کہ یہاں شاید ہی کوئی ایسی چیز ہوگی جس میں ملاوٹ نہ کی جاتی ہو۔ ترکی میں قیام کے دوران انشا ایک پاکستانی دوست، سیّد آفاق سے ملے اور ان سے ترکی میں ''ملاوٹ'' سے متعلق صورتحال کے بارے میں دریافت کیا۔ ان دونوں حضرات کے درمیان سوال و جواب کے نتیجے میں جو تقابلی صورتحال سامنے

آئی اسے انشا نے سفرنامہ دنیا گول ہے کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

''کیا یہ سب چیزیں خالص ہوتی ہیں؟'' ہم نے آفاق سے پوچھا

''بالکل۔ ناخالص کا یہاں تصور ہی نہیں ہے۔''

''لکڑی کا برادہ یہ لوگ پھینک دیتے ہوں گے۔ اس سے مرچیں نہیں بناتے؟''

''نہیں''

''لال اینٹیں تو بیکار نہ جاتی ہوں گی۔ ضرور ہلدی کی تعمیر میں کام آتی ہوں گی۔''

''بالکل نہیں''

''اور موبل آئل''

''موبل آئیل موٹر میں ضرور استعمال ہوتا ہے۔ مکھن یا گھی کے طور پر نہیں۔''

اب انھوں نے اشتیاق سے وطنِ عزیز کا حال پوچھا تو ہم نے بتایا کہ ہمارے ہاں تو بھینسوں نے بھی خالص دودھ دینا بن کر دیا ہے۔ کم از کم ہمارے گوالے کا یہی بیان ہے جب کبھی دودھ کے پتلے پن کی شکایت کریں وہ یہ عذر کرتا ہے کہ حضور کیا کریں۔ بھینسیں ہی نابکار اور بے ایمان ہیں۔ ایسا ہی دودھ دیتی ہیں۔ قربِ قیامت کی نشانی ہے۔9

یوں انشا نے درجہ بالا حوالے میں پاکستان اور ایران میں ملاوٹ کی تقابلی صورتحال کو بڑے طنزیہ ومزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ایران میں کسی بھی چیز میں ملاوٹ نہیں کی جاتی لیکن پاکستان کا حال یہ ہے کہ یہاں شاید ہی کوئی ایسی چیز ہوگی جس میں ملاوٹ نہ کی جاتی ہو۔ انھوں نے واقعی بجا فرمایا ہے پاکستان میں ملاوٹ کا کاروبار عام ہے وہ کہتے ہیں کہ پاکستان، ترکی اور ایران تینوں ہی اسلامی ممالک ہیں اور اسلام نے ملاوٹ اور بے ایمانی سے ہمیشہ روکا ہے اور کاروبار کے جائز اور حلال ذریعوں کی ہی تلقین کی ہے لیکن اس کے باوجود پاکستان میں یہ اخلاقی بُرائی موجود ہے جبکہ ترکی اور ایران اس بُرائی سے پاک ہیں۔

چوری کرنا:

چوری کرنا بھی ایک اخلاقی جرم ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب اس برائی کی اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ اس برائی سے چوری کرنے والا اور وہ شخص جس کی چیز چورائی جاتی ہے، دونوں ہی نقصان اٹھاتے ہیں۔ چوری کرنے والا غلط ذرائع سے روپے پیسے اور دیگر اشیاء حاصل کرنا شروع کر دیتا ہے جبکہ متاثرہ شخص اپنی چیز کھونے کے بعد انتہائی کرب اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یوں یہ برائی پورے معاشرے میں بگاڑ کا سبب بنتی ہے۔ انشا نے مشرق وسطیٰ کی سیاحت کے دوران اس اخلاقی برائی کے حوالے سے بھی پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کا تقابل کیا اور ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو واضح کیا۔ جب وہ چوری کے حوالے سے پاکستان اور ایران کا تقابل کرتے

ہیں تو یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس برائی کے حوالے سے ان دونوں ملکوں کے لوگ اس برائی میں ملوث ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایران قیام کے دوران ایک دن میں ایرانی سفارت کار، ہوشنگ کے ہمراہ وہاں کی منوچہری اسٹریٹ چلا گیا میں اور ہوشنگ ابھی چیزیں دیکھ ہی رہے تھے کہ اتنے میں چند ایرانی آناً فاناً میرے اردگرد جمع ہونا شروع ہوگئے۔ میں یہی سمجھا کہ شاید مجھے پاکستانی جان کر مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور مصافحہ کرنے کے لیے میرے قریب ہو رہے ہیں، میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں ایک شخص نے میری کلائی پکڑ لی، میں یہ سمجھا کہ شاید وہ شخص مجھ سے ہاتھ ملانا چاہتا ہے۔ میں ابھی اس خیال میں تھا کہ اس نے میری کلائی پر بندھی گھڑی زبردستی اتارنا شروع کر دی۔ یوں مجھے اس کے نیک ارادوں کی خبر ہوئی پھر میں نے بڑی تگ و دو سے اس کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ ایرانی سفارتکار ہوشنگ اپنی قوم کے اس طرزِ عمل پر بہت شرمسار ہوئے اور مجھ سے معذرت کرنے لگے۔ میں نے ان سے کہا کہ اس میں آپ کا کیا قصور اور نہ ہی اس سلسلے میں آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔ انشا بتاتے ہیں کہ میرے ایران کے سفر کے کچھ عرصہ بعد ہی ایرانی سفارت کار، ہوشنگ کا پاکستان آنا ہوا۔ میں اس وقت پاکستان سے باہر تھا لیکن میں نے اپنے ایک دوست سے درخواست کی کہ وہ میری خاطر حق میزبانی ادا کرتے ہوئے ہوشنگ کا ہر طرح سے خیال رکھیں۔ چنانچہ جب ہوشنگ پاکستان آئے تو یہی پاکستانی دوست ہوشنگ کو مسجد وزیر خان دکھانے لے گئے۔ مسجد کی زیارت کرنے والوں کو اس کی تعظیم میں جوتے تو باہر ہی اتارنے پڑتے ہیں لہٰذا ان دونوں صاحبان نے بھی جوتے باہر ہی اتار دیئے۔ مسجد دیکھنے کے بعد جب وہ دونوں باہر آئے تو انھیں معلوم ہوا کہ کوئی شخص ان کے جوتے چوری کر کے لے گیا ہے۔ جس طرح ہوشنگ کو ایران میں اپنی قوم کے طرزِ عمل پر شرمندہ ہونا پڑا تھا اسی طرح ان پاکستانی صاحب کو بھی اپنی قوم کے اس طرزِ عمل پر بہت شرمسار ہونا پڑا۔ ان پاکستانی صاحب نے پہلے تو اپنے جوتے ہوشنگ کو پہنائے لیکن وہ جوتے سائز میں بڑے تھے۔ پھر انھوں نے کسی واقف کار کے جوتے مانگ کر ہوشنگ پہنائے، یہ جوتے بھی ان کے پاؤں میں بڑے تھے تاہم پھر بھی انھیں پہن کر وہ چل سکتے تھے۔ یوں پاکستانی صاحب بڑی مشکل سے انھیں جوتوں کی دکان تک لائے اور وہاں انھیں نئے جوتے خرید کر دیئے اور اس طرح ان کی اور ہوشنگ کی مشکل آسان ہوئی۔ بہرحال ان دونوں واقعات میں انشا نے یہ بتایا کہ پاکستانی اور ایرانی لوگ دونوں ہی چوری جیسے جرم میں ملوث ہوتے ہیں اور اس حوالے سے ان میں مکمل اشتراک موجود ہے۔

بے حیائی:

بے حیائی بھی ایک اخلاقی برائی ہے۔ اسلام نے بے حیائی سے ہمیشہ روکا ہے اور اس اخلاقی برائی کو ایک مسلمان کے ایمان کے لیے نقصان دہ قرار دیا ہے۔ اسلام کے مطابق حیا وہ سرچشمہ ہے جس سے ہر نیکی اور بھلائی پھوٹتی ہے اور بے

حیائی ہر بدی اور برائی کی جڑ ہے۔ پاکستان اور ایران گو کہ دونوں اسلامی ممالک ہیں لیکن انشا کو ان دونوں اسلامی ممالک میں اس اخلاقی برائی کے حوالے سے مکمل اشتراک نظر آیا۔ وہ اشتراک کیا ہے؟ اسے انھوں نے سفر نامہ *ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

''باقی رہے نائٹ کلب، سو یہاں بھی ہیں اور سُنا ہے ایک سے ایک بڑھ کر مسافر نواز عیش ڈھونڈنے والے کو دُنیا بھی نئی دیتے ہیں۔ تھیٹر بھی ہیں اور سینما بھی۔ سینما تو یہی دیکھئے سامنے کیا عمدہ ہے۔ کونسی تصویر لگی ہے۔ آوارہ؟ راج کپور؟ نرگس؟ حضرت اِدھر بھی ایک نظر۔ تاج محل! بینا رائے اور پردیپ کمار! آوارہ چھ سینماؤں میں چل رہی ہے''۔[10]

یوں انشا نے درجہ بالا حوالے سے یہ بتانے کی کوشش کی کہ پاکستان اور ایران میں اسلامی ممالک ہونے کے باوجود بے حیائی عام ہے اور ان ممالک میں اس اخلاقی برائی کے بہت سے ذرائع ہیں۔ انھوں نے درجہ بالا حوالے میں خفیف طنزیہ پیرائے میں ایران اور پاکستان میں اس اخلاقی برائی کے حوالے سے موجود صورتحال پر گہری چوٹ کی۔ ان کا یہ طنز اور تنقید بالکل بجا ہے۔

اس کے بعد انشا اخلاقی قدروں کے حوالے سے پاکستانی قوم کا تقابل دنیا کی دیگر اقوام سے کرتے ہوئے بڑے طنزیہ لب و لہجے میں یہ کہتے ہیں کہ یوں تو ہم مسلمان ایک خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور خوف خدا کے دعویدار بنے پھرتے ہیں۔ لیکن آپ حیران ہوں گے کہ ہمارے ایمان پر ہمارے جھوٹ بولنے، ملاوٹ کرنے، کم تولنے، ظالموں کا ساتھ دینے اور مظلوموں کی مدد نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ ہماری قوم تو حرام و حلال کی حدود بھی خود ہی متعین کرتی ہے۔ ایک طرف تو ہم لوگ شراب پیتے ہیں اور دوسری طرف گوشت صرف حلال ہی کھاتے ہیں۔ اللہ کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں اور ہر بے ایمانی کے کام کا آغاز اللہ کے نام ہی سے کرتے ہیں تا کہ اس کام میں برکت رہے لیکن بے ایمانی کے کاموں سے باز ہرگز نہیں آتے۔

بہر حال انشا نے پاکستان، مشرق وسطیٰ اور دنیا کی کئی دیگر اقوام کا تقابل اخلاقی اعتبار سے کیا اور یہ بتایا کہ پاکستانی قوم اخلاقی اعتبار سے سب سے زیادہ پستی کا شکار ہے۔

سماجی اقدار

ہر معاشرے کی اپنی سماجی اقدار ہوتی ہیں جو ہو سکتا ہے کہ ایک معاشرے میں تو بہت پسندیدہ ہوں لیکن کسی دوسرے معاشرے میں اتنی پسندیدہ نہ ہوں یا سرے سے قابلِ قبول ہی نہ ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سماجی اقدار کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا کوئی نہ کوئی تہذیبی اور ثقافتی پس منظر ضرور ہوتا ہے۔ بہر حال انشا کو مشرق وسطیٰ کی سیاحت کے دوران اس خطے کے بعض ممالک کی سماجی اقدار کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کا موقع بھی ملا۔ انھوں نے ان ممالک

کی سماجی اقدار کا تقابل اپنے ملک کی سماجی اقدار سے بھی کیا اور ان کے درمیان موجود اشتراک اور اختلافات کو پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔

انشا نے دوران سیاحت جن سماجی اقدار کا تقابلی مطالعہ کیا وہ درج ذیل ہیں۔

ا۔ دوستی:

دوستی ایک ایسا رشتہ ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ کیونکہ ایک مخلص اور ہمدرد دوست خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہوتا ہے۔ جب وہ دوست بنانے اور دوستی کے آداب نبھانے کے حوالے سے پاکستانی اور یورپی اقوام کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں دونوں جانب صریحاً اختلاف نظر آتا ہے۔ کیونکہ پاکستانی قوم تو دوستی کے رشتے کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور دوستی کے آداب نبھانے میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ جبکہ اہل یورپ نہ تو دوستی کے رشتے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور نہ ہی اس سماجی قدر کو نبھانے میں پاکستانی قوم کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس حقیقت کا ادراک انھیں اس وقت ہوا جب وہ یورپ کے سفر پر گئے۔ انشا کہتے ہیں کہ وہاں قیام کے دوران نہ تو کسی شخص نے میری آؤ بھگت کی اور نہ ہی مجھ سے میرا کلام سننے کی فرمائش کی۔ لہٰذا ہر شاعر کی طرح میرے لیے تو یہی دکھ سب سے بڑا تھا کہ کسی شخص نے مجھ سے میرا کلام نہیں سنا۔ یوں یورپ کے سفر کے دوران مجھے اپنا ملک بار بار یاد آیا اور اپنے دوستوں کی کمی کا احساس شدت سے ہوا۔ جو نہ صرف میری خاطر تواضع کرتے تھے بلکہ مجھ سے میرا کلام بھی سنتے تھے۔ البتہ جب میں مصر گیا تو وہاں قیام کے دوران میری ملاقات چند پاکستانی دوستوں سے ہوئی جن سے ملنے کے بعد وطن سے دوری اور دوستوں کی عدم موجودگی کے باعث جو خلا میرے دل میں پیدا ہوا تھا، وہ یکسر دور ہو گیا۔ وہ اس کی تفصیل بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ مصر میں میری ملاقات سردار انور خان، بیگم سجاد حیدر اور عبدالباری انجم سے ہوئی۔ سردار انور صاحب مصر میں پاکستانی سفارت خانے میں خدمات سرانجام دے رہے تھے، جب وہ مجھ سے ملے تو بے حد خوش ہوئے۔ انھوں نے ہوٹل لے جا کر میری بڑی پرتکلف دعوت کی جس میں طرح طرح کے لذیز اور مزیدار کھانے شامل تھے۔ اسی طرح بیگم سجاد حیدر نے بھی مجھے چائے پر بلایا، انھوں نے چائے میں بغداد کی مشہور مٹھائی من وسلوٰی، سموسے اور کئی دوسری چیزوں سے میری خاطر مدارت کی۔ میں نے بڑے مزے سے یہ ساری چیزیں کھائیں۔ البتہ من وسلوٰی نامی مٹھائی مجھے کچھ اتنی پسند نہ آئی تو بیگم سجاد نے سموسے میرے سامنے رکھ دیئے۔ سموسے واقعی بہت ذائقہ دار تھے میں نے بھی خوشی میں آ کر تقریباً آدھی درجن سموسے کھا لئے لیکن پھر بھی میرا شکم سیر نہ ہوا۔ بہر حال بیگم سجاد نے بھی میری خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اسی طرح عبدالباری صاحب نے بھی دوستی کا حق پوری طرح نبھانے کی کوشش کی۔ یہ صاحب ریڈیو اسٹیشن میں بڑی اہم ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔ انھوں نے بھی میری دعوت کی جس میں بھنے ہوئے کبوتروں سے میری تواضع کی گئی، اس کے علاوہ انھوں نے مجھے مصر کے قابل دید مقامات کی سیر بھی

کروائی۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر ان سے مل کر سب سے بڑی خوشی تو مجھے یہ ملی کہ انھوں نے مجھ سے میرا کلام سنا جسے سنانے کے لیے میں یورپ کے سفر کے دوران ترستا رہا لیکن کسی نے رسماً بھی مجھ سے اس کی فرمائش نہ کی۔

بہر حال انشا کو دوست بنانے اور دوستی کے آداب نبھانے کے حوالے سے پاکستانی لوگ یورپی اقوام سے کہیں بہتر نظر آئی اور اس حوالے سے ان دونوں اقوام میں خاصا اختلاف نظر آیا۔

۲۔ شوہر کی خدمت:

انشا نے اپنے سرکاری فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر اختیار کیا۔ ان ممالک میں قیام کے دوران جہاں انھوں نے جہاں ان ممالک کی اشیاء ومظاہر کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا وہیں وہاں کے لوگوں کے بارے میں جاننے کی کوشش بھی کی۔ انھیں جہاں کہیں بھی کوئی موقع ملا انھوں نے ان ممالک کے معاشروں کو قریب سے دیکھنے کی کوشش ضرور کی اور یہاں رشتوں کے تقدس واحترام اور شکست وریخت کی مجموعی کیفیت کا جائزہ بھی لیا۔ انھوں نے ان معاشروں کے بارے میں حاصل کی گئی معلومات کا تقابل پاکستانی معاشرے کی متعلقہ معلومات سے کر کے اس کے نتیجے میں آنے والے اشتراکات اور اختلافات کو واضح کرنے کی کوشش کی جنھیں ذیل میں بیان کیا جا رہا ہے۔

ایران، پاکستان، افغانستان اور عرب ممالک کی سیّاحت کے دوران انشا کو ان ممالک کی معاشرتی اور خانگی زندگی کے بارے میں جاننے کا موقع بھی ملا۔ ان ممالک میں قیام کے دوران انھیں اس بات کا اندازہ بھی ہوا کہ ان ممالک کی خواتین اپنے شوہروں کی اتنی خدمت نہیں کرتیں جتنی پاکستانی اور ہندوستانی خواتین کرتی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان ممالک کی خواتین شوہر حضرات کی خوشنودی کے لیے اپنے آپ کو کسی مشکل یا بے آرامی میں نہیں ڈالتیں۔ اس لیے یہ خواتین کھانا تو پکاتی ہیں لیکن روٹی خود نہیں پکاتیں بلکہ نانبائی کی دکان سے منگواتی ہیں۔ جبکہ پاکستانی اور ہندوستانی خواتین اپنے خاوند حضرات کا اس قدر خیال رکھتی ہیں کہ دن تو دن اگر آدھی رات کو بھی وہ گھر آئیں تو انھیں تازہ گرم روٹی بنا کر دیتی ہیں۔ یوں انشا کو شوہر کی عزت واحترام اور خدمت کے حوالے سے پاکستان اور بھارت کی خواتین میں تو اشتراک نظر آیا لیکن اس حوالے سے ایران، افغانستان اور عرب ممالک کی خواتین میں خاصا اختلاف نظر آیا۔

۳۔ اہلِ علم کی قدر افزائی:

علم وہ دولت ہے جس نے ایک حیوانِ ناطق کو ایک مہذب اور تہذیب یافتہ انسان میں ڈھال دیا۔ یوں انسان کی یہ ساری ترقی وخوشحالی اور کامیابی صرف اور صرف علم اور آگاہی ہی کی بدولت ہے۔ ایک تعلیم یافتہ اور مہذب انسان ہی اہلِ علم وادب کی عزت وتکریم کرتا ہے کیونکہ وہی علم کی اہمیت، افادیت اور قدر ومنزلت سے واقف ہوتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ دنیا میں یہ ساری روشنی اور نور صرف اور صرف علم ہی کے اثر کا نتیجہ ہے۔ یوں جو معاشرہ جس قدر مہذب اور تہذیب یافتہ ہوتا

ہے اسی قدر وہاں اہل علم و دانش کی عزت و تکریم کی جاتی ہے۔ انشا بھی اہلِ علم و ادب کا بہت احترام کرتے تھے۔ بلکہ ان کا اپنا تعلق بھی علم و ادب سے تھا اس لیے انھوں نے بحیثیت قلمکار، پاکستان اور دیگر ممالک میں اہل علم و دانش کی عزت و تکریم اور قدر افزائی کا جائزہ بھی لیا اور اس حوالے سے موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت بھی کی۔

انشا کو ان کی سرکاری مصروفیات کے بوجہ مصر میں سفر و حضر کا موقع بھی ملا۔ وہاں قیام کے دوران انھوں نے مصری لوگوں کے اخلاق اور کردار کو اپنی توجہ کا مرکز بھی بنایا۔ انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مصر میں صاحب علم حضرات کی بہت قدر کی جاتی ہے جبکہ پاکستان میں ایسے لوگوں کی کوئی قدر نہیں کی جاتی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس بات کا اندازہ مجھے مصر قیام کے دوران اس وقت ہوا جب میں نے ایک چوک پر میدانِ تحریر لکھا ہوا دیکھا۔ میں نے ان الفاظ سے یہ مطلب نکالا کہ شاید اس چوک کو اہل علم و ادب کی قدر افزائی اور خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ان کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ میں بھی تو ایک قلمکار ہوں اور میرا تعلق بھی علم اور علمی دنیا سے ہے لیکن مجھے اپنے ملک میں ایسی عزت اور قدر افزائی نصیب نہیں ہے۔ میں نے تو اپنے ذاتی خرچ سے اپنے نام کی ایک تختی بنوا کر صرف اپنی ہی گلی کے کونے میں لگائی تھی لیکن میرے ملک کی کارپوریشن والوں کو میری اتنی سی عزت بھی گوارا نہ ہوئی اور انھوں نے اس تختی کو اتار پھینکا۔ مصر میں اہل علم کی قدر افزائی کو جب میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تو میرا دل بجائے خوش ہونے کے اور بھی رنجیدہ ہو گیا۔ البتہ جب میں نے مصر میں مقیم ایک پاکستانی دوست، پروفیسر محمد حسن اعظمی کو مصر میں صاحبِ علم حضرات کی قدر افزائی کے بارے میں اپنی معلومات سے آگاہ کیا۔ تو انھوں نے مجھے بتایا کہ بے شک مصر میں اہلِ علم کی بہت قدر کی جاتی ہے لیکن میدان تحریر سے مراد لبریشن سکوائر ہے اور تحریر کا لفظ حریت سے نکلا ہے۔ پھر میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ کیا یہاں محرر اور چونگی محرر کا مطلب یہی ہے کہ یہ اہلکار اپنے اختیارات میں مکمل طور پر آزاد ہیں۔ تو انھوں نے کہا نہیں، یہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں تمام سرکاری اہلکار اصول و ضوابط کی سختی سے پابندی کرتے ہیں، پاکستان ہی وہ ملک ہے جہاں سرکاری اہلکار، قانون کی پابندی کے معاملے میں بالکل آزاد اور خود مختار ہیں۔ ایسی آزادیوں کی عادت صرف پاکستانی اہلکاروں ہی کو ہے۔ یہاں کے اہلکاروں کو ایسی آزادی اور خود مختاری کی عادت نہیں ہے۔

المختصر، انشا نے مختلف سماجی قدروں کے حوالے سے پاکستان، مشرق وسطیٰ اور کئی دیگر ممالک کا تقابل کیا اور اس تقابل کے نتیجے میں انھیں اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں ہی نظر آئیں۔

رہن سہن

ہر انسان ایک انفرادی شخصیت کا مالک ہے۔ اس کی انفرادیت میں یوں تو بہت سے عوامل اور عناصر نمایاں کردار ادا کرتے ہیں لیکن ان عوامل و عناصر میں ایک اہم عنصر اس کا طرزِ زندگی یا رہن سہن کا طریقہ بھی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کوئی

شخص صرف اپنے بہتر طرزِ زندگی ہی کی وجہ سے نمایاں ہو جائے بلکہ کئی بار تو کسی شخص کا غیر معیاری طرزِ زندگی بھی اس کی پہچان بن جاتا ہے۔ایک معاشرہ یوں تو بہت سے افراد کا مجموعہ ہوتا ہے جہاں نہ صرف ہر فرد دوسرے فرد سے مختلف ہوتا ہے بلکہ اس کا رہن سہن بھی دوسرے افراد سے مختلف ہوتا ہے لیکن افراد کے مجموعی رہن سہن سے معاشرے کے مجموعی رہن سہن کا کسی قدر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انّشا نے مشرق وسطیٰ کی سیاحت کے دوران اس خطے کے ممالک کے بارے میں دیگر معلومات حاصل کیں وہیں وہاں پر بسنے والے لوگوں کے طرزِ زندگی کا مشاہدہ کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس مطالعے اور مشاہدے سے انھیں جو معلومات حاصل ہوئیں ان کا تقابل انھوں نے پاکستانی معاشرے سے بھی کیا اوران کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو جاننے کی کوشش کی۔

انّشا کو ایران جانے کا موقع کئی بار ملا۔ وہاں قیام کے دوران انھوں نے وہاں کے گلی کوچوں، بازاروں اور دیگر مقامات کی سیر کی اور وہاں بسنے والے لوگوں کے رہن سہن کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس دوران انھیں یہاں صفائی کا اعلیٰ انتظام وانصرام دیکھنے کو ملا جس سے انھیں یہ پتا چلا کہ ایران میں صفائی کی صورتحال پاکستان کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے۔ پھر وہ صفائی کے حوالے سے پاکستان، ایران، انگلینڈ، بلجیئم، فرانس اور ہالینڈ کا تقابل کرتے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ایران، انگلینڈ، اور بلجیئم میں تو صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے، یہی نہیں بلکہ ان ممالک میں صفائی کی موجود صورتحال کو اس سلسلے کی بہترین مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ایرانی سفارت کار، ہوشنگ کی زبانی انھیں یہ معلوم ہوا کہ فرانس اور انگلینڈ میں صفائی کی صورتحال اتنی تسلی بخش نہیں ہے۔ انّشا بتاتے ہیں کہ طہران کی سیاحت کے دوران میں وہاں صفائی کے سلسلے میں کیے گئے اعلیٰ انتظامات اور صفائی کی بہتر صورتحال سے بے حد متاثر ہوا۔ میں نے ایرانی سفارت کار، ہوشنگ سے کہا کہ اکثر لوگ طہران کو فرانس کے مشہور شہر پیرس سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ یہ سن کر ہوشنگ بجائے خوش ہونے کے برہم ہونے لگے اور کہنے لگے کہ جناب آپ ہمارے شہر طہران کو لندن اور پیرس جیسے شہروں سے تشبیہہ دے رہے ہیں جو صفائی اور ستھرائی کی بجائے گندگی اور غلاظت کی وجہ سے مشہور ہیں۔ شاید کسی دور میں ان دونوں شہروں کا شمار دنیا کے صاف ستھرے اور خوبصورت شہروں میں ہوتا ہوگا لیکن اب تو یہ دونوں شہر گندگی اور غلاظت کا ڈھیر بن چکے ہیں۔ پیرس اور لندن کی عام عمارات پر دھول، مٹی اور کائی جمی ہوئی ہے جو ان عمارات کی بدحالی، خستگی اور گندگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ چلیئے جناب عام عمارات کی بات تو رہنے دیجئے وہاں کی سب سے اہم سرکاری عمارت وائٹ ہاؤس کے درودیوار سے بھی غلاظت ٹپکتی ہے۔ حالانکہ اس عمارت کو تو ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وائٹ ہاؤس، کے نام ہی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سفید رنگ کی کوئی صاف ستھری، عالیشان اور پرشکوہ عمارت ہوگی اور ہوسکتا ہے کسی زمانے میں یہ عمارت ان خوبیوں کی حامل ہو بھی۔ لیکن اب اس عمارت کا سفید رنگ دھول، گندگی، مٹی اور غلاظت کے باعث سیاہ پڑ چکا ہے بلکہ میرے مطابق تو یہ وائٹ ہاؤس کی بجائے اب کوئلے کا ڈپو معلوم ہوتی ہے۔ آپ ذرا یہ سوچئے کہ جب وائٹ ہاؤس!! جیسی سرکاری

عمارت جو پوری دنیا میں انگلستان کی شناخت ہے جب وہاں صفائی کی صورتحال اس قدر ناقص ہے تو پھر باقی ملک میں صفائی کی صورتحال کیا ہوگی۔ ہوشنگ کہنے لگے مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے آپ کو ان ممالک میں گئے ہوئے کافی عرصہ ہو چلا ہے اس لیے آپ ان ممالک میں صفائی کی موجودہ صورتحال سے آگاہ نہیں ہیں۔ اگر آپ ان ممالک میں صفائی کی موجودہ صورتحال سے واقف ہوتے تو ہمارے شہر طہران کا مقابلہ لندن اور پیرس جیسے شہروں سے نہ کرتے۔ ہاں اگر آپ ہمارے شہر کی مثال ہالینڈ اور بیلجیم سے دیتے تو پھر یہ بات کسی حد تک مناسب تھی۔

انشا کو صفائی کے حوالے سے جہاں پاکستان اور ایران میں اختلاف نظر آیا وہیں اس حوالے سے ان دونوں ممالک میں اشتراک کی صورت بھی نظر آئی۔ کیونکہ جب وہ ایران کے ایک قصبے رے کا تقابل چا کیواڑہ کے دیہاتی علاقوں سے کرتے ہیں تو انھیں ان میں اشتراک کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ ان اشتراکات کی تفصیل بتاتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ پہلا اشتراک تو مجھے ان میں یہ نظر آیا کہ یہ دونوں علاقے بہت گندے ہیں اور ان میں جگہ جگہ کیچڑ ہی کیچڑ نظر آئی۔ اس کے علاوہ ایرانی قصبے رے میں ایک گھوڑا گاڑی کا اڈہ ہے جو کہنے کو تو ٹیکسی کا اڈہ لیکن اس میں ہر طرف گھوڑا گاڑیاں ہی دکھائی دیتی ہیں۔ اس اڈے کے ساتھ ہی ایک بازار ہے جس کا نام تاسقف ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جس طرح ایرانی قصبے رے میں گھوڑا گاڑی کے اڈے کے ساتھ ہی ایک بازار ہے اسی طرح چا کیواڑہ کے دیہاتی علاقے کے ساتھ بھی وہاں کی مشہور لی مارکیٹ موجود ہے۔ یوں انشا کو ایرانی قصبے رے میں اور چا کیواڑہ کے دیہی علاقہ جات میں ہر طرف گندگی، غلاظت، جابجا کیچڑ کی موجودگی اور ان دیہی علاقوں کے ساتھ ہی ایک بازار یا مارکیٹ کی موجودگی کے حوالے سے اشتراک کی کئی صورتیں نظر آئیں۔

بازار

آج دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جہاں کوئی بازار یا مارکیٹ موجود نہ ہو۔ بازار آمد و رفت، چہل پہل اور خریداری کا مرکز ہوتے ہیں۔ بازار ایسی جگہ ہے جہاں مختلف اقسام کی خوردنی اشیاء، ساز و سامان، آلات، کپڑے، اشیائے خورد و نوش اور دیگر اشیاء موجود ہوتی ہیں تاکہ انسان اپنی ضرورت کی تمام اشیاء ایک ہی جگہ سے خرید کر اپنے وقت اور روپے کی بچت کر سکے۔

مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کی سیاحت کے دوران انشا کو یہاں کے بازار دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ ایک سیاح کے لئے پرکشش جگہ وہاں کے بازار بھی ہوا کرتے ہیں جہاں وہ کئی طرح کی معلومات حاصل کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں آ کر وہ نہ صرف اس ملک کی اشیاء سے متعارف ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات تو اسے یہاں دیگر ممالک کی اشیاء بھی نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مختلف اشیاء کی دکانوں کا مشاہدہ کرتا ہے، اشیاء کی متنوع اقسام سے آگاہی حاصل کرتا ہے، قیمتوں کا تقابل کرتا

ہے، گاہک اور دکاندار کے طرزِ عمل کا بغور مشاہدہ کرتا ہے اور یہیں آ کر اسے لوگوں کی قوتِ خرید کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ یوں ہر سیاح کی طرح انشا کے لئے بھی بازار پرکشش جگہ رہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کے سفر کے دوران انھوں نے اس خطے کے بازاروں کو اپنی خاص توجہ کا مرکز بنایا اور ان کا تقابل پاکستانی بازاروں سے مختلف حوالوں سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کے پہلوؤں کو نمایاں کیا۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو بیان کیا جاتا ہے۔

انشا کو متعدد بار ایران کے سفر کا موقع ملا۔ وہاں قیام کے دوران سب سے پہلے تو ان پر یہ حقیقت کھلی کہ ہمارے ہاں بازار سے مراد ایسی جگہ ہے جو خرید و فروخت کا مرکز ہو لیکن ایران کے شہر طہران اور اصفہان میں لفظ بازار کے حوالے سے انھیں خاصا اختلاف نظر آیا۔ اس اختلاف کو انھوں نے سفر نامہ *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے۔

> ''بازار کا مطلب طہران یا اصفہان میں عام بازار نہیں بلکہ پُرانا چھتا ہوا بازار ہے۔ جس میں محرابی دروازوں کی دُکانیں ہوتی ہیں۔ طہران میں اسے بازار بزرگ کہتے ہیں اصفہان میں فقط بازار۔''[۱۲]

درجہ بالا حوالے میں انشا نے بتایا ہے کہ لفظ بازار پاکستان اور ایران دونوں ممالک میں اپنے مختلف معانی رکھتا ہے۔

اس کے بعد انشا پاکستان اور ایران کے بازاروں کا تقابل کرتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ طہران شہر کے بازار کراچی کے بازاروں کے مقابلے میں زیادہ صاف ستھرے تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ وہاں کے بازاروں میں موجود دکانیں نہ صرف زیادہ صاف ستھری تھیں بلکہ زیادہ آراستہ و پیراستہ بھی تھیں۔ انھوں نے ایک سبزی کی دکان کا معائنہ کیا، اس دکان میں سجائی گئی سبزیاں بہت صاف، چمکدار اور خوش رنگ معلوم ہو رہی تھیں یوں یہ دکان صفائی اور قرینے کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ وہ بتاتے ہیں باقی دکانوں کو چھوڑیئے، موچی کی دکان تک میں صفائی کی صورتحال قابل دید تھی۔

اس کے بعد انشا طہران میں موجود مختلف نوعیت کے بازاروں کی تفصیل بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں جدید طرز کے ڈپارٹمنٹل اسٹور بھی موجود ہیں اور روایتی طرز کے بازار بھی۔ جدید طرز کے اسٹور میں فروش گاہ فردوسی زیادہ مشہور ہے۔ یہ اسٹور چار منزلہ عمارت پر مشتمل ہے جس کی ہر منزل پر لوگوں کی ضروریات کے مطابق سامان کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ اس اسٹور میں روایتی سامان کے ساتھ ساتھ جدید ملکی اور غیر ملکی سامان بھی موجود تھا۔ بازار بزرگ کی تفصیل بتاتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس چھتے ہوئے بازار کا راستہ بہت تنگ ہے، اس کے دونوں جانب دکانیں ہیں۔ یہ تنگ راستہ تھوڑی دور جا کر دو شاخوں اور پھر مزید کئی شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اس روایتی بازار میں ہر طرح کا سامان کثرت سے موجود تھا بلکہ اس بازار کی کئی گلیاں تو خاص کسی ایک چیز کے لئے ہی مخصوص کی گئی تھیں، جہاں ایک ہی چیز کی متنوع اقسام موجود تھیں۔ اس بازار میں بھی ہمارے ملک کے جوڑ کا سارش اور گہما گہمی تھی اور تل بھر رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ انشا بتاتے ہیں کہ بازار بزرگ جو یہاں کا پرانا اور روایتی بازار تھا، صرف نام کے اعتبار ہی سے روایتی تھا حالانکہ اس بازار کی تمام دکانیں جدید قسم کے غیر ملکی

سامان سے بھری پڑی تھیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس بازار میں بھاؤ تاؤ کرنے کی سہولت بھی موجود تھی جب کہ فروش گاہ فردوسی میں یہ سہولت موجود نہ تھی۔ پاکستانیوں کو چونکہ بھاؤ تاؤ کرنے کی عادت ہوتی ہے اس لئے آنشا کو بھی اپنے باقی ہم وطنوں کی طرح فروش گاہ فردوسی کی بجائے یہاں کے بازار بزرگ میں خریداری کا زیادہ مزا آیا۔ انھوں نے اس بات کا مشاہدہ بھی کیا کہ طہران کے جدید طرز کے ڈپارٹمنٹل اسٹور ہوں یا یہاں کے روایتی بازار، دونوں جگہ دکاندار مغربی لباس اور وضع قطع ہی کو اپناتے ہیں۔

طہران میں خریداری کا ایک بڑا مرکز لالہ زار بھی ہے۔ آنشا بتاتے ہیں کہ اس بازار میں یوں تو ہر قسم کی اشیاء دستیاب تھیں لیکن یہاں زیادہ دکانیں کپڑوں کی تھیں۔ یہاں بھی بھاؤ تاؤ کی سہولت موجود تھی اور دکاندار بہلا پھسلا کر گاہکوں کو زیادہ خریداری کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ گویا پاکستانیوں کی طرح یہ لوگ بھی مشرقیت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

اس کے بعد آنشا طہران کے ایک اور تجارتی مرکز خیابان شاہرضا کا احوال بتاتے ہیں کہ یہاں تمام دکانیں ایسی صاف و شفاف تھیں جیسے آئینہ خانہ۔ یہ دکانیں جدید طرز کی تھیں اس لئے ان کے دروزے بھی شیشے کے تھے جو صاف و شفاف ہونے کے باعث جگمگا رہے تھے۔ یہاں کی دکانیں مختلف طرح کے ملکی و غیر ملکی سامان سے بھری پڑی تھیں۔ یہاں صفائی وستھرائی کے اعلیٰ انتظام، چمک دمک اور رونق کو دیکھ کر انھیں یوں لگا جیسے وہ ایران کی بجائے یورپ میں ہوں۔ جب وہ لاہور کے مشہور تجارتی مرکز انارکلی کا تقابل طہران کے مشہور تجارتی مرکز لالہ زار سے کرتے ہیں تو انھیں لالہ زار ہر حوالے سے لاہور کی انارکلی سے بہتر نظر آتا ہے۔ البتہ جب وہ لندن کے مشہور تجارتی مرکز الفنسٹن اسٹریٹ کا تقابل ایران کے تجارتی مرکز لالہ زار سے کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں تجارتی مراکز میں کافی حد تک اشتراک کی صورت نظر آتی ہے۔ الفنسٹن اسٹریٹ وہ تجارتی مرکز ہے جو پوری دنیا میں اپنی شہرت رکھتا ہے جہاں ہر قسم کے سامان کی متنوع اقسام با آسانی دستیاب ہو جاتی ہیں۔ یوں یہ تجارتی مرکز رونق، چہل پہل اور متنوع اقسام کی اشیاء کی دستیابی کے لئے دنیا بھر میں اپنی شہرت رکھتا ہے۔ ایران کا تجارتی مرکز لالہ زار یقیناً ایک اچھا تجارتی مرکز ہو گا لیکن آنشا نے اسے دنیا کے مشہور تجارتی مرکز الفنسٹن اسٹریٹ کے ہم پلہ قرار دے کر اس تجارتی مرکز کی تعریف و توصیف میں کچھ زیادہ ہی مبالغے سے کام لیا ہے جو بے جا ہے۔

اس کے بعد آنشا پاکستان اور ایران میں گوشت کی دکانوں میں صفائی کی صورتحال کا جائزہ بھی لیتے ہیں اور اس تقابل میں وہ ترکی کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان میں گوشت کی دکانوں میں صفائی وستھرائی کی صورتحال بہت ہی ناقص ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ہاں کے قصاب صحت کے معاملے میں صفائی کی ضرورت اور اہمیت سے واقف ہی نہیں ہیں اس لئے وہ نہ تو اس طرف کوئی خاص توجہ دیتے ہیں اور نہ ہی حکومت کی طرف سے کیے گئے

اقدامات کی پیروی کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔اس کی ایک وجہ تو شاید یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہماری قوم کو کسی اصول اور ضابطے کی پابندی کرنے کی عادت ہی نہیں ہے۔اگر حکومت ان اقدامات پر عمل درآمد کرانے میں ذرا سختی کا مظاہرہ کرے بھی تو ہمارے ہاں کے دکاندار سزا اور جرمانے کے ڈر سے چند دن تک تو ان اقدامات کے پابند رہتے ہیں لیکن جلد ہی نرمی کا شائبہ پانے پر اپنی پرانی ڈگر پر واپس آجاتے ہیں۔اس کے بعد انشا ایران اور ترکی میں موجود گوشت کی دکانوں کا احوال بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ان ممالک میں حکومت کی طرف سے کسی شخص کو اس وقت تک گوشت کی دکان کھولنے کی اجازت نہیں ملتی جب تک کہ اس کے پاس فریج یا ڈیپ فریزر موجود نہ ہو۔بلکہ ایسے دیہاتی علاقے جہاں بجلی کی سہولت نہ ہونے کے سبب ان سہولیات سے استفادہ کرنا ممکن نہیں ہوتا وہاں بھی دکانوں میں جالیاں لگا کر گوشت کو مکھی، مچھر اور دیگر جراثیم سے بچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ ایران میں موجود گوشت کی دکانوں میں گوشت کو شیشے کے دروازوں میں رکھا جاتا ہے جبکہ ہمارے ہاں اسے کھلا ہی رکھا جاتا ہے۔وہاں کے قصاب صاف ستھرا لباس پہنتے ہیں اور کام کرتے ہوئے اپنے کپڑوں کو داغ دھبوں سے بچانے کے لئے ایپرن بھی پہنتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں کے قصاب اس قسم کے تکلفات کو پسند نہیں کرتے۔بہرحال انشا کو پاکستان، ایران اور ترکی میں موجود گوشت کی دکانوں میں صفائی کی صورتحال، اس سلسلے میں کیے جانے والے اقدامات، سہولیات اور قصاب صاحبان کے لباس میں اشتراک کا تو کوئی پہلو نظر نہیں آیا البتہ اختلاف کی کئی صورتیں نظر آئیں۔

اس کے بعد انشا دکانداروں اور خریداروں کے طرزِ عمل کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں اور اس سلسلے میں پاکستانی، ایرانی اور یورپی دکانداروں کے طرزِ عمل کا تقابل کرتے ہیں۔وہ بتاتے ہیں کہ ایران قیام کے دوران میں نے ایرانی سیلز خواتین کے طرزِ عمل کا بغور مشاہدہ کیا اور دیکھا کہ یہ خواتین گاہکوں کو زیادہ سے زیادہ خریداری کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔اس مقصد کے تحت وہ گاہکوں کو زیادہ سے زیادہ چیزیں دکھاتی ہیں یہاں تک کہ مطلوبہ چیز خریدنے کے بعد بھی وہ انھیں اور کئی چیزیں دکھاتی رہتی ہیں تاکہ وہ انھیں بھی خرید لیں۔جب انشا ایرانی سیلز خواتین کے طرزِ عمل کا تقابل یورپی سیلز مین سے کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں جگہ کے دکانداروں کے طرزِ عمل میں خاصا اختلاف نظر آتا ہے۔اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ یورپی سیلز مین گاہکوں کو زیادہ خریداری کرنے پر مجبور نہیں کرتے جبکہ ایرانی سیلز خواتین انھیں زیادہ سے زیادہ خریداری کرنے پر اکساتی ہیں۔اس کے بعد انشا پاکستانی اور ایرانی خریداروں کے طرزِ عمل کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی لوگوں کے مقابلے میں پاکستانی لوگ ''بھاؤ تاؤ'' کرنے میں زیادہ مہارت رکھتے ہیں بلکہ اس معاملے میں تو پاکستانی لوگ ان کے استاد ہیں۔انشا بتاتے ہیں کہ بھاؤ تاؤ کرنا پاکستانیوں کی عادت ہے جب تک ہم لوگ بھاؤ تاؤ نہ کریں اس وقت تک تو ہمیں خریداری کا مزا ہی نہیں آتا۔بلکہ خود مجھے جب طہران کے مشہور اسٹور، فروش گاہ فردوسی میں خریداری کرنے کا اتفاق ہوا تو مجھے خریداری کا ذرا بھی مزا نہ آیا کیونکہ یہاں ہر چیز کی مقررہ قیمت اس اوپر ہی درج کی گئی تھی، جس کے سبب

یہاں بھاؤ تاؤ کرنے کی گنجائش نہ مل سکی۔ البتہ میرے چہرے پر نا گواری کے تاثرات دیکھ کر ایرانی سفارت کار ہوشنگ نے فوراً میری کیفیت بھانپ لی اور مجھے بازار بزرگ چلنے کو کہا۔ اس نے ساتھ ہی مجھے یہ بھی بتا دیا کہ اس بازار میں بھاؤ تاؤ کرنے کی سہولت موجود ہے اس لئے آپ کو وہاں خریداری کا بہت مزا آئے گا۔ انشا بتاتے ہیں کہ جب ہم بازار بزرگ پہنچے اور میں نے خریداری کا آغاز کرتے ہوئے بھاؤ تاؤ میں اپنی مہارت دکھانی شروع کی تو ایرانی دکاندار میری فنکارانہ صلاحیتوں کے سامنے بے بس نظر آنے لگے اور عاجز آ کر مجھ سے پناہ مانگنے لگے۔ یوں انھوں نے بتایا کہ پاکستانی خریدار بھاؤ تاؤ کرنے میں ایرانی خریداروں کے مقابلے میں زیادہ ماہر ہیں۔

اس کے بعد انشا پاکستان اور ایران کے بازاروں میں موجود دکانوں کا تقابل کرتے ہیں تو اس تقابل میں بھی انھیں اشتراک کی ایک صورت نظر آتی ہے۔ وہ صورت یہ تھی کہ ایران کے تاسقف بازار اور لاہور کی گوالمنڈی دونوں میں دودھ جلیبیوں کی دکانیں موجود تھیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ لاہور کے گوالمنڈی چوک میں بڑی لذیذ اور مزیدار دودھ جلیبیاں ملتی ہیں جنھیں لوگ بڑے شوق سے کھاتے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ چوک دودھ جلیبیوں کی وجہ ہی سے مشہور ہے۔ اسی طرح ایران کے تاسقف بازار میں بھی مجھے دودھ جلیبیوں کی دکانیں نظر آئیں، مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ دودھ جلیبیاں پاکستان کے علاوہ ایران میں بھی ملتی ہیں۔ میں نے دودھ جلیبیاں نہ صرف خود کھائیں بلکہ ایرانی سفارت کار ہوشنگ کو بھی کھلائیں۔ انھیں بھی یہ دودھ جلیبیاں بہت پسند آئیں۔ انشا بتاتے ہیں کہ گوالمنڈی چوک کی دودھ جلیبیوں کے ذائقے سے تو میں پہلے واقف تھا اور اب تاسقف بازار کی دودھ جلیبیاں بھی میں نے کھا کر دیکھ لیں۔ ان دونوں بازاروں کی دودھ جلیبیاں مجھے ایک جیسی ہی معلوم ہوئیں یعنی میٹھی، مزیدار اور خوش ذائقہ۔ البتہ تاسقف بازار میں دودھ جلیبیاں کھانے سے انھیں ایسا لگا جیسے ان کی گوالمنڈی چوک میں بیٹھ کر دودھ جلیبیاں کھانے کی ساری یادیں تازہ ہو گئیں۔ یوں انشا کو لاہور کی گوالمنڈی چوک اور ایرانی بازار تاسقف میں دودھ جلیبیوں کی دکانوں کی موجودگی کے حوالے سے اشتراک کی ایک صورت نظر آئی۔

اشیاء کی خریداری کے سلسلے میں ایک مرحلہ ان کی پیکنگ کا بھی ہوتا ہے۔ انشا نے پیکنگ کے حوالے سے پاکستان اور دیگر ممالک کا تقابل کیا۔ اس تقابل سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں تو چیزوں کے لئے پیکنگ کو اتنا اہم ہی نہیں سمجھا جاتا اور نہ ہی اسے باقاعدہ ایک فن کا درجہ دیا جاتا ہے۔ جبکہ انگلستان، جرمنی، ہالینڈ اور سوئٹزرلینڈ سمیت دنیا کے دیگر کئی مہذب معاشروں میں اشیاء کے ساتھ ساتھ ان کی پیکنگ کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ ان ممالک میں پیکنگ کو باقاعدہ ایک فن کی حیثیت حاصل ہے اس لئے خوبصورت اور دیدہ زیب پیکنگ کو چیز کے لئے اشد ضروری سمجھا جاتا ہے۔ انشا بتاتے ہیں کہ ان ممالک کے دکاندار چیزوں کی پیکنگ اتنی خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ گاہک کا دل خواہ مخواہ ہی انھیں خریدنے کو چاہتا ہے۔ شاید اسی لئے ان کے ہاں آنے والے سیاح زیادہ خریداری کرتے ہیں اور ہمارے ہاں آنے والے

سیاح ہماری غیر معیاری پیکنگ کے باعث بہت کم خریداری کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب میں شام اور لبنان کے سفر سے واپس لوٹا تو حسب روایت کراچی ائرپورٹ پر میرے سامان کی چیکنگ کی گئی۔ اس سامان میں بڑی قیمتی اور نایاب اشیاء تھیں لیکن کسٹم والوں کو ان اشیاء میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ انشا کا ان اشیاء کو پاکستان لانے کا کیا مقصد تھا اس مقصد کی وضاحت انھوں نے سفرنامہ آوارہ گرد کی ڈائری کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کی ہے:

''ایک ڈبہ ہم نے ان کپڑوں کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ ہمارا خیال تھا اس پر کسی کی نظر نہ جائے گی لیکن کسٹم والوں کی نگاہیں بہت تیز ہوتی ہیں۔ انھوں نے اسے کھینچ لیا، ہم نے کہا۔ نہ نہ۔ اسے مت کھولئے گا۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے لیکن انھوں نے کھول ہی لیا۔

اس ڈبے کے اندر سے ایک اور ڈبہ نکلا۔ اس کے اندر ایک اور .... ایک اور .... اب لفافے شروع ہوئے ایک کے اندر دوسرا .... دوسرے کے نیچے تیسرا .... بڑے لفافے .... درمیانے لفافے .... چھوٹے لفافے .... سب سے اندر کا لفافہ انھوں نے کھولا۔ اس میں کچھ بھی نہ تھا۔

فرمایا: اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔

ہم نے کہا: کیوں نہیں ہے؟ آنکھوں والوں کے لئے بہت کچھ ہے۔ ہم سے پوچھئے، ہم جاتے ہوئے اپنے ہاں کی ہینڈی کرافٹ شاپ سے کچھ تحفے لے گئے تھے، ان لوگوں نے اخبار میں یا براؤن پیپر میں باندھ کر دیئے تھے، ہمیں بہت شرم آئی، اب یہ دیکھئے، یورپ والے کتنی عمدہ پیکنگ کرتے ہیں۔۔۔ اب یہ چیزیں ہم اپنے دکانداروں کو دکھائیں گے اور شرم دلائیں گے کہ تم لوگ ایسے ڈبوں اور لفافوں میں چیز رکھ کر دیا کرو تو ہم کیوں نہ لیں۔ جب ہم ولایت میں اتنی ڈھیر ساری خریداری کرتے ہیں تو یہاں کے دکاندار تو پھر اپنے بھائی ہیں۔'' ۱۳

درجہ بالا حوالے میں انشا نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ پاکستانی دکاندار تو اشیاء کی پیکنگ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے جبکہ دنیا کے دیگر ممالک میں اسے خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

بہرحال انشا کو پاکستان، مشرق وسطی، یورپ اور کئی دیگر ممالک کے بازاروں کے تقابل میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

ہوٹل، سرائے اور بھٹیار خانے

آج کل کے دور میں دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جہاں ہوٹل، سرائے یا بھٹیار خانے موجود نہ ہوں۔ ہر انسان کو اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی سفر کرنا ہی پڑتا ہے۔ اگر کسی شخص کا جانا کسی ایسی جگہ ہو جہاں اس کی اپنی یا اس کے کسی عزیز، رشتہ دار یا دوست کی رہائش گاہ نہ ہو تو پھر اسے کسی ہوٹل یا سرائے میں ہی قیام کرنا پڑتا ہے۔ ہوٹل ایسی جگہ ہے جو سیاحوں اور

مسافروں کو نہ صرف رہائش کی سہولت فراہم کرتی ہے بلکہ یہاں اس کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کا خیال بھی رکھا جاتا ہے تاکہ مسافر یا سیاح آرام وسکون سے رہ سکیں اور گھر سے دوری کے احساس کو کسی قدر کم کرسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جہاں مسافروں اور سیاحوں کی سہولت کے لئے اعلیٰ وادنیٰ درجے کے ہوٹل، سرائیں اور بھٹیار خانے موجود نہ ہوں۔

انشا کو ان کی دفتری مصروفیات کی انجام دہی کی غرض سے دنیا کے مختلف ممالک کے سفر کا موقع ملا، جہاں ان کا قیام زیادہ تر ہوٹلوں میں ہی رہا۔ ان ہوٹلوں میں قیام کے دوران انھوں نے ان کے انتظام وانصرام اور دیگر کئی امور و سائل کے بارے میں جاننے اور چھان بین کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس چھان بین سے جو نتائج حاصل ہوئے ان کا تقابل انھوں نے پاکستانی ہوٹلوں کے متعلقہ امور و مسائل سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کی جنھیں ذیل میں بیان کیا جارہا ہے۔

انشا نے مصر کا سفر بھی اختیار کیا، وہاں ان کا قیام زیادہ تر قاہرہ کے ایک ہوٹل میں ہی رہا۔ جب وہ قاہرہ کے اس ہوٹل کا تقابل پاکستانی ہوٹلوں سے کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں ممالک کے ہوٹلوں اور اشتراک کی ایک صورت نظر آتی ہے۔ اشتراک کی وہ صورت یہ تھی کہ ان دونوں ملکوں کے ہوٹلوں میں گاہکوں اور مسافروں کی ہر طرح کی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے حلال اشیاء کے ساتھ ساتھ حرام اشیاء کی دستیابی کو بھی ممکن بنایا جاتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ یورپی ممالک کی سیاحت کے دوران مجھے ہر وقت حلال وحرام جیسے مسائل سے دوچار رہنا پڑتا تھا۔ البتہ مصر آکر میں نے سکون کا سانس لیا کہ چلو اب تو میں ایک مسلم ملک میں ہوں اس لئے حلال وحرام کے چکروں سے آزاد ہوں گا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور ایک بیرا کمرے میں داخل ہوا اور پوچھنے لگا جناب! آپ کے لئے وسکی لاؤں یا بیئر؟ ان حرام اشیاء کا نام سنتے ہی میں تو غصے سے بھڑک اٹھا اور فوراً اسے کمرے سے چلے جانے کو کہا۔ اس نے مجھے جب غصے سے لال پیلا ہوتے دیکھا تو کمرے سے باہر چلے جانے میں ہی خیریت جانی۔ اس کے چلے جانے کے بعد جب کمرے کا دروازہ بند ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس دروازے کی پشت پر کچھ لکھا ہوا تھا، پڑھنے پر معلوم ہوا کہ اس پر حلال وحرام اشیاء پر مشتمل مختلف ناشتوں کے ریٹ درج تھے تاکہ لوگوں کو آرڈر دینے میں آسانی رہے۔ اس گوشوارے کو پڑھنے کے بعد میں دل میں سوچا کہ جب مصر جیسے اسلامی ملک میں مسافروں اور ٹورسٹوں کی ہر قسم کی احتیاجات کا خیال رکھا جاتا ہے تو یقیناً پاکستانی ہوٹلوں میں بھی مسافروں اور سیاحوں کے لئے حلال اشیاء کے ساتھ ساتھ حرام اشیاء دستیاب ہوتی ہوں گی۔ یوں انشا کو پاکستان اور مصر کے ہوٹلوں میں اشتراک کی یہ صورت نظر آئی کہ ان میں مسافروں اور سیاحوں کو حلال اشیاء کے ساتھ ساتھ حرام اشیاء بھی فراہم کی جاتی ہیں۔

انشا نے لبنان کا سفر بھی اختیار کیا وہاں بھی ان کا قیام زیادہ تر ہوٹلوں میں ہی رہا۔ لبنان یوں تو ایک اسلامی ملک

ہے لیکن پھر بھی انھیں وہاں اسلامی ہوٹل اور کرسچن ہوٹل دونوں ہی نظر آئے۔ انھیں وہاں کے ایک اسلامی ہوٹل سقفقور الجدید اور کرسچن ہوٹل ساں بعل دونوں ہی میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے ان دونوں طرح کے ہوٹلوں میں قیام کے دوران وہاں کے انتظام وانصرام اور دیگر کئی حوالوں سے اہم معلومات حاصل کیں۔ انؔشا بتاتے ہیں کہ جب میں بیروت کے سفر پر روانہ ہوا تو میرے دوست، پروفیسر محمد اعظمی نے خاص طور پر مجھے ہوٹل سقفقور الجدید میں ٹھہرنے کا مشورہ دیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ وہاں تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی بلکہ گھر کا سا آرام ملے گا۔ چنانچہ گھر کا آرام پانے کی خواہش مجھے ہوٹل سقفقور الجدید لے گئی لیکن اس ہوٹل میں میسر آرام اور سہولیات سے استفادہ کرنے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ گھر کا سا آرام اور سکون کیا ہوتا ہے۔ جب وہ پاکستان اور یورپ میں موجود ہوٹلوں کا تقابل ہوٹل سقفقور الجدید سے کرتے ہیں تو انھیں پاکستانی ہوٹلوں اور ہوٹل سقفقور الجدید میں اشتراک کا یہ پہلو نظر آیا کہ ان میں گھر کا سا آرام اور سکون میسر تھا لیکن یورپی ہوٹل خوبصورت اور جدید سہولیات سے آراستہ ہونے کے باوجود اس قسم کے آرام سے یکسر محروم نظر آئے۔ آخر یہ گھر کا سا آرام اور سکون ہے کیا چیز، جو صرف پاکستانی ہوٹلوں اور بیروت کے ہوٹل سقفقور الجدید میں ہی میسر تھا۔ انؔشا نے اس آرام اور سکون کی وضاحت سفرنامہ آوارہ گرد کی ڈائری کے درج ذیل حوالے میں یوں کی ہے:

''ہم ایسے بے شمار ہوٹلوں میں ٹھہر چکے ہیں جہاں گھر کا سا آرام ملتا رہا ہے۔ یعنی دروازے میں چابی نہیں لگتی۔ بستر کی چادر کئی کئی دن نہیں بدلی جاتی۔ کوئی بیرا ہماری آواز پر کان نہیں دھرتا۔ ہمیں تو کوئی اچھا ہوٹل چاہیے۔ گھر کا سا آرام مطلوب ہوتا تو گھر سے نکلتے ہی کیوں؟ یورپ کیوں آتے؟ لیکن پروفیسر صاحب کی تاکید یہی رہی کہ اسی ہوٹل میں جانا۔ واقعی آرام دہ ہے۔ سب سے بڑا آرام تو یہی ہے کہ سستا ہے۔''[۱۴]

درجہ بالا حوالے میں انؔشا نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ پاکستانی ہوٹلوں اور بیروت کے اسلامی ہوٹل سقفقور الجدید میں سہولیات کی عدم دستیابی ور کم کرائے کے حوالے سے مکمل اشتراک موجود تھا۔ البتہ جب وہ صفائی کے حوالے سے کراچی کے ہوٹلوں اور ہوٹل سقفقور الجدید کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں کسی حد تک اختلاف کی صورت بھی نظر آئی ہے۔ جس کی بابت وہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یوں تو کراچی کے ہوٹلوں میں بھی صفائی کی صورتحال تسلی بخش نہیں ہوئی لیکن پھر بھی کسی حد تک قابل برداشت ضرور ہے لیکن ہوٹل سقفقور الجدید میں تو صفائی کا انتظام اس قدر ناقص تھا کہ میرے لئے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو رہا تھا کیونکہ میں اتنی گندگی تو برداشت کرسکتا تھا جتنی پاکستانی ہوٹلوں میں ہوتی ہے لیکن ہوٹل سقفقور الجدید میں موجود گندگی میری برداشت سے باہر تھی۔ یوں انؔشا کو کراچی کے ہوٹلوں اور بیروت کے اسلامی ہوٹل سقفقور الجدید میں اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں ہی نظر آئیں۔

اس کے بعد انؔشا ہوٹل سقفقور الجدید کے گردونواح کا تقابل کراچی کی لی مارکیٹ کے گردونواح سے کرتے ہیں تو اس تقابل میں بھی انھیں اشتراک کی ایک صورت نظر آتی ہے۔ وہ صورت یہ تھی کہ ان دونوں جگھوں کے گردونواح میں لا

تعداد ہوٹل موجود تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب وہ ہوٹل سققفور الجدید کی تلاش میں یہاں آئے تو یہاں انھیں جا بجا ہوٹلوں کے بورڈ نظر آئے، حتیٰ کہ ہر گھر کی ہر ایک منزل پر انھیں کسی ہوٹل کا بورڈ نظر آیا جس کے سبب انھیں اس ہوٹل کی تلاش میں سخت دشواری پیش آئی۔

اس کے بعد انشا بیروت کے ایک کرسچن ہوٹل ساں بعل کو موضوع بحث بناتے ہیں۔ پہلے تو انھیں اس ہوٹل کا نام سمجھنے میں ہی کافی دشواری پیش آئی اور دوسرے وہ اس ہوٹل کے نام کے حروف تہجی سے اسے ایک اسلامی ہوٹل سمجھے جبکہ وہاں جانے کے بعد انھیں یہ معلوم ہوا کہ یہ ایک کرسچن ہوٹل ہے، لیکن وہ ایک کرسچن ہوٹل کو اسلامی ہوٹل کیوں کر سمجھ بیٹھے اس کی وجہ بتاتے ہوئے وہ سفر نامہ آوارہ گرد کی ڈائری کے درج ذیل حوالے میں یوں لکھتے ہیں:

> ''کسی لفظ میں ع یا ق یا ط یا ظ وغیرہ آجائے تو ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ عربی اور اسلامی چیز ہے اسی لئے پورس کے مقابلے میں ہمارا رجحان سکندر اعظم کی طرف زیادہ رہا۔ سکندر اعظم ہی نہیں ارسطو، افلاطون، بقراط، بطلیموس، فیثا غورث وغیرہ کو ہم نے ہمیشہ مسلمان ہی جانا۔ ساں پر تو ہم نے غور نہیں کیا۔ بعل کی ع پر ہم چپ ہو گئے لیکن جب ہم ہوٹل پہنچے تو معلوم ہوا یہ تو سینٹ پال کا ہوٹل ہے۔ یعنی یہاں بھی کلیسا میرے آگے۔ اب بیٹھو اور انجیل کا جاپ کرو۔''[۱۵]

درجہ بالا حوالے میں انشا نے یہ بتایا ہے کہ کس طرح وہ ساں بعل ہوٹل کے نام میں عربی حروف کی موجودگی کے باعث ایسے کرسچن ہوٹل کی بجائے ایک اسلامی ہوٹل سمجھ بیٹھے۔ انھیں اس ہوٹل میں قیام وطعام کا موقع بھی ملا جس سے انھیں اس ہوٹل کے انتظام و انصرام اور دیگر دستیاب سہولیات کے بارے میں جاننے کے مواقع بھی ملے۔ جب وہ سہولیات کی دستیابی کے حوالے سے بیروت کے کرسچن ہوٹل ساں بعل اسلامی ہوٹل سققفور الجدید اور پاکستانی ہوٹلوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ان سب ہوٹلوں میں سہولیات کی عدم دستیابی کے حوالے سے مکمل اشتراک کی صورت نظر آئی۔ ساں بعل ہوٹل میں سہولیات کی عدم دستیابی کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب انھوں نے نہانے کے لئے گرم پانی اور تولیے کا تقاضا کیا تو یہ دونوں چیزیں انھیں مہیا نہیں کی گئیں۔ پہلے تو انھوں نے ہوٹل کے ایک بیرے سے تولیے کا تقاضا کیا تو وہ ان کی بات سمجھنے ہی سے قاصر رہا۔ انشا نے اسے سمجھانے کی لاکھ کوشش کی لیکن آخر تھک ہار کے انھوں نے اسے سمجھانا ہی چھوڑ دیا۔ اگلی صبح اٹھ کر انھوں نے ہوٹل کے منیجر سے تولیے کا تقاضا کیا۔ ان کے حکم پر بیروں نے خوب دوڑ دھوپ کی اور ایک تولیہ مجھے مرحمت فرما دیا۔ میں نے تولیہ کھول کر دیکھا تو وہ تولیہ کم اور رومال زیادہ تھا۔ میں نے منیجر صاحب کو باور کرایا کہ مجھے نہانے کے لئے رومال کی نہیں تولیے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انھوں نے میری ضرورت کو جائز مانتے ہوئے اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا اور اب کی بار بیرے کو بلا کر کچھ خاص ہدایات دیں۔ کچھ دیر بعد وہ بیرا دوبارہ آیا اور پہلے جیسا ایک اور رومال میرے ہاتھ میں تھما گیا، میں اسے دیکھ کر سر پٹا کر بیٹھا لیکن پھر اسے ہی غنیمت جانا اور مزید تقاضے سے باز رہا۔ یوں انشا کو سہولیات کی عدم

دستیابی کے حوالے سے بیروت کے اسلامی ہوٹل سقفقو رالجد ید کرسچن ہوٹل ساں بعل اور کراچی کے ہوٹلوں میں مکمل اشتراک کا پہلو نظر آیا۔

انشا کو ساں بعل ہوٹل میں قیام کے دوران یہ بھی معلوم ہوا کہ بیروت کے ہوٹلوں میں تبادلۂ خیال کے لئے عربی اور فرانسیسی زبان کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس ہوٹل میں قیام کے دوران جہاں انھیں اور کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہیں ایک مشکل عربی اور فرانسیسی زبان سے عدم واقفیت کے سبب تبادلۂ خیال میں بھی پیش آئی ۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان دونوں زبانوں میں ان کی استعداد صرف ڈکشنریوں کی حد تک تھی اور اس بار تو وہ یہ ڈکشنریاں بھی گھر بھول آئے تھے، اب وہ صرف اشاروں کی زبان سے مدد لینے پر مجبور ہو گئے ۔ وہ بتاتے ہیں کہ مجھے نہانے کے لئے تولیے کی ضرورت تھی لہٰذا میں نے اشاروں کی بین الاقوامی زبان میں بیرے کو کئی بار سمجھانے کی کوشش کی کہ مجھے تولیے کی ضرورت ہے لیکن ہر بار شاید میرے اشارے ہی کمزور رہے کہ وہ میری بات نہ سمجھ سکا۔ تولیہ تو مجھے نہ ملنا تھا نہ ملا البتہ اس بین الاقوامی زبان کے استعمال سے ایک مضحک صورتحال ضرور پیش آئی ۔ انشا نے اس مضحک صورتحال کو سفرنامہ *آوارہ گرد کی ڈائری* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

> ''ہم نے لڑکے کو اشارے سے ہاتھ دھو کر دکھائے ۔ اس پر وہ صابن کی ایک ٹکیہ نکال لایا۔ ہم نے کہا یہ نہیں ۔ اور خیالی تولیہ سے اپنے جسم رگڑ کر دکھایا۔ شاید وہ ہمیں ورزش کا شوقین سمجھا۔ کیونکہ الماری کھول کر ڈمبلوں کی ایک جوڑی نکال کر رکھ دی ۔ مایوس ہو کر ہم اوپر والے کمرے میں آئے ۔ تھوڑی تلاش سے جرمن ڈکشنری مل گئی اور اس میں تولئے کے لئے Hand Tuch کا لفظ بھی نوٹ کر کے لے گئے کہ جرمنی آخر فرانس کا ہمسایہ ہے لیکن بے کار۔'' [۱۶]

یوں درجہ بالا حوالے میں انشا نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ پاکستانی اور لبنانی باشندوں کو تبادلہ خیال میں بہت مشکل پیش آتی ہے کیونکہ دونوں ہی ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے ۔ بہرحال انھیں کو بیروت کے اسلامی ہوٹل سقفقو رالجد ید کرسچن ہوٹل ساں بعل اور کراچی کے ہوٹلوں میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آتے ہیں ۔

ایران کے سفر کے دوران بھی انشا نے وہاں کے ہوٹلوں کو اپنی خاص توجہ کا مرکز بنایا۔ جب وہ ایرانی ہوٹلوں کا تقابل پاکستانی ہوٹلوں سے کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں ممالک کے ہوٹلوں میں اشتراک کی ایک صورت نظر آتی ہے۔ اس اشتراک کو انھوں نے سفرنامہ *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

> ''شہر کی بڑی سڑک خیابانِ چہار باغ کے دورویہ ہوٹل تھے لیکن زیادہ تر ایسے جیسے صدر کے علاقے میں درمیانے اور دوسرے درجے کے ہوٹل ہیں ۔'' [۱۷]

ہوٹلوں کے تذکرے میں اگر سراؤں اور بھٹیار خانوں کا تذکرہ نہ کیا جائے تو بات ادھوری رہ جائے گی۔ ''سرائیں''

اور بھٹیار خانے دراصل ادنیٰ درجے کے ہوٹل ہی ہوتے ہیں۔ پرانے زمانے میں مسافروں کے قیام وطعام کے لئے ہوٹلوں کی بجائے زیادہ تر سرائیں اور بھٹیار خانے ہی موجود ہوا کرتے تھے۔ جن میں مسافروں اور سیاحوں کو نہ صرف رہائش فراہم کی جاتی تھی بلکہ کھانے پینے کی سہولت بھی بہت ارزاں نرخوں پر فراہم کی جاتی تھی۔ آنشا کو مشرق وسطیٰ کے ممالک کے سفر کے دوران وہاں کے مختلف ہوٹلوں، سراؤں اور بھٹیار خانوں میں قیام وطعام کا موقع ملا۔ مذکورہ جگہوں کے ظاہری نقشے، سہولیات اور انتظام وانصرام کے بارے میں انھوں نے جو معلومات حاصل کیں ان کا تقابل پاکستان میں موجود ہوٹلوں، سراؤں اور بھٹیار خانوں سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کی۔

ایران کے سفر کے دوران آنشا کو اصفہان کے ایک بھٹیار خانے میں قیام وطعام کا موقع بھی ملا۔ اس بھٹیار خانے میں لوگوں کے بیٹھنے اور کھانا کھانے کے لئے کرسیاں اور میز موجود تھے۔ اس کے علاوہ یہاں جدید طرز کا آرائشی سامان بھی بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ وہ اس جدید طرز کے خوبصورت بھٹیار خانے کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے کیونکہ ان کے ذہن میں تو اپنے ملک کی پرانی سراؤں اور بھٹیار خانوں ہی کا نقشہ تھا جہاں نہ تو مسافروں اور سیاحوں کے بیٹھنے کے لئے میزیں اور کرسیاں ہوتیں تھیں اور نہ کسی قسم کا آرائشی سامان موجود ہوتا تھا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ہاں سراؤں میں مسافروں کو رہائش کے لئے صرف ایک چارپائی مہیا کی جاتی تھی اور کھانے میں دال روٹی دی جاتی، البتہ یہ دونوں چیزیں اسے بہت کم قیمت پر فراہم کی جاتی تھیں۔ بہرحال آنشا کو ایرانی بھٹیار خانے اور پاکستانی بھٹیار خانوں اور سراؤں کے تقابل میں اختلاف کا پہلو نظر آیا اور اس تقابل میں انھیں ایرانی بھٹیار خانے پاکستانی سراؤں اور بھٹیار خانوں سے کہیں بہتر نظر آئے۔

قصہ مختصر، آنشا کو پاکستان، مصر، لبنان، ایران اور کئی یورپی ممالک کے ہوٹلوں اور بھٹیار خانوں میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

سڑکیں

آج کل کے دور میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جہاں سڑکیں موجود نہ ہوں۔ ذرائع آمدورفت میں سڑکوں کی ضرورت واہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جس ملک کی سڑکیں جس قدر صاف، کشادہ اور اعلیٰ معیار کی ہوں گی وہاں نقل و حمل میں اسی قدر سہولت ہوگی اور وقت کی بچت بھی ہوگی۔ آنشا کو مشرق وسطیٰ کے ممالک کے سفر کے دوران وہاں کی سڑکوں پر سفر کرنے کا موقع ملا جس سے انھیں ان ممالک کی سڑکوں کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع بھی ملا۔ انھوں نے ان ممالک کی سڑکوں کا تقابل پاکستان کی سڑکوں سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی جنھیں ذیل میں بیان کیا جارہا ہے۔

ایران قیام کے دوران آنشا نے اصفہان کی سڑکوں کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اصفہان شہر کی سڑکوں کے بارے میں

وہ بتاتے ہیں کہ وہاں کی تمام سڑکیں بہت ہموار سیدھی اور کشادہ تھیں اور وہاں صفائی کی صورتحال بھی قابل دید تھی لیکن وہاں کی مرکزی شاہراہ جسے خیابان چہار باغ کہا جاتا ہے سب سے زیادہ کشادہ تھی۔ اس سڑک کے دونوں طرف ٹریفک کے لئے گزرگاہ بنی ہوئی تھی اور اسے خوب صورت بنانے کے لئے اس کے دونوں طرف درخت لگائے گئے تھے جو سڑک کی خوب صورتی میں اضافے کے ساتھ ساتھ راہگیروں کو سایہ بھی فراہم کررہے تھے۔ راہگیروں کی سہولت کے لئے اس سڑک کے ساتھ فٹ پاتھ کی سہولت بھی موجود تھی۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایران کی چند سڑکیں ایسی بھی ہیں جو رونق، چہل پہل اور خوب صورتی میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ جب وہ ایران کی چند مشہور سڑکوں خیابان فردوسی، خیابان سعدی اور لالہ زار کا تقابل انگلستان کی مشہور الفنسٹن اسٹریٹ وکٹوریہ اسٹریٹ اور لاہور کی انارکلی سے کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں ایران کی مذکورہ شاہراہیں لاہور کی انارکلی اور کراچی کی تمام سڑکوں کے علاوہ انگلستان کی الفنسٹن اسٹریٹ اور وکٹوریہ اسٹریٹ سے بھی بہتر نظر آتی ہیں۔ ایران میں موجود شاہراہیں یقیناً بہت صاف ستھری، کشادہ اور خوب صورت ہوں گی اور پاکستانی شاہراہوں سے یقیناً بدرجہا بہتر ہوں گی لیکن برطانیہ کی الفنسٹن اسٹریٹ اور وکٹوریہ اسٹریٹ سے بڑھ کر نہیں ہوں گی۔ آنشا نے ایران کی شاہراہوں کی تعریف وتوصیف میں کچھ زیادہ ہی مبالغے سے کام لیا ہے بلکہ ان کا ایرانی شاہراہوں کو انگلستان کی مشہور شاہراہوں سے بڑھ کر قرار دینا کچھ زیب داستان معلوم ہوتا ہے۔

محکمۂ ڈاک

آج کل کے دور میں کوئی بھی انسان ایک دوسرے سے کٹ کر بالکل تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔ اسے دوسروں کے بارے میں مطلع رہنے اور انھیں اپنے متعلق باخبر کرنے کی ضرورت ہر وقت درپیش رہتی ہے۔ انسان کی اسی ضرورت نے دنیا کے تقریباً سبھی ممالک میں محکمۂ ڈاک کی موجودگی کو یقینی بنایا۔ گو کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری زندگی کے دیگر شعبوں میں ترقی ہوئی وہیں مواصلات کے شعبے میں بھی نئی نئی ایجادات کے ذریعے رابطے کے نت نئے ذرائع کو رواج ہوا جن میں ٹیلی فون، موبائل فون، انٹرنیٹ، سیٹلائٹ اور کئی دیگر ذرائع مواصلات شامل ہیں۔ ہر شخص خواہ کہیں بھی چلا جائے اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے اہل خانہ، عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں سے رابطے میں رہے۔ آنشا کو اپنی دفتری مصروفیات کے سلسلے میں دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ اس دوران انھیں اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں سے رابطے میں رہنے کی اکثر وبیشتر ضرورت پڑی جس کے لیے کبھی تو انھوں نے جدید دور کے ذرائع مواصلات کو استعمال کیا اور کبھی ان ذرائع کے ہوتے ہوئے بھی خط وخطابت کے ذریعے ہی سے عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں سے اپنے تعلق کو استوار رکھا۔ البتہ مواصلات کے اس ذریعے سے استفادہ کرنے کی بدولت انھیں دنیا کے مختلف ممالک کے محکمۂ ڈاک کے بارے میں جاننے کا موقع بھی ملا۔ انھوں نے مشرق وسطیٰ کے ممالک کے محکمۂ ڈاک کا تقابل پاکستان کے محکمۂ

ڈاک سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کی جنھیں ذیل میں بیان کیا جا رہا ہے۔

انشا نے اپنی دفتری مصروفیات کی غرض سے کئی بار ایران کا سفر اختیار کیا۔ وہاں قیام کے دوران انھیں کئی دفعہ اپنے اہل خانہ، عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں سے رابطے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لہٰذا خط پوسٹ کرتے ہوئے انھیں جن تجربات اور دشوار کن مراحل سے گزرنا پڑا اس سے انھوں نے یہ اندازہ لگایا کہ ایران میں خط پوسٹ کرنا کسی جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ اس سلسلے میں وہ بتاتے ہیں کہ اول تو وہاں لفافے اور ٹکٹیں عام دستیاب ہی نہیں ہوتیں صرف ڈاک خانے سے ہی ملتی ہیں۔ اس لیے وہاں اگر کسی شخص کو کوئی خط ارسال کرنا ہو تو اسے بار بار ڈاک خانے کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ سب سے پہلے تو اسے ڈاک خانے سے لفافے اور ٹکٹیں خریدنی پڑتی ہیں پھر خط لکھنے کے بعد اسے پوسٹ کرنے کے لیے دوبارہ ڈاک خانے جا کر جمع کروانا پڑتا کیوں کہ ایران کا محکمۂ ڈاک لیٹر بکس کی جا بجا موجودگی کو ضروری نہیں سمجھتا۔ یوں وہاں اگر کسی شخص کو مجبوراً کہیں کوئی خط ارسال کرنا پڑ جائے تو اسے بار بار ڈاک خانے کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ کوئی بھی شخص وہاں خط لکھتے ہوئے کسی خط پر لفظ مقامی تحریر نہ کرے کیوں کہ اگر اس نے یہ لفظ خط پر لکھ دیا تو پھر اس کا خط یقیناً ایرانی محکمۂ ڈاک کی بے توجہی اور بے اعتنائی کا شکار ہو جائے گا۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ مقامی سے مراد وہاں مہاجر ہے، ایرانی لوگوں میں چونکہ بہت تعصب ہوتا ہے اس لیے وہ مقامی یعنی مہاجروں کے خطوط کو ذرا بھی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ مزید یہ بھی بتاتے ہیں کہ اگر آپ نے خط پر پتہ انگریزی زبان میں لکھ دیا تو پھر بھی آپ کے خط کے ساتھ کوئی غیر معمولی صورتحال پیش آ سکتی ہے۔ کیوں کہ وہاں کے ڈاکیے انگریزی زبان نہیں جانتے اس لیے وہ ایسے تمام خطوط کو جن پر پتہ انگریزی زبان میں تحریر کیا گیا ہوتا ہے، دارالترجمہ بھیج دیتے ہیں جہاں انگریزی زبان میں لکھے گئے ان پتوں کا ایرانی زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔ البتہ یہاں کا دارالترجمہ جس قسم کی فنی مہارت کا حامل ہے اور ان کی ترجمہ نگاری جس قسم کے گل کھلا سکتی ہے اسے بھی انشا موضوع بحث بناتے ہیں اور سفر نامہ دنیا گول ہے کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کرتے ہیں۔

''یونیورسٹی میں ایک پاکستانی طالب علم ہیں عبدالقیوم قریشی، ان کا خط گیا، انگریزی میں پتہ لکھا ہوا۔ دارالترجمے میں جو شخص تھا اس نے اس انگریزی کی فارسی یوں بنائی۔

> ''ابوالقاسم مویشی'' وہ خط ان کے بورڈنگ ہاؤس کی میز پر ہفتہ بھر پڑا رہا۔ قریشی صاحب خط اٹھاتے تھے اور حیران ہو کر واپس رکھ دیتے تھے کہ چوپایوں کے خط یہاں کیوں آنے لگے۔ کسی سلوتر خانے یا کانجی ہاؤس میں کیوں نہیں جاتے اور گھر سے میرا خط کیوں نہیں آتا۔ کئی دن بعد کہیں انھوں نے اصل انگریزی پتہ پڑھا اور مکتوب الیہ آدمی کی جُون میں آیا''۱۸

الغرض، انشا کو پاکستان کا محکمۂ ڈاک ایران کے محکمۂ ڈاک سے کہیں بہتر نظر آیا۔ کیوں کہ پاکستان میں ڈاک

خانوں، لیٹر بکس کی جا بجا موجودگی' ٹکٹ اور لفافوں کی عام دستیابی اور ڈاکیوں کی انگریزی زبان سے واجبی سی واقفیت پاکستانی محکمہٗ ڈاک کو ایران کے محکمہٗ ڈاک سے ہر لحاظ سے بہتر ثابت کرتی ہے۔

معاشی نظام

کسی ملک کی ترقی وخوشحالی کا انحصار اس ملک کے معاشی نظام پر ہوتا ہے۔ یہ نظام نہ صرف اس ملک کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے بلکہ وہاں پر بسنے والے لوگوں کی زندگیوں پر بھی اپنا گہرا اثر ڈالتا ہے۔ کسی ملک کے معاشی نظام کے استحکام اور عدم استحکام کا اندازہ کئی باتوں سے لگایا جاسکتا ہے مثلاً بین الاقوامی مارکیٹ میں کسی ملک کی کرنسی کی قدر و قیمت کیا ہے' افراط زر کی شرح میں کمی ہو رہی ہے یا زیادتی' مہنگائی کی صورتحال کیسی ہے' لوگوں کی فی کس آمدنی کیا ہے' برآمدات اور درآمدات کا تناسب کیا ہے' وغیرہ وغیرہ۔

موجودہ دور میں کسی ملک کے معاشی نظام میں کرنسی کو اہمیت اور مقام حاصل ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ پرانے زمانے میں جب کرنسی کا وجود نہیں تھا تو لوگوں کو کاروباری معاملات اور باہمی لین دین میں بہت مشکل پیش آتی تھی لیکن کرنسی کے آجانے سے ان کی یہ مشکل آسان ہوگئی۔ موجودہ دور میں کرنسی اپنی ضرورت و اہمیت کے علاوہ کسی ملک کے معاشی نظام کے استحکام اور عدم استحکام کا اندازہ لگانے میں بھی ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک کے سفر کے دوران انشا کو ان ممالک کی کرنسیوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے' جانچنے اور ان سے خریداری کرنے کا موقع ملا۔ جس سے انھیں پاکستان اور ان ممالک کی کرنسیوں کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات جاننے کا موقع ملا۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

ایران قیام کے دوران انشا نے وہاں کی کرنسی کے متعلق معلومات بھی حاصل کیں۔ وہ ایرانی کرنسی کی قدر و قیمت کے بارے میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایران کے پندرہ قرآن ہمارے ہاں کے چھ روپے کے برابر ہیں' وہاں کا ایک ریال پاکستان کے ایک آنے کے برابر ہے' دس ریال کا ایک تومان بنتا ہے اور ایک تومان ہمارے ہاں کے دس آنے کے برابر ہے۔ یوں انھیں دونوں ممالک کی کرنسیوں کی قدر و قیمت کے تقابل میں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔ اس کے علاوہ ایران میں خریداری کے دوران انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ایران اور پاکستان کے بعض علاقوں میں لین دین کے لیے جو کاروباری زبان استعمال کی جاتی ہے اس میں بھی اشتراک کی ایک صورت موجود ہے' اس اشتراک کو انشا نے سفرنامہ *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

> ''آپ کو چار سیب اور پانچ انار چاہئیں تو چہار سیب یا پنج انار کہنا کافی نہیں۔ نہ عدد سے کام چلے۔ کہیئے۔ چہار تا سیب اور پنج تا انار۔ جیسے ہمارے بعض علاقوں میں کہتے ہیں۔ دو ٹھو کیلا تو لاؤ'' 19

یوں درجہ بالا حوالے میں انشاؔ نے یہ بتایا ہے کہ پاکستان اور ایران کے بعض علاقوں میں کاروباری لین دین کے لیے جو زبان استعمال کی جاتی ہے اس میں اعداد کی بجائے الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

الغرض انشاؔ کو پاکستان اور ایران کے معاشی نظام میں دونوں ممالک کی کرنسیوں کی قدر و قیمت کے حوالے سے تو اختلاف کی صورت نظر آئی البتہ ان ممالک کے بعض علاقوں میں مستعمل مشترک کاروباری زبان کے حوالے سے اشتراک کی ایک صورت بھی نظر آئی۔

ذرائع آمدورفت

انسانی زندگی سفر سے عبارت ہے۔ یہ سفر کبھی کسی مجبوری کے تحت اختیار کیا جاتا ہے اور کبھی صرف سیر و سیاحت کی غرض سے ہی۔ سفر کے سلسلے میں ذرائع آمدورفت کی جو اہمیت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پرانے زمانے کا انسان تو پیدل ہی سفر کیا کرتا تھا لیکن پہیے کی ایجاد سے آمدورفت کے بہت سے ذرائع ہمارے سامنے آئے۔ یہاں تک کہ موجودہ دور کے انسان کے پاس سفر کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف اقسام کے ذرائع آمدورفت موجود ہیں جنھیں وہ اپنی مرضی کے مطابق کام میں لا سکتا ہے۔

انشاؔ نے مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کے سفر کے دوران مختلف نوعیت کے ذرائع آمدورفت استعمال کیے جس سے انھیں نہ صرف ان ممالک کے ذرائع آمدورفت میں سفر کرنے کا تجربہ حاصل ہوا بلکہ ان سے متعلقہ امور و مسائل کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کا موقع بھی در آیا۔ انھوں نے ان ممالک کے ذرائع آمدورفت کے بارے میں جو معلومات حاصل کیں ان کا تقابل پاکستان میں استعمال ہونے والے ذرائع آمدورفت سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی صورتوں کو واضح کیا۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کی تفصیل ملاحظہ کیجیے۔

ایران قیام کے دوران انشاؔ نے وہاں کے ذرائع آمدورفت کا مشاہدہ بڑے قریب سے کیا۔ اصفہان قیام کے دوران انھیں وہاں کے ہوائی اڈے پر موجود ٹیکسی والوں کے طرزِ عمل کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا جس سے انھیں یہ معلوم ہوا کہ اصفہان کے ہوائی اڈے پر موجود ٹیکسی والوں کے طرزِ عمل اور لاہور شہر کے ریلوے اسٹیشن پر موجود تانگے والوں کے طرزِ عمل میں کافی حد تک اشتراک کا پہلو موجود ہے۔ انشاؔ نے اصفہان کے ٹیکسی ڈرائیوروں اور لاہور کے تانگے والوں کے طرزِ عمل کا احوال بڑے مزاحیہ انداز میں اپنے سفرنامے *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* قلمبند کیا ہے۔ وہ سفرنامہ ابن بطوطہ کے تعاقب میں ایک حوالے میں لاہور کے تانگے والوں کا احوال بڑے مزاحیہ انداز میں یوں بیان کرتے ہیں۔

> ''ایک تانگے والا آپ کا بقچہ لئے اُڑا جا رہا ہے۔ دوسرے نے صراحی جو آپ نے بہاولپور کے اسٹیشن سے خریدی ہے۔ سیٹ کے نیچے رکھ کر بھاٹی لوہاری کی آواز لگانی شروع کر دی ہے۔ آپ کی ہری چھال

کے کیلئے تیسرے کے قبضے میں ہیں اور طوطے کا پنجرا چوتھے کی تحویل میں اور پانچواں خود آپ کی کولی بھرنے کی فکر میں ہے کہ قبلہ آیئے۔اِدھر قدم رنجا فرمایئے۔''[20]

درجہ بالا اقتباس میں انشا نے لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر موجود تانگے والوں کے طرزِ عمل کی جس طرح عکاسی کی ہے وہ قابل داد ہے۔ واقعی یہ لوگ مسافروں کو جبراً اپنی سواری میں بٹھاتے ہیں اور اس سلسلے میں طرح طرح کے جتن بھی کرتے ہیں۔ یہ لوگ مسافروں کو یہ موقع ہی نہیں دیتے کہ وہ خود اپنے لیے کسی سواری کا انتخاب کر سکیں بلکہ یہ حضرات خود ہی ان کا سامان اٹھا اٹھا کر اپنی سواری میں رکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسافر کو آخر چار و نا چار ان ہی کی سواری میں بیٹھنا پڑتا ہے، یوں یہ لوگ مسافروں پر اپنی مرضی مسلط کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ اس کے بعد انشا اصفہان کے ہوائی اڈے پر موجود ٹیکسی ڈرائیوروں کے طرزِ عمل اور ان کی چھینا جھپٹی کی وضاحت بڑے ہی مزاحیہ انداز میں اپنے سفر نامے *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں کرتے ہیں:

''اصفہان کا جہاز طہران کے ہوائی اڈے پر پہنچا تو ٹیکسی ڈرائیوروں کی چھینا جھپٹی کا یہی عالم تھا۔ ہمارے پاس فقط ایک بقچہ تھا جو ایک بھلے مانس نے ہتھیا لیا۔ دوسرے نے بغل میں سے طوطا کہانی با تصویر کھینچ لی۔ ٹوپی سر پر نہیں تھی لہٰذا تیسرا بہت مایوس ہوا۔ طوطا کہانی بھی ہم نے بازیاب کر لی اور بقچے والا ہمیں اپنی رکاب میں لے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر آداب بجالانے لگا۔''[21]

درجہ بالا حوالے میں انشا نے اصفہان کے ہوائی اڈے پر موجود ٹیکسی والوں کے طرزِ عمل کی بھی مکمل طور پر تصویر کھینچ کر رکھ دی اور یہ بتایا کہ یہاں کے ٹیکسی ڈرائیور بھی لاہور ریلوے اسٹیشن پر موجود تانگے والوں کی طرح مسافروں کو زبردستی اپنی ٹیکسی میں بٹھاتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے ان حضرات کا طرزِ عمل بھی وہی ہوتا ہے جو لاہور ریلوے اسٹیشن پر موجود تانگے والوں کا ہوتا ہے۔ بہرحال انشا کو لاہور ریلوے اسٹیشن پر موجود تانگے والوں اور اصفہان کے ہوائی اڈے پر موجود ٹیکسی ڈرائیوروں کے طرزِ عمل میں اشتراک کی ایک صورت نظر آئی۔

اس کے بعد انشا ایران کے ذرائع آمد و رفت کو موضوع بناتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جب وہ ایران کے ایک قصبے رے گئے تو وہاں انھوں نے گھوڑا گاڑی سے ملتی جلتی ایک سواری دیکھی۔ کسی شخص سے انھوں نے اس سواری کا نام پوچھا تو اس نے اس کا نام ورشکہ بتایا۔ اس کے بعد وہ ایرانی ورشکہ اور پاکستانی اکے کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ایرانی ورشکہ پاکستانی اکے سے زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے لیکن جب وہ اسی ورشکہ کا تقابل برطانوی وکٹوریہ سے کرتے ہیں تو برطانوی وکٹوریہ انھیں ایرانی ورشکہ سے کہیں بہتر نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ بظاہر دیکھنے میں تو یہ دونوں سواریاں بالکل ایک جیسی ہیں لیکن برطانوی وکٹوریہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں چار پہیے ہوتے ہیں جو اس سواری میں بہتر توازن قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ انھیں برطانوی وکٹوریہ اور ایرانی ورشکہ میں ایک اختلاف بھی نظر آیا وہ یہ کہ

ورشکہ میں مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش برطانوی وکٹوریہ کے مقابلے میں نسبتاً کم ہوتی ہے۔ اس میں دو سواریاں اس مشکل سے بیٹھتی ہیں جس طرح ڈھاکا میں چلنے والے رکشے میں لوگ مشکل سے بیٹھے ہوتے ہیں یعنی نہ پوری طرح بیٹھتے ہوئے اور نہ پوری طرح کھڑے ہوئے۔

بہرحال انشا نے ایرانی سواری ورشکہ اور پاکستانی اکے کا تقابل کیا اور اس تقابل میں برطانیہ کی وکٹوریہ اور ڈھاکا کے رکشے کو بھی شامل کرلیا۔ اس تقابل سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پاکستانی اکے' ایرانی ورشکہ اور برطانوی وکٹوریہ میں اختلاف کی صورت موجود ہے لیکن ڈھاکا کے رکشے اور ایرانی سواری ورشکہ میں کافی حد تک اشتراک کا پہلو موجود ہے۔ اس اشتراک کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ ان دونوں سواریوں میں مسافروں کے بیٹھنے کے لیے بہت کم گنجائش ہوتی ہے۔ اس تقابل سے وہ یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ برطانوی وکٹوریہ ایرانی ورشکہ' پاکستانی اکے اور بنگلہ دیش کے رکشا کے مقابلے میں سب سے بہتر سواری ہے۔ یوں وہ سب سے بہترین سواری برطانوی وکٹوریہ کو قرار دیتے ہیں' اس کے بعد ایرانی ورشکہ پھر پاکستانی اکے اور سب سے آخری درجہ وہ بنگلہ دیشی رکشا کو دیتے ہیں۔ یوں ان کے نزدیک ان سواریوں میں سب سے بہترین سواری برطانوی وکٹوریہ اور سب سے گھٹیا سواری بنگلہ دیشی رکشا ہے۔

اس کے بعد انشا پاکستان اور ایران کے ریلوے نظام کا تقابل کرتے ہیں، اس تقابل میں بھی انھیں اشتراک کی ایک صورت نظر آتی ہے۔ اس اشتراک کے بارے میں وہ بتاتے ہیں کہ ان دونوں ملکوں میں بہت تھوڑے فاصلے کے درمیان بھی ریل چلتی ہے۔ جس طرح پاکستان میں کراچی اور ملیر کے درمیان ریل چلتی ہے اسی طرح طہران اور ایرانی قصبے رے کے درمیان بھی پرانے وقتوں میں ریل چلا کرتی تھی۔ یوں انھیں پاکستان اور ایران کے ریلوے نظام میں بھی اشتراک کی ایک صورت نظر آئی۔

بہرحال انشا نے پاکستان کے ذرائع آمدورفت کا تقابل ایران کے ذرائع آمدورفت سے مختلف حوالوں سے کیا' اس تقابل میں انھیں اشتراک کے ساتھ ساتھ اختلاف کے پہلو بھی نظر آئے۔

انشا نے شام کا سفر بھی اختیار کیا۔ دمشق شام کا مشہور شہر ہے اور دارالخلافہ بھی۔ وہاں قیام کے دوران انھوں نے وہاں کے ذرائع آمدورفت کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا اور اس مشاہدے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پاکستان اور شام کے ذرائع آمدورفت میں بھی اشتراک کی کئی صورتیں موجود ہیں۔ جن کی تفصیل بتاتے ہوئے وہ یہ کہتے ہیں کہ دمشق میں بھی پاکستان کی طرح آمدورفت کے لیے ٹرک استعمال کیے جاتے ہیں اور اشتراک کی دوسری صورت انھیں یہ نظر آئی کہ دونوں جگہ ان ٹرکوں کی پشت پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہوتا ہے۔ اکثر یہ عبارت کسی نصیحت یا مشورے پر مبنی ہوتی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان میں اکثر ٹرکوں کی پشت پر یہ لکھا ہوتا ہے ''ہارن دے کر پاس کریں'' یا ''سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں'' اسی طرح دمشق میں ٹرکوں کی پشت پر یہ لکھا ہوتا ہے ''رفیقی لاتسرع'' یعنی ''میاں باندھ کے چل'' بہرحال انشا کو پاکستان اور شام

کے ذرائع آمدورفت میں اشتراک کئی صورتیں نظر آئیں۔ پہلا اشتراک تو انھیں یہ نظر آیا کہ پاکستان اور شام دونوں میں ٹرک آمدورفت کا ایک اہم ذریعہ ہیں اور دوسری یہ کہ ان کی پشت پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہوتا ہے۔

المختصر، انشا نے پاکستان، ایران، شام اور کئی دیگر ذرائع آمدورفت کا تقابل کئی حوالوں سے کیا اس تقابل میں انھیں اشتراک کے ساتھ اختلاف کے پہلو بھی نظر آئے۔

مذہب

مذہب مجموعی طور پر چند اصولوں، قاعدوں اور ضابطوں کا مجموعہ ہوتا ہے جو بنی ونوع انسان کی بہتری کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ انسان اور وحشی میں بنیادی فرق صرف یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کسی اصول، قاعدے یا ضابطے کے تحت گزارتا ہے جبکہ وحشی کسی قسم کی پابندی کو قبول نہیں کرتا اور صرف اپنی مرضی کے تابع ہوتا ہے۔ اب تک دنیا میں بہت سے مذاہب آ چکے ہیں ان میں سے کچھ مذاہب ایسے بھی ہیں جن کے ماننے والے دنیا کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں اسلام بھی ایک ایسا مذہب ہے جس کے پیروکار دنیا کے تقریباً سبھی ممالک میں موجود ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ ایک ایسا خطہ ہے جو صرف مسلم ممالک پر ہی مشتمل ہے، انشا نے اس خطے کے ممالک کے سفر کے دوران بحیثیت مسلمان ان معلومات کو خصوصی اہمیت دی جو ایک مسلمان کے لیے پرکشش ہو سکتی تھیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ ان ممالک میں مسلمانوں کی تعداد کتنی ہے، ان کا طرزِ زندگی کیسا ہے، ان کے بنیادی عقائد اور عبادات میں کوئی نمایاں فرق تو نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ انھوں نے ان ممالک میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے جو معلومات حاصل کیں ان کا تقابل پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں کے عام معاملاتِ زندگی اور مذہبی عقائد وعبادات سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت بھی تا کہ ان کے قارئین خصوصاً مسلم قارئین کو یہ معلوم ہو سکے کہ ایک ہی مذہب کے ماننے والوں میں بھی اشتراکات کے ساتھ ساتھ کچھ اختلافات موجود ہوتے ہیں۔ ذیل میں ان اشتراکات واختلافات کی تفصیل ملاحظہ کیجیے۔

ایران قیام کے دوران انشا کو ایرانی مسلمانوں کے طرزِ زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جب وہ ایرانی اور پاکستانی مسلمانوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں ملکوں کے مسلمانوں کے طرزِ عمل میں خاصا اختلاف نظر آتا ہے۔ اس اختلاف کی تفصیل بتاتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک سب مسلمانوں کی مذہبی کتاب ہے اس لیے یہ سب مسلمانوں کے لیے رحمت اور برکت کا باعث ہے۔ یوں ختمِ قرآن کی محافل بھی سب مسلمانوں کے لیے رحمت، برکت اور بخشش کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ البتہ ان محافل کے انعقاد کے سلسلے میں انھیں پاکستانی اور ایرانی مسلمانوں میں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستانی مسلمان صرف اس وقت ختمِ قرآن کی محافل منعقد کراتے ہیں جب ان کے ہاں کسی عزیز و

اقارب کی وفات ہو جائے۔ البتہ وہ مرحوم کے ایصال ثواب کی خاطر ہی ختم قرآن کی محافل منعقد کراتے ہیں۔ جبکہ ایران میں مقیم پاکستانی مسلمان گھر میں رحمت اور برکت کی غرض سے ہر ماہ قرآن مجید کا ختم کرواتے ہیں۔ اس کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب وہ ایران میں مقیم ایک پاکستانی دوست صادق بٹ کے ہاں ختم قرآن کی محفل میں گئے۔ انھوں نے یہی سمجھا کہ شاید کسی کی وفات پر اس محفل قرآن کا اہتمام کیا گیا ہے لیکن بعد میں پتا چلا کہ اس محفل کا اہتمام صرف حصول رحمت و برکت کی غرض سے کیا گیا تھا۔ یوں انشا کو ختم قرآن کے حوالے سے پاکستانی اور ایرانی مسلمانوں کی سوچ اور طرز عمل میں خاصا اختلاف نظر آیا۔

مذہب وہ زاویہ ہے جس کا اثر نہ صرف کسی مسلمان کی زندگی میں ہی نظر نہیں آتا بلکہ مرنے کے بعد بھی یہ زاویہ اس کی پہچان بن جاتا ہے۔ اسلام میں کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کی تدفین کا حکم دیا گیا ہے۔ انشا نے ایران قیام کے دوران وہاں بنائی جانے والی قبروں کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایران میں بنائی جانے والی قبریں اپنی نوعیت کے اعتبار سے پاکستان میں بنائی جانے والی قبروں سے بالکل مختلف تھیں۔ کیوں کہ نہ تو ان قبروں پر تعویز بنائے گئے تھے اور نہ ہی یہ قبریں زمین سے اونچی رکھی گئی تھیں۔ جبکہ پاکستان میں بنائی جانے والی قبروں پر تعویز بھی بناتے جاتے ہیں اور انھیں زمین کی سطح سے بلند بھی رکھا جاتا ہے۔ یوں قبروں کی نوعیت کے حوالے سے انھیں پاکستان اور ایران میں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔ اس کے بعد وہ قبروں کے احترام کے حوالے سے ایرانی اور پاکستانی مسلمانوں کے طرز عمل کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس حوالے سے بھی دونوں جگہ اختلاف کا پہلو ہی نظر آتا ہے۔ وہ بتاتے کہ ہمارے ہاں تو قبروں کا بہت احترام کیا جاتا ہے جبکہ ایرانی مسلمان قبروں کا ذرا بھی احترام نہیں کرتے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایران میں میں نے نہ صرف بچوں کو قبروں کی بے حرمتی کرتے دیکھا بلکہ بڑے لوگوں کو بھی ایسا کرتے ہوئے دیکھا۔ جب مجھ سے یہ دیکھ کر رہا نہ گیا تو میں نے وہاں موجود ایک شخص سے اس بے حرمتی کی وجہ سے پوچھی تو اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا لہٰذا اس نے چپ سادھنے میں ہی بہتری سمجھی، البتہ اس کی چپ سے مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ بہر حال انشا کو قبروں کی نوعیت اور ان کے احترام کے لحاظ سے پاکستان اور ایران میں اختلافات کے پہلو ہی نظر آئے۔

انشا کو پاکستان اور ایران میں جہاں مذہبی حوالے سے زیادہ تر اختلاف کی صورتیں نظر آئیں وہیں مصر میں اس حوالے سے اشتراک کا پہلو بھی نظر آیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب میں قاہرہ پہنچا تو وہاں پہنچتے ہی مجھے اذان کی آواز سنائی دی۔ جسے سن کر مجھے یوں لگا کہ جیسے میں پاکستان میں ہوں کیونکہ پاکستان میں بھی نماز سے پہلے اذان دی جاتی ہے۔ یوں اذان کی آواز نے ان دونوں اسلامی ممالک میں اشتراک کی ایک صورت پیدا کر دی۔

الغرض انشا کو پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک میں مذہب اور مذہبی زندگی کے مختلف زاویوں کے حوالے سے اختلافات کی صورتیں تو بہت زیادہ نظر آئیں لیکن اشتراک کی صرف ایک صورت نظر آئی۔

فنونِ لطیفہ

ہر انسان اپنے جذبات‘ احساسات اور خیالات کا اظہار کر کے دلی تسکین حاصل کرتا ہے۔ انسانی جذبات و احساسات کے یوں تو بہت سے ذرائع ہیں لیکن ان میں موسیقی‘ مصوری‘ مجسمہ سازی‘ شاعری اور فنِ تعمیر جیسے فنونِ لطیفہ زیادہ اہم ہیں۔ انؔشا نے مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کے سفر کے دوران اس خطے کے فنونِ لطیفہ کا بھی بڑی باریکی اور گہرائی سے مشاہدہ کیا۔ انھوں نے ان ممالک کے فنونِ لطیفہ کا تقابل پاکستانی فنونِ لطیفہ سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو اپنے سفرناموں میں بیان کر دیا۔ ان اشتراکات و اختلافات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

موسیقی:

موسیقی کو فنونِ لطیفہ میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ موسیقی نہ صرف روح کی غذا ہے بلکہ انسانی جذبات و احساسات کے اظہار کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ کوئی بھی فن اس وقت تک پروان نہیں چڑھ سکتا جب تک کہ اسے سراہا نہ جائے اور اس کے فن کاروں کی پذیرائی نہ کی جائے۔ گو کہ فن کار کے لیے تو اس کے مداحوں کی پذیرائی ہی کافی ہوتی ہے لیکن پھر بھی زندگی کے کچھ تقاضے ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں پورا کرنے کے لیے انھیں بھی عام لوگوں کی طرح روپے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب انؔشا پاکستان اور یورپ میں اس فن سے وابستہ فن کاروں کی اجرت کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں ان فن کاروں کی اجرت پاکستان میں موجود فن کاروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ یورپ میں نہ صرف اس فن سے وابستہ فن کاروں کی اجرت زیادہ ہے بلکہ وہاں ہر مزدور اور کارکن کو اس کی محنت و مشقت کا خاطر خواہ معاوضہ دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی زندگی بہتر طور پر گزار سکے۔ جبکہ پاکستان میں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس نظر آتی ہے۔ کیوں کہ یہاں نہ صرف اس فن سے وابستہ افراد تنگیٔ حالات کے شاکی نظر آتے ہیں بلکہ پورا محنت کش طبقہ ہی غربت و افلاس اور بدحالی کا شکار نظر آتا ہے۔ یوں یورپی ممالک کے سفر کے دوران انؔشا کو اس بات کا اندازہ ہوا کہ پاکستان میں موسیقی سے وابستہ فن کاروں کی اجرت بہت کم ہے جبکہ یورپی ممالک میں ایسے فن کاروں کی اجرت زیادہ ہے، یوں اس حوالے سے انھیں پاکستان اور یورپی ممالک میں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

اس کے بعد انؔشا پاکستان اور یورپ میں استعمال ہونے والے آلاتِ موسیقی کا تقابل کرتے ہیں جس سے انھیں یہ پتا چلتا ہے کہ یورپی آلاتِ موسیقی پاکستان میں استعمال ہونے والے آلاتِ موسیقی سے زیادہ بہتر اور ترقی یافتہ ہیں۔ وہ پاکستان اور یورپ میں استعمال ہونے والے آلاتِ موسیقی میں موجود اختلاف کی وضاحت سفرنامہ *آوارہ گرد کی ڈائری* کے درج ذیل حوالے میں یوں کرتے ہیں:

”ایک بار ہمارے دوست ممتاز مفتی کے راولپنڈی سے کراچی آنے کا پرچہ لگا۔ تو ہم نے اور احمد بشیر نے

ان کے خیر مقدم کے لئے لارنس روڈ سے کلن بینڈ والے کا باجا کرائے پر لیا۔ پوری ٹیم لینے کی تو مقدرت نہ تھی، نہ ہمیں خود ڈھول پیٹنا اور نفیری بجانا آتا ہے۔ بس ایک آدمی کی فیس دی۔ اس نے ٹرنت مٹکے میں سے نکال کر اپنی زرق برق جھالردار یونیفارم زیب تن کی اور ہمارے ساتھ ہولیا۔ یہ با کمال ایک ہاتھ سے ڈھول بجاتا تھا۔ دوسرے میں ٹرم پکڑے تھے۔ یہ تو دو ساز ہوئے، یورپ میں تو جہاں لیبر مہنگی ہوتی ہے۔ گلے میں تاشہ کہاروں کے پالکی میں ڈھول کا حساب ہمیشہ رہتا ہے۔ ایک آدمی تین تین چار چار باجے ایک ساتھ بجاتا ہے۔ منہ والا باجہ ہاتھ سے پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ ڈھول کے ساتھ ایک کمانی لگی ہے۔ اس میں وہ اٹکا رہتا ہے۔ ایک ذرا گردن جھکائی اور پھونک لگائی۔ اب دونوں ہاتھ فارغ ہیں۔ ایک سے ڈھول پر چوٹ لگایئے۔ دوسرے سے جھانجھ بجایئے یا سر کھجایئے۔'' ۲۲

یوں انشا نے اس حوالے میں بات کی وضاحت کی ہے کہ پاکستان اور یورپ میں موسیقاروں کی اجرت اور آلات موسیقی دونوں حوالوں سے اختلاف کی صورت موجود ہے۔

فن تعمیر:

فن تعمیر بھی فنون لطیفہ کی ایک شاخ ہے۔ اس فن میں ایک ماہر تعمیرات اپنے جذبات، احساسات اور آرزؤں کو ایک شاہکار عمارت کی صورت میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس فن کے ماہر کاریگروں نے اپنی فنی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہوئے دنیا میں شاہکار عمارات تعمیر کیں۔ اب بھی اس فن میں نئی نئی اختراعات کی جا رہی ہیں اور اسے نئی جہتوں سے آشنا کیا جا رہا ہے۔ مشرق وسطیٰ کے سفر کے دوران انشا کو جہاں دیگر اشیاء و مظاہر نے متوجہ کیا وہیں اس خطے کے فن تعمیر نے بھی ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔ البتہ ان کے سفرناموں کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ بحیثیت مسلمان ان کی دلچسپی خاص طور پر یہاں پر تعمیر کی جانے والی مساجد میں زیادہ رہی۔ انھوں نے اس خطے کے اسلامی ممالک میں تعمیر کی جانے والی عمارات اور مساجد کا تقابل پاکستان میں تعمیر کی جانے والی عمارت اور مساجد سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کی ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کی تفصیل ملاحظہ کیجیے۔

ایران قیام کے دوران انشا کو وہاں کے فن تعمیر کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ملا جس سے انھیں پاکستان اور ایران کے فن تعمیر میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔ انھوں نے ایران کی مشہور عمارت مدرسہ چہار باغ کا مشاہدہ بڑی باریکی اور گہرائی سے کیا۔ اس دوران انھیں اس عمارت پر قبے بنے ہوئے نظر آئے۔ اس عمارت پر قبے دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے کیوں کہ ایسے قبے انھوں نے بہاولپور ریلوے اسٹیشن کی عمارت پر بھی بنے ہوئے دیکھے تھے۔ ان قبوں کو دیکھ کر انھیں یہ اندازہ ہوا کہ پاکستان اور ایران کے فن تعمیر میں نہ صرف قبے تعمیر کرنے کا رواج موجود ہے بلکہ انھیں

ایران کی مشہور عمارت مدرسہ چہار باغ اور پاکستان میں بہاولپور ریلوے اسٹیشن کی عمارت میں اشتراک کی وجہ بھی یہی نظر آئی کہ ان دونوں عمارتوں میں قبے تعمیر کیے گئے تھے۔

انشا کو ایران اور پاکستان کے فن تعمیر میں اشتراک کی کئی اور صورتیں بھی نظر آئیں۔ اس سلسلے میں وہ بتاتے ہیں کہ جب میں ایران کے ایک قصبے رے گیا تو وہاں ایک ایرانی سفارت کار ہوشنگ نے مجھے بتایا کہ پرانے وقتوں میں اس شہر میں داخلے کے لئے مختلف دروازے بنائے گئے تھے، ان دروازوں کے مختلف نام تھے جو کسی نہ کسی مناسبت سے رکھے گئے تھے۔ مثال کے طور پر ایک دروازہ جو مشہور صوفی شاہ عبدالعظیم کی درگاہ کی طرف کھلتا تھا اس کا نام اسی درگاہ کی مناسب سے رکھا گیا تھا۔ جب ہوشنگ انشا کو یہ بتا رہے تھے تو اچانک ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ایسے دروازے تو پرانے زمانے میں لاہور شہر میں بھی داخل ہونے کے لئے بنائے گئے تھے اور ان کے نام بھی کسی نہ کسی مناسبت سے رکھے گئے تھے۔ یوں انشا کو ایرانی قصبے رے اور پاکستان کے لاہور شہر میں اشتراک کی یہ صورت نظر آئی کہ پرانے وقتوں میں ان دونوں جگہوں میں داخل ہونے کے لئے دروازے بنائے گئے تھے۔

اس کے بعد انشا پاکستان اور ایران میں تعمیر کی جانے والی عمارت کا تقابل کرتے ہیں اس تقابل میں بھی انھیں صرف اشتراک کے پہلو ہی نظر آتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کراچی اور طہران دونوں میں جدید طرز کی عمارات موجود ہیں جو نہ صرف بہت خوب صورت ہیں بلکہ بلندی میں آسمان کو چھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ البتہ جدید طرز کی بلند و بالا عمارت کے ساتھ ساتھ ان دونوں شہروں میں قدیم طرز کی عمارات اور کھنڈر بھی موجود ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایران کی سیاحت کے دوران ایک ایرانی گائیڈ مرتضیٰ نکوئی کی یہ کوشش رہی کہ وہ مجھے ایران کی ایسی عمارات دکھائے جو جدید طرز تعمیر کا نمونہ ہوں تا کہ میں انھیں دیکھ کر ایران کے فن تعمیر کا معترف ہوسکوں۔ اس لئے وہ اس بات پر مصر رہا کہ شیخ رحمت اللہ کی مسجد اور علی قاپو کی بجائے ایسی عمارت کو دیکھا جائے جو جدید طرز تعمیر کا شاہکار ہوں۔ وہ مجھے بار بار بانک ملی یا شہرداری (میونسپلٹی) جیسی عالیشان عمارت دیکھنے کا مشورہ دیتا رہا حالانکہ میں اسے بار بار یہ باور کراتا رہا کہ مجھے اس طرز کی جدید عمارات کے دیکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیوں کہ ایسی عمارات تو کراچی میں بھی موجود ہیں اگر مجھے ایسی ہی عمارات دیکھنی تھیں تو پھر مجھے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ یوں انشا بار بار انھیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ ایک سیاح کے لئے کسی جگہ کی جدید اور عالیشان عمارات پرکشش نہیں ہوتیں بلکہ اس کی توجہ کا اصل مرکز تو وہاں کی قدیم عمارات اور کھنڈر میں ہوا کرتے ہیں کیوں کہ یہی چیزیں اس جگہ کی تہذیب و ثقافت کی مکمل عکاسی کرتی ہیں۔ بہر حال انشا کو پاکستان اور ایران کے فن تعمیر میں اشتراک کی یہ صورت نظر آئی کہ ان دونوں ممالک میں جدید طرز کی اچھوتی اور عالیشان عمارات کے ساتھ ساتھ قدیم طرز کی عمارات اور کھنڈر بھی موجود ہیں۔

مسجد وہ عمارت ہے جو اسلامی ممالک کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی موجود ہوتی ہے۔ مسجد مسلمانوں کے لئے نہ

صرف ایک عبادت گاہ ہے بلکہ خانہ خدا کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ ایک مسلمان ماہر تعمیرات کے لئے مسجد نہ صرف فنی اعتبار سے ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ خدائے بزرگ و برتر سے محبت وعیقدت کے اظہار کا ایک ذریعہ بھی ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک مسلمان ماہر تعمیرات کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ اپنے مذہبی جوش وخروش اور عقیدت واحترام کو ایک خوب صورت عمارت کے قالب میں ڈھال سکے۔ مسلمانوں کے اسی جوش وجذبے اور عقیدت واحترام کے باعث دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت اور عالیشان مساجد دیکھنے کو ملتی ہیں۔ پاکستان سمیت تمام دیگر اسلامی ممالک اپنے فن تعمیر میں مساجد کی تعمیر کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں اور ان کی تعمیر میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کا خطہ خاص طور پر اسلامی ممالک پر مشتمل ہے۔ آنشا نے اس خطے کے فن تعمیر میں یہاں کی مساجد کی تعمیر کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ انھوں نے ان ممالک کی سیاحت کے دوران یہاں تعمیر کی گئی مساجد کا مشاہدہ بڑی باریکی اور گہرائی سے کیا اور ان کا تقابل پاکستان میں تعمیر کی گئی مساجد سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو نمایاں کرنے کی کوشش بھی کی' ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کی تفصیل ملاحظہ کیجئے۔

ایران قیام کے دوران آنشا کو وہاں کی مساجد دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا۔ اصفہان قیام کے دوران انھوں نے وہاں کی مشہور جامع مسجد دیکھی جس کا شمار ایران کی قدیم ترین عمارات میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اصفہان کی مشہور مسجد شاہ اور زنانہ مسجد لطف اللہ کی زیارت بھی کی اور طہران میں مختلف ادوار میں تعمیر کی جانے والی مساجد کا مشاہدہ بھی کیا۔ ان مساجد کو دیکھنے کے بعد جب وہ پاکستان اور ایران میں تعمیر کی جانے والی مساجد کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں ہی نظر آتی ہیں۔ اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ مجھے ان دونوں ممالک کی مساجد میں ان کی ظاہری وضع قطع کے حوالے سے خاصا اختلاف نظر آیا اس اختلاف کو وہ سفر نامہ *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں واضح کرتے ہیں:

> ''صحن کے وسط میں حوض تھا جو یہاں ہر مسجد میں ہوتا ہے۔ چار طرف حجرے جو اب بند ہیں استعمال میں نہیں آتے۔ ایران کی مسجدوں کی وضع ہماری مسجدوں سے مختلف ہوتی ہے۔ لوگ نماز پڑھتے ہیں ایک طرف کو لکی سی میں باقی صحن میں جس کا جی چاہے آئے جائے۔''۲۳

یوں درجہ بالا حوالے میں آنشا نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایران اور پاکستان میں تعمیر کی جانے والی مساجد میں ان کی ظاہری وضع قطع کے حوالے سے اختلاف کی صورت موجود ہے۔

پاکستان اور ایران کی مساجد میں جہاں آنشا کو اختلاف کا پہلو نظر آیا وہیں اشتراک کی ایک صورت بھی نظر آئی۔ کیوں کہ جب وہ اصفہان کی مشہور اور قدیم جامع مسجد کا تقابل اپنے ملک کی مسجد اختر الایمان سے کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں مساجد' بہت پرانی اور مخدوش حالت میں ہیں۔ ان مساجد کی بدحالی اور خستہ حالی کا اندازہ انھیں

اس کے در و دیوار کو دیکھ کر بخوبی ہوا جو ہر طرف سے ٹوٹے ہوئے' گندے اور اتفاقات زمانہ کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ وہ ان مساجد کی خستہ حالی کی بابت بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی ظاہری حالت ایسی تھی جیسے لنڈا بازار کے پرانے اور استعمال شدہ کپڑے۔ قصہ مختصر' انشا کو ایران کی جامع مسجد اور پاکستان کی مسجد اختر الایمان میں ان کی خستہ حالی' پرانے پن اور مخدوش حالت کے حوالے سے اشتراک کا پہلو نظر آیا۔

انشا نے پاکستان اور ایران میں جہاں مساجد کی ظاہری حالت کا تقابل کیا وہیں ان مساجد کے تقدس اور احترام کے حوالے سے بھی ان دونوں ممالک کے لوگوں کے طرز عمل کا تقابل کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس حوالے سے ان دونوں ممالک کے لوگوں میں اختلاف کا پہلو موجود ہے۔ انشا کہتے ہیں کہ یوں تو پاکستانی اور ایرانی دونوں اقوام کا تعلق امت مسلمہ سے ہے، مسلمان ہونے کے ناطے کسی شخص کو مسجد کی جس قدر تعظیم کرنی چاہئے یقیناً وہ اس سے واقف ہوتا ہے لیکن پھر بھی مساجد کے تقدس و احترام اور تعظیم کے حوالے سے مجھے پاکستانی اور ایرانی باشندوں کے طرز عمل میں صریحاً اختلاف نظر آیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب میں ایران کی جامع مسجد گیا تو دیکھا کہ وہاں لوگ جوتے مسجد سے باہر نہیں اتارتے بلکہ جوتوں سمیت ہی مسجد میں چلے آتے ہیں بلکہ کئی چھابڑی والے تو اپنی چھابڑی بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ انھوں نے مساجد کے تقدس و احترام کے حوالے سے ایرانی مسلمانوں کے طرز عمل کی وضاحت کر کے ان کے طرز عمل کو خوب تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کی یہ تنقید بے جا نہیں ہے بلکہ ایرانی مسلمانوں کے طرز عمل کے حسب حال ہے۔ پھر مساجد کے تقدس و احترام کے حوالے سے وہ پاکستانی قوم کے طرز عمل کی وضاحت کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ پاکستانی مساجد کے احترام کو ملحوظ رکھتی ہے اور ایسے تمام کاموں سے حتی الامکان اجتناب کرنے کی کوشش کرتی ہے' جن سے مساجد کی توہین کا کوئی بھی پہلو نکلتا ہو۔ یوں انشا کو مساجد کو احترام کے حوالے سے پاکستانی اور ایرانی مسلمانوں کے طرز عمل میں صریحاً اختلاف نظر آیا۔

الغرض انشا کو پاکستان اور ایران کے فن تعمیر اور اس سے متعلقہ دیگر زاویوں میں اشتراک کے ساتھ ساتھ اختلاف کے پہلو بھی نظر آئے۔

شاعری:

انسانی جذبات کے اظہار کا سب سے مقبول اور معروف ذریعہ شاعری ہے۔ شاعری نہ صرف جذبات اور احساسات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے بلکہ یہ ہمارے جذبات اور احساسات کی تطہیر بھی کرتی ہے۔ انشا کو دنیا کے مختلف ممالک میں گھومنے اور وہاں کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ ان ممالک میں قیام کے دوران اگر انھیں کسی علمی یا ادبی محافل میں شرکت کی دعوت دی گئی تو انھوں نے ان محافل میں بھرپور شرکت کی۔ ان محافل میں شرکت سے انھیں نہ صرف اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا بلکہ ان ممالک کے علم و ادب کے بارے میں بھی جاننے کا موقع بھی در آیا۔ دیگر ممالک کی طرح مشرق وسطیٰ کے ممالک کے سفر کے دوران بھی انھیں ان ممالک میں منعقد کی جانے والی علمی و ادبی محافل میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ جس سے انھیں اس خطے کے علم

وادب کے بارے میں جاننے کا موقع بھی ملا۔انھوں نے ان ممالک کے علم وادب کا تقابل پاکستان کے علم وادب سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت بھی کی۔جس کی تفصیل ذیل میں بیان کی جاتی ہے۔

انشا پاکستان اور بھارت کی شاعری کا تقابل کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ ہندی اور بھاشا شاعری میں زنانہ پن غالب ہے جبکہ پاکستان کے صوبہ پنجاب کی لوک شاعری میں میں مردانہ پن غالب ہے۔زنانہ پن سے مراد یہ ہے کہ ہندی اور بھاشا شاعری میں زنانہ طرز تخاطب اختیار کیا جاتا ہے اس زنانہ طرز تخاطب کے سبب ان کی شاعری ایک مخصوص لب و لہجہ اور رنگ ڈھنگ اختیار کر لیتی ہے جس میں ایک خاص نرمی لوچ ملائمیت اور موسیقیت کا احساس ملتا ہے۔جبکہ پنجاب کی لوک شاعری میں مردانہ طرز تخاطب اختیار کرنے کے سبب شاعری میں ایک بلند بانگ لہجہ اور کسی حد تک درشتی اور کھردرے پن کا احساس ملتا ہے۔یوں ان دونوں ممالک کی شاعری، طرز تخاطب کے اختلاف کے باعث متضاد خوبیوں کی حامل ہو جاتی ہے۔ان دونوں ممالک کی شاعری میں طرز تخاطب کے باعث پیدا ہونے والے اختلاف کی وضاحت درج ذیل اشعار میں واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے جو ہری اودھ کی کتا بھگت کبیر فلسفہ و شاعری سے لیے گئے ہیں۔

ہندی شاعری کی خصوصیات کے نمائندہ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

"نین کی کر کوٹھری پتری پلنگ بچھائے
پلکوں کی چق ڈار کے پیہ کو لیار جھائے" ۲۴

"پریت جو لاگی گھل گئی پیٹھ گئی من مانہیہ
روم روم پیو پیو کہے مکھ کی سردھا نانہہ" ۲۵

"ہم تمھر و سمرن کریں تو موہے چتوۓ نانہہ
سمرن من کی پریت ہے سو من تم لی مانہہ" ۲۶

"جو جاگت سو سُپن میں جیوں گھٹ بھیتر سانس
جو جَن جاکو بھاوتا سو جَن تا کے پاس" ۲۷

اب پنجاب کی لوک شاعری میں مردانہ طرز تخاطب کے باعث پیدا ہونے والی خصوصیات ملاحظہ کیجئے:

"تینوں لے دیاں سلیپر کالے
نی چاہے میری مُجھ وِک جائے" ۲۸

"کتی مر جائے گوانڈے تیری
نی بوہے کولوں یار موڑیا" ۲۹

بہر حال انشا کو صوبہ پنجاب کی لوک شاعری اور ہندی و بھاشا شاعری میں طرز تخاطب کے اختلاف کے باعث اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

زبان

انسان کو حیوان ناطق بھی کہا جاتا ہے۔ دیگر مخلوقات پر اس کی فضیلت صرف اس کے علم، عقل اور تکلم کی بدولت ہے۔ یوں تو ہر مخلوق اپنے جذبات واحساس کا اظہار کسی نہ کسی طریقے سے کرتی ہے لیکن انسان کو یہ خوبی عطا کی گئی ہے کہ وہ اپنا اظہار دیگر مخلوقات کے مقابلے میں زیادہ بہتر، واضح اور منظم صورت میں کرسکتا ہے۔ اظہار کے یوں تو بہت سے ذرائع ہیں لیکن زبان ان میں سے سب سے اہم اور مؤثر ذریعہ ہے۔ انسانی زندگی میں خصوصاً باہمی تعلقات اور لین دین کے معاملے میں اس کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انشا کو اپنی سرکاری مصروفیات کے سلسلے میں دنیا کے بیشتر ممالک کے سفر کا موقع ملا۔ اس دوران انھیں مختلف اقوام کے لوگوں سے باہمی مکالمت اور لین دین کی ضرورت بھی پیش آئی۔ تاہم انھوں نے کسی بھی ملک میں جانے سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ وہاں کی زبان کے چند چیدہ چیدہ الفاظ سیکھ لیے جائیں تاکہ وہاں قیام کے دوران کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئے۔ مزید سہولت کے لئے انھوں نے ان زبانوں کی ڈکشنریاں بھی ساتھ رکھ لیں تاکہ بوقت ضرورت کام آسکیں اور جہاں یہ ڈکشنریاں بھی بے بس نظر آئیں وہاں دنیا کی بین الاقوامی زبان یعنی اشاروں کی زبان سے کام چلالیا۔ البتہ اس زبان کو استعمال کرتے ہوئے کبھی تو ان کا اشارہ اتنا واضح ہوتا کہ مخاطب ان کی بات فوراً سمجھ لیتا اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ان کے اشارے کمزور رہتے جس کے سبب مخاطب ان کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کبھی تو انھیں صرف کسی مضحک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا اور کبھی کسی اختلافی صورت حال کا۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک کے سفر کے دوران انشا کو اس خطے میں بولی جانے والی زبانوں کے بارے میں جاننے کا موقع بھی ملا۔ انھوں نے اس سلسلے میں جو معلوماتِ حاصل کیں ان کا تقابل پاکستان کی قومی اور علاقائی زبانوں سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو سامنے لانے کی کوشش بھی کی۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کی تفصیل ملاحظہ کیجئے۔

انشا جب زبان کے حوالے سے پاکستان اور بھارت کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں ان دونوں ممالک میں اس حوالے سے اشتراک کی یہ صورت نظر آتی ہے کہ ان میں قومی زبان کے ساتھ ساتھ کچھ علاقائی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ اس بات کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا کہ جب طہران قیام کے دوران انھیں ایک پاکستانی دوست، صادق صاحب کے ہاں ایک محفل میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک پاکستانی سرور سیال نے پاکستان اور ہندوستان میں بولی جانے والی علاقائی زبانوں کی نقل اتاری، جس سے ان دونوں ممالک میں بولی جانے والی علاقائی زبانوں کی موجودگی کا اشارہ ملتا ہے۔ سفر

نامہ دنیا گول ہے کا درج ذیل حوالے اس سلسلے میں ملاحظہ کیجئے:

''آخر میں سرور صاحب نے مختلف علاقوں کے لوگوں کی بولیوں کی نقل بھی اتاری۔ مسافر پشاور سے پشتو سنتا اور کانوں میں تیل ڈالوا تا چلتا ہے۔ لاہوریوں کی خاص بولی بلکہ بنکار سنتا ہے۔ پھر پٹیالے کی بولی ''دلّی کی کرخنداری زبان کلکتے کی بنگلہ اور آخر میں مدراس کی اگڑم بگڑم' ہنستے ہنستے لوگوں کی پسلیاں دکھنے لگیں''۔[۱۲]

ہر زبان کا اپنا ایک مخصوص لہجہ ہوتا ہے جسے صرف اس زبان کے اہل زبان ہی صحیح تلفظ سے ادا کر سکتے ہیں۔ کسی بھی زبان میں اس کا لہجہ بہت اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ اگر لہجہ درست ہو گا تو بات سمجھنا اور سمجھانا دونوں آسان ہو جائیں گے۔ لہجے کے اختلاف کے باعث کئی بار بڑے بڑے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ انؔشا بتاتے ہیں کہ میں فارسی اور فرانسیسی زبان کی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ رکھتا تھا لیکن یہ سمجھتا تھا کہ شاید ڈکشنری سے ان زبانوں کے صرف چند الفاظ سیکھ کر میں ان زبانوں کے اہل زبان سے گفتگو کرنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ تاہم جب کبھی باہمی مکالمت کی ضرورت پیش آ جاتی تو مجھ پر یہ حقیقت کھلتی کہ ان دونوں زبانوں میں میری استعداد تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایران قیام کے دوران مجھے میری فارسی نے بہت نقصان پہنچایا۔ اس سلسلے میں وہ ایک بڑی دلچسپ صورت حال کا ذکر کرتے ہیں جس میں انھیں اور ان کے دو دوستوں سہسرامی صاحب اور بشیر احمد کو ایک پاکستانی دولت کلیم صاحب سے ٹیلی فون پر بات کرنا تھی، جو طہران کی ایک دانش گاہ میں ڈاکٹر کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ چنانچہ ان تینوں صاحبان نے کلیم صاحب سے بات کرنے کے لیے انھیں فون کیا۔ فون اٹھانے کے بعد کسی خاتون کی آواز سنائی دی۔ انؔشا اپنی فارسی میں کچھ فرمانے لگے لیکن جیسے ہی خاتون نے گوشی گوشی کے الفاظ کہے تو انھوں نے فون فوراً اپنے دوست بشیر کو دے دیا تا کہ وہ بھی بات کر سکے۔ انؔشا گوشی گوشی کے الفاظ سے یہ سمجھے کہ شاید وہ خاتون یہ کہہ رہی ہیں کہ میں کلیم صاحب کو اطلاع دے دے دوں گی۔ لہٰذا انھوں نے یہ الفاظ سنتے ہی فون بند کر دیا لیکن بعد میں یہ پتا چلا کہ فارسی زبان میں گوشی گوشی کا مطلب ہولڈ آن تھا۔ یوں فارسی زبان سے عدم واقفیت کی بنا پر انؔشا اور ان کے دوستوں کو ایک اختلافی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔

اس کے بعد انؔشا اردو اور فارسی زبان پر دیگر زبانوں کے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس جائزے سے انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں زبانوں پر عربی، فرانسیسی اور انگریزی زبان کے اثرات موجود ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان دونوں زبانوں میں عربی، فرانسیسی اور انگریزی زبان کے الفاظ موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ڈیکوریشن انگریزی زبان کا لفظ ہے اور انٹرول فرانسیسی زبان کا لیکن یہ دونوں الفاظ ان دونوں زبانوں میں موجود ہیں۔ وہ مزید یہ بھی بتاتے ہیں کہ فارسی زبان میں فرانسیسی الفاظ کا استعمال اردو زبان کے مقابلے میں نہ صرف زیادہ ہے بلکہ فرانسیسی الفاظ فارسی زبان میں فارسی الفاظ کی جگہ بھی لے رہے ہیں۔ اردو اور فارسی زبان میں اشتراک کا پہلو تو انھیں یہ نظر آیا کہ ان دونوں زبانوں میں عربی زبان کے لفظ

موجود تھے اور اختلاف کی صورت انھیں یہ نظر آئی کہ ان دونوں زبانوں میں ان کے معانی مختلف تھے۔ مثلاً اردو زبان میں استعمال ہونے والے عربی زبان کے لفظ دفتر کا مطلب اردو میں اور ہے لیکن فارسی زبان میں اس لفظ کے معنی کالی کے ہیں۔ یوں اردو اور فارسی زبان پر دیگر زبان کے اثرات کے حوالے سے انھیں اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں ہی نظر آئیں۔ اس کے بعد انشا اردو اور فارسی زبان کا تقابل کرتے ہیں جس سے انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کئی الفاظ ایسے بھی ہیں جو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں موجود ہیں لیکن ان دونوں زبانوں میں ان الفاظ کے معانی مختلف ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایران میں اگر کسی شخص کا جوتا ٹوٹ جائے تو وہ اسے ٹھیک کرانے کے لئے تعمیر کا لفظ استعمال کرے گا' کیوں کہ تعمیر وہاں مرمت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جبکہ اردو زبان میں اس لفظ کے معانی بالکل مختلف ہیں۔ اسی طرح فارسی زبان میں دستگیر کا مطلب گرفتار ہے اور گرفتار کے معنی مصروف کے ہیں جبکہ اردو زبان میں اس لفظ کے معنوں ان معنوں سے بالکل مطابقت نہیں رکھتے۔ اسی طرح لفظ سالن بھی ان دونوں زبانوں میں موجود ہے۔ فارسی زبان میں یہ لفظ ایسی تمام دکانوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جہاں بالوں کو کاٹا جاتا ہے' مالش کی جاتی ہے' جلد کو رگڑ کر صاف کیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ البتہ اردو زبان میں اس لفظ سے مراد وہ سالن ہے جو کھانا کھانے میں کام آتا ہے۔ یوں اردو اور فارسی زبان کے تقابل سے انشا کو یہ معلوم ہوا کہ ان دونوں زبانوں میں کچھ الفاظ ہیں تو مشترک لیکن ان الفاظ کے معانی ان دونوں زبانوں میں مختلف ہیں۔ یوں انھیں اردو اور فارسی زبان کے تقابل میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

انشا کو ان کی سرکاری مصروفیات نے ترکی کے سفر کا موقع بھی فراہم کیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ وہاں قیام کے دوران میں نے ترکی کی زبان سیکھنے کی بھرپور کوشش کی لیکن پھر بھی میں اس زبان میں وہ استعداد پیدا نہ کر سکا کہ اس میں تبادلۂ خیال کر سکوں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ترکی آ کر مجھے یہ تو معلوم ہو گیا کہ ترکی زبان میں ایوت کے معنی ہاں اور یوق کے معنی نہیں کے ہیں' اسی طرح چوق گزیل کے معنی بہت اچھا اور اکی کے معنی دو کے ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس زبان میں ایک کے لئے کون سا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں قیام کے دوران جب بھی مجھے ایک بوتل پانی چاہیے ہوتا تو میں کہتا آفندم اکی' شیشہ سوک سو' مطلب جناب دو بوتل ٹھنڈا پانی۔ لیکن جب بیرا دو بوتل پانی لے آتا تو میں ایک بوتل تو رکھ لیتا اور دوسری بوتل کو چوق کہہ کر واپس کر دیتا۔ یوں بیرے پر میں یہ ظاہر نہ ہونے دیتا کہ مجھے یہ علم نہیں ہے کہ ترکی زبان میں ''ایک'' کے لیے کون سا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ اردو حروف تہجی کا تقابل ترکی حروف سے کرتے ہیں تو اس تقابل سے انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترکی زبان میں C کا مطلب ج ہوتا ہے۔ مثلاً لفظ American کو اگر کوئی ترکی کا رہنے والا پڑھے گا تو C کی بجائے ج کی آواز لگائے گا۔ اسی طرح ج کے لیے G کے نیچے ذرا سا شوشہ ڈال دیا جاتا ہے' یعنی اس طرح G اور T اس زبان میں د کی آواز دیتا ہے۔ انشا اردو اور ترکی زبان کے حروف تہجی میں موجود اختلاف کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک دن مجھے ایک بادشاہ کی تصویر نظر آئی، تصویر کے نیچے اس بادشاہ کا نام ABDUL

MEGIT لکھا تھا۔ پہلے تو مجھے یہ یہ سمجھ نہ آئی کہ اس تصویر کے نیچے کیا نام لکھا ہے لیکن بعد میں جب میں نے اردو اور ترکی حروف تہجی کے اختلاف کو سامنے رکھا تو مجھے سمجھ آ گیا کہ ان کا نام سلطان عبدالمجید ہے۔ بہرحال ترکی میں قیام کے دوران بھی انشا کو زبان کے اختلاف کے باعث کئی بار اختلافی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ یوں انشا کو پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کی زبانوں میں اشترک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

الغرض انشا نے مشرق وسطیٰ کے ممالک کے سفر کے دوران پاکستان، مشرق وسطیٰ اور کئی دیگر ممالک کی معاشرت کا تقابل کئی حوالوں سے کیا۔ اس تقابل میں انھیں اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں نظر آئیں۔ اس تقابل سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پاکستان اور مشرق وسطیٰ کا خطہ یوں تو اسلامی ممالک پر مشتمل ہے لیکن پھر بھی اس خطے میں بسنے والے لوگوں کی زندگی میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ سفر نامہ نگار نے اپنے سفر ناموں میں اس لفظ کے دو املاء، تہران اور طہران دونوں اختیار کیے ہیں لیکن اس لفظ کا درست املاء چونکہ طہران ہے اس لئے تقابلی مطالعے میں اسی املا کو اختیار کیا گیا ہے۔
۲۔ ابن انشا،دنیا گول ہے،طبع بست وکیم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۲۰۰۱ء،ص ۱۸۳
۳۔ ابن انشا،ابن بطوطہ کے تعاقب میں،طبع سیزدہم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۱۹۹۱ء،ص ۲۲۱
۴۔ ایضاً ایضاً
۵۔ ایضا ص ۲۲۲
۶۔ ایضا ص ۲۲۷
۷۔ ابن انشا،دنیا گول ہے،طبع بست وکیم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۲۰۰۱ء،ص ۱۹۲
۸۔ ابن انشا،آوارہ گرد کی ڈائری،طبع دواز دہم،لاہور،اکیڈمی،۱۹۸۵ء،ص ۲۷۳،۲۷۵
۹۔ ابن انشا،دنیا گول ہے،طبع بست وکیم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۲۰۰۱ء،ص ۱۹۲،۱۹۳
۱۰۔ ابن انشا،ابن بطوطہ کے تعاقب میں،طبع سیزدہم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۱۹۹۱ء،ص ۲۱۶
۱۱۔ ابن انشا نے وائٹ ہاؤس کو انگلستان کی سرکاری عمارت قرار دیا ہے حالانکہ یہ امریکہ کی سرکاری عمارت ہے جہاں امریکہ کے صدر سرکاری فرائض سرانجام دیتے ہیں۔
۱۲۔ ایضاً ص ۲۷۷
۱۳۔ ابن انشا،آوارہ گرد کی ڈائری،طبع دواز دہم،لاہور،اکیڈمی،۱۹۸۵ء،ص ۳۱۷،۳۱۸
۱۴۔ ایضاً ص ۲۸۳
۱۵۔ ایضاً ایضاً
۱۶۔ ایضاً ص ۲۸۶
۱۷۔ ابن انشا،ابن بطوطہ کے تعاقب میں،طبع سیزدہم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۱۹۹۱ء،ص ۲۲۰
۱۸۔ ابن انشا،دنیا گول ہے،طبع بست وکیم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۲۰۰۱ء،ص ۱۷۸
۱۹۔ ابن انشا،ابن بطوطہ کے تعاقب میں،طبع سیزدہم،لاہور،لاہور اکیڈمی،۱۹۹۱ء،ص ۲۲۰
۲۰۔ ایضاً ص ۳۱۵

۲۱۔ ایضاً ص۳۱۵'۳۱۶

۲۲۔ ابن انشا *آوارہ گرد کی ڈائری*، طبع دوازدہم لاہور' اکیڈمی' ۱۹۸۵ء' ص ۳۱۳

۲۳۔ ابن انشا *ابن بطوطہ کے تعاقب میں*، طبع سیزدہم' لاہور' لاہور اکیڈمی' ۱۹۹۱' ص ۲۳۶

۲۴۔ ہری اودھ (مترجم: سرسوتی سرن کیف) *بھگت کبیر فلسفہ وشاعری*' لاہور' فکشن ہاؤس' ۲۰۰۲ء' ص ۴۵

۲۵۔ ایضاً ص ۴۳

۲۶۔ ایضاً ایضاً

۲۷۔ ایضاً ایضاً

۲۸۔ ابن انشا، *دنیا گول ہے*، طبع بست ویکم، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۷۴

۲۹۔ ایضاً ایضاً

۳۰۔ ایضاً ص ۱۷۵

باب چہارم

یورپ اورامریکہ کے سفرنامے

انشا کوان کی سرکاری مصروفیات نے یورپ اورامریکہ کے سفر کے مواقع بھی فراہم کیے۔اس خطۂ ارض میں ان کا قیام زیادہ تر فرانس، انگلستان، جرمنی، ہالینڈ، سوئٹزرلینڈ، امریکہ، ویانا اور ہوائی میں رہا۔ان ممالک میں مختلف رنگ ونسل کے لوگ آباد ہیں جونہ صرف شکل وصورت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ ان کی تاریخ، جغرافیہ، آب وہوا، لباس، ثقافت، زبان، مذہب، رسم ورواج، دلچسپیاں اور مشاغل، اندازفکر، معاشرتی اقداراوررویے، اخلاقی قدریں، قیام و طعام، ادب وآداب، اندازفکر، معیشت بھی ایک دوسرے مختلف ہے۔ افراد واقوام کی اسی رنگارنگی اور تنوع پر دنیا کی خوبصورتی اور ہماہمی کا دارومدار ہے۔ اگر دنیا میں ایک ہی رنگ ونسل کے لوگ آباد ہوں اوران انسانوں کے دیگر متعلقات بھی بالکل ایک جیسے ہوتے تو یہ دنیا اتنی دلچسپ نہ ہوتی۔ دنیا کی اسی خوبصورتی اور رنگارنگی نے انسان کوسفرپسندی کا شائق بنا دیا اور وہ عجائبات عالم کی تلاش میں دنیا کے مختلف خطوں کے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔

انشا نے بھی جب یورپ اورامریکہ کا سفر اختیار کیا تو ان ممالک میں قیام کے دوران انھوں نے ان ممالک کی تاریخ، جغرافیہ، رنگ ونسل، تہذیب وتمدن، معاشرتی اقدار، اخلاقی اقدار، مذہب، ثقافت، زبان، سماجی رویوں کی شکست وریخت اور اندازفکر غرض ہرحوالے سے معلومات وکوائف حاصل کرنے کی کوشش کی۔انھوں نے ان معاشروں سے حاصل کردہ معلومات کا تقابل پاکستانی معاشرے کی متعلقہ معلومات وکوائف سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت بھی کی۔ اس تقابل سے انھوں نے اپنے قارئین پر یہ بھی واضح کیا کہ پاکستان اوران ممالک کے مختلف جغرافیائی حدود میں واقع ہونے کے باوجودان میں اختلافات کے ساتھ ساتھ کچھ اشتراکات کے پہلو بھی موجود ہیں۔

انشا نے یورپ کے مختلف معاشروں میں قیام کے دوران وہاں نہ صرف اشیاء ومظاہر کواپنی دلچسپی کا مرکز بنایا بلکہ ان ممالک میں بسنے والے لوگوں کو بھی اپنے مطالعے کا موضوع بنایا اوران کی معاشرتی زندگی اور سماجی رویوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ انھوں نے لوگوں کے نہ صرف ظاہری احوال میں دلچسپی لی بلکہ ان کے اندرون میں جھانکنے کی کوشش بھی کی اوران کے اندازفکر سے لے کران کی نفسیاتی کیفیات تک کواپنے تقابلی مطالعے کا موضوع بنایا۔انھوں نے جن مغربی ممالک میں قیام کیا وہاں ان کی سرکاری مصروفیات نے جس قدر بھی موقع فراہم کیا، انھوں نے ان ممالک کے معاشروں کا قریب سے مطالعہ ومشاہدہ کیا۔انھوں نے اس مطالعے ومشاہدے سے یہ بتایا ہے کہ پاکستان اور مغربی ممالک

مختلف جغرافیائی خطوں میں واقع ہیں لیکن پھر بھی ان کے موسم اور آب وہوا میں جہاں ہمیں صرف اختلافات کے پہلو نظر آتے ہیں وہیں کچھ اشتراکات بھی ہماری دلچسپی اور حیرانی کا سبب بنتے ہیں۔اس کے علاوہ پاکستان اوران ممالک کی تاریخ میں بھی اختلافات کے ساتھ ساتھ مماثلتوں کے کئی پہلو نکلتے ہیں۔یہی حال پاکستان اور مغربی ممالک کی تہذیب وتمدن کا بھی ہے، جس میں مختلف خطۂ ارض کے باوجود مماثلتوں کے کئی پہلو نظر آتے ہیں۔بہرحال انشاؔ نے پاکستان اور مغربی ممالک کی معاشرت کے تقابل سے دونوں خطوں میں پائے جانے والے اشتراکات اور اختلافات کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی۔البتہ انھوں نے ان معلومات کو کہیں تو بہت سادہ ورواں اور شگفتہ اسلوب میں پیش کیا اور کہیں خالص مزاح کی مٹھاس اور چاشنی سے کام لیا اور کہیں طنزِ خفیف کی ہلکی سے کڑواہٹ کی اپنے اسلوب میں آمیزش کی۔انھوں نے اپنے سفرناموں میں پاکستان اور مغربی ممالک کی معاشرت کا تقابل جن عنوانات کے تحت کیا وہ درج ذیل ہیں۔

موسم اور آب وہوا

موسم سے مراد کسی جگہ پر درجہ حرارت کی وقتی یا عارضی کیفیت ہے اور آب وہوا کسی جگہ پر موسم کی سالانہ اوسط کیفیت کا نام ہے۔کرۂ ارض کے مختلف خطوں کی اپنی مخصوص آب وہوا ہے جوان کے لیے انفرادیت کا باعث ہے۔دنیا کے کچھ خطے اپنی گرم آب وہوا کی وجہ سے مشہور ہیں اور کچھ اپنی سرد آب وہوا کی وجہ سے۔اس موسمیاتی تنوع نے انسان میں سفر پسندی کے جذبے کو تحریک دی اور اسے ملک ملک کی سیر کروائی۔یوں تو دنیا کا ہر خطہ اور ہر ملک ہی دوسرے خطے اور ملک سے کسی نہ کسی اعتبار سے مختلف ضرور ہے لیکن کبھی کبھی موسمیاتی تنوع بھی کسی ملک کو شناخت کا ایک نیا زاویہ عطا کرتا ہے۔ انشاؔ نے یورپ اور امریکہ کے سفر کے دوران وہاں کے موسم کو بھی بطورِ خاص اپنے مطالعے اور مشاہدے کا مرکز بنایا۔دورانِ سفر انھیں پاکستان اوران ممالک کے موسم اور آب وہوا میں اشتراک اور اختلاف کی جو صورتیں نظر آئیں ان کو انھوں نے اپنے سفرناموں میں بڑے ہی دلچسپ اور مزاحیہ انداز میں بیان کر دیا۔انھوں نے پاکستان اور مغربی ممالک کے موسم اور آب وہوا میں جن اشتراکات اور اختلافات کو محسوس کیا وہ درج ذیل ہیں۔

یورپی ممالک میں سے انگلستان ایک ایسا ملک ہے جس کا سفر انشاؔ نے متعدد بار کیا۔وہاں قیام کے دوران ان پر یہ حقیقت کھلی کہ پاکستان اور انگلستان کے موسم میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو موجود ہیں۔اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ان ممالک میں قیام کے دوران مجھے نہ صرف اس بات کا تجربہ ہوا کہ پاکستان اور مغربی ممالک کے موسم سرما میں سردی کی شدت کے حوالے سے اختلاف کا پہلو موجود ہے بلکہ یہ حقیقت بھی آشکار ہوئی کہ مشرق اور مغرب، دونوں خطوں میں موسموں کی ترتیب کے حوالے سے بھی اختلاف موجود ہے۔یورپی ممالک کے سفر کے دوران انشاؔ نے

کراچی اورلندن کے موسم کا تقابل بھی کیا اور اس تقابل کے نتیجے میں انھیں درجہ حرارت کی شدت اور موسموں کی ترتیب کے حوالے سے اشتراک اور اختلاف کی جو صورتیں نظر آئیں ان کو انھوں نے بڑے مزاحیہ انداز میں سفر نامہ نگری نگری پھرا مسافر کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے۔

> ''ہم وطن عزیز سے چلے ہیں تو گرمی تھی، کم از کم کراچی میں تو تھی الیکشن کی سرگرمی نے اس گرمی کو دو آتشہ کر دیا تھا۔ لوگ کپڑوں سے باہر ہو رہے تھے۔ لندن پہنچے تو تیرے آزاد کو پالے سے پالا پڑا۔ ہوائی اڈے پر اترے تو ہم بھی اوور کوٹ وغیرہ پہنے لقہ کبوتر بنے ہوئے اور ہمارے دوست بھی جو ہمیں لینے آئے تھے ہم نے پوچھا کیا کوئٹے کی لہر آئی ہوئی ہے؟ بولے یہ کوئٹے کی ہوا نہیں ہے، مقامی سردی ہے اور یہاں کے حساب سے سردی نہیں بہار ہے۔ ان کے گھر کے سامنے بڑا اچھا پارک ہے۔ دیکھا کہ وہاں غنچے سر اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں روز دو سوت اور کھل جاتے تھے۔ اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہنوں کی جھلک ابھی سے دکھا رہے تھے۔ کوئی دن جاتا ہے کہ سوکھی گھاس کے قطعے گل وگلزار بن جائیں ہمارے لئے، اس موسم میں لندن آنے کا یہ پہلا موسم ہے کبھی ستمبر میں آئے کبھی نومبر میں پالا پڑتا اور بہار کے آنے سے پہلے سامان باندھا اور رخصت ہوئے'' [۱]

درجہ بالا حوالے میں انشا کو پاکستان اور انگلستان کے موسم میں جہاں اختلاف کی کئی صورتیں نظر آئیں وہیں اشتراک کا ایک پہلو بھی نظر آیا۔ اشتراکات کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ کراچی اور لندن کے موسم میں اشتراک کی ایک صورت تو یہ ہے کہ جس طرح کراچی شہر کے موسم میں غیر متوقع تبدیلی کا ہونا ایک عام سی بات ہے اسی طرح لندن شہر کے موسم میں بھی آئے دن کوئی نہ کوئی غیر متوقع تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہ حقیقت ان پر اس وقت کھلی جب وہ موسم گرما میں لندن گئے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان دنوں وہاں گرمی کی شدت اپنے عروج پر تھی اور لوگ گرمی کے مارے بے حال ہوئے جا رہے تھے۔ لیکن یہاں کے لوگ اس شدید گرمی سے بچاؤ کا کوئی مؤثر علاج کرنے سے قاصر تھے۔ یوں یہاں کے لوگوں کو ہماری طرح یہ سہولت بھی میسر نہ تھی کہ پنکھے چلا کر ہی اپنے آپ کو گرمی کی شدت سے بچا سکیں۔ اس کے علاوہ وہاں مکانات بھی اس طرز کے تعمیر کیے جاتے ہیں کہ ان میں ہوا کا گزر کم سے کم ہو سکے۔ اس مقصد کے تحت وہاں تعمیر کیے جانے والے گھروں میں نہ تو کھڑکیاں بنائی جاتی تھیں اور نہ ہی روشندان بنانے کا التزام کیا جاتا تھا۔ یوں وہاں تعمیر کیے جانے والے گھروں میں ہوا کے گزرنے کا کیونکہ کوئی معقول انتظام نہیں ہوتا اس لئے کسی بھی غیر متوقع تبدیلی کے سبب اگر یہاں گرمی کی شدت میں اضافہ ہو جائے تو وہاں رہنے والوں کے پاس اس گرمی کی شدت کو کم کرنے کا کوئی مناسب بندوبست نہیں ہوتا۔ انشا بتاتے ہیں کہ پاکستان کے موسم میں بھی غیر یقینی تبدیلی آئے دن ہوتی رہتی ہے لیکن یہاں کے لوگوں کے پاس یہ سہولت ہوتی ہے کہ یہاں تعمیر کیے جانے والے گھروں میں ہوا کی آمد و رفت کا مناسب انتظام رکھا جاتا ہے۔ جس کے سبب اگر گرمی کی شدت میں اضافہ ہو بھی جائے تو بھی ان لوگوں کے پاس گرمی کی شدت کو کم کرنے کے ذرائع موجود

ہوتے ہیں جبکہ انگلستان میں بسنے والوں کے پاس شدید گرمی سے بچنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ آنشا بتاتے ہیں کہ آخر کار میں نے وہاں کی گرمی سے بچاؤ کی یہ تدبیر کی کہ بازار سے ایک ہاتھ والا پنکھا خرید لایا اور اس سے گرمی کی شدت کو کم کرنے کی تدبیر کی۔ وہ بتاتے ہیں کہ میں نے تو ہاتھ والے پنکھے کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا اور جن لوگوں کو یہ پنکھے میسر نہ آ سکے انھوں نے اخباروں اور گتوں سے اپنا کام چلایا تا کہ گرمی سے بچاؤ کی کوئی صورت ممکن ہو سکے۔

انگلستان کے موسم گرما میں غیر متوقع تبدیلی صرف درجہ حرارت میں اضافے کی صورت میں ہی نہیں ہوتی بلکہ کئی بار تو یہ تبدیلی درجہ حرارت میں کمی کی صورت میں بھی ہوتی ہے۔ وہاں موسم گرما میں کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ گرمی کے موسم میں سردی کا سماں بن جاتا ہے اور موسم کی رُت اتنی بدل جاتی ہے کہ گرمیوں کے موسم میں سردیوں کی سی ٹھنڈ اور خنکی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ آنشا بتاتے ہیں کہ ایک بار جب میں لندن گیا تو ان دنوں وہاں موسم گرما کا دور دورہ تھا۔ ایک دن میں ہائیڈ پارک گیا تو دیکھا کہ ہر طرف سماں ہی کچھ اور ہے یعنی دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی اور یخ بستہ ہوائیں بھی چل رہی تھیں، میں موسم کی اس نیرنگی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ تھوری دیر بعد ہوا میں خنکی بتدریج بڑھنے لگی اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے سائبیریا یا ٹنڈرا کے میدانوں کی سرد ہوائیں یہاں بھیج دی گئی ہوں۔ ہائیڈ پارک میں پڑنے والی سردی کی بابت وہ بتاتے ہیں کہ وہاں اس وقت اتنی شدید سردی تھی جو کم از کم میرے لئے تو نا قابل برداشت تھی، میں سردی سے ٹھٹھر رہا تھا اور مارے سردی کے میرا وہاں ٹھہرنا مشکل ہو رہا تھا۔ لہٰذا میں نے اس سرد موسم میں ٹھٹھرنے اور بے حال ہونے کے بجائے واپسی کی راہ لی اور گھر پہنچتے ہی لحاف اوڑھ کر سو گیا۔ بہر حال آنشا کو انگلستان کے متعدد بار سفر سے اس بات کا اندازہ ہوا کہ کراچی اور لندن کے موسم میں اشتراک اور اختلاف کی دونوں ہی صورتیں موجود ہیں۔ اختلاف کی صورت تو انھیں یہ نظر آئی کہ ان دونوں شہروں میں موسموں کی ترتیب ایک جیسی نہ تھی اور اشتراک کا یہ پہلو انھیں نظر آیا کہ ان دونوں جگہوں کے موسم میں غیر متوقع تبدیلی کا ہونا ایک معمول کی بات ہے۔ البتہ اس غیر متوقع تبدیلی میں بھی انھیں اختلاف کی یہ صورت نظر آئی کہ انگلستان کے موسم گرما میں غیر متوقع تبدیلی کے سبب درجہ حرارت جب گرتا ہے تو موسم بہت سرد ہو جاتا ہے جبکہ پاکستان میں کسی غیر متوقع تبدیلی کے سبب موسم جب بھی ایک نئی صورت اختیار کرتا ہے تو پھر بھی ایسی شدید سردی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

آنشا کو انگلستان کے علاوہ دیگر یورپی ممالک کے سفر کا موقع بھی ملا۔ ان ممالک میں جرمنی اور فرانس جیسے ممالک بھی شامل تھے۔ ان ممالک میں قیام کے دوران بھی انھوں نے ان ممالک کے موسم کا بڑی دلچسپی سے مشاہدہ کیا۔ آنشا کی طرح ہم میں سے اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ تمام مغربی ممالک ایسی جغرافیائی حدود میں واقع ہیں جہاں سورج کی شعاعیں آڑھی ترچھی پڑتی ہیں۔ لہٰذا ایسے تمام ممالک جہاں سورج کی شعاعیں آڑھی ترچھی پڑتی ہوں وہاں نہ صرف موسم گرما کے دوران اتنی گرمی نہیں پڑتی بلکہ موسم سرما کے دوران بھی سردی کی شدت کی نوعیت باقی ممالک کے مقابلے میں

زیادہ ہوتی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ 1971ء میں جب مجھے سرکاری فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں جرمنی، فرانس اور انگلستان جانے کا اتفاق ہوا تو ان دنوں پاکستان میں موسم سرما کا دور دورہ تھا۔ مجھے توقع تھی کہ ان ممالک میں بھی یقیناً جاڑے ہی کا موسم ہوگا بلکہ وہاں تو سردی کی شدت پاکستان کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہوگی۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ جو چیز اسے میسر نہ ہو وہ اسی کی خواہش کرتا ہے۔ پاکستان کا شمار چونکہ ایسے ممالک میں کیا جاتا ہے جہاں سال کے بیشتر حصے میں موسم زیادہ تر گرم رہتا ہے۔ یہاں کے موسم کا حال یہ ہے کہ گرمیوں کو تو چھوڑیئے سردیوں کے موسم میں بھی موسم اتنا سرد نہیں ہوتا جتنا مغربی ممالک میں ہوتا ہے۔ انشاؔ بھی بہرصورت ایک انسان تھے اور ایک عام انسان کی طرح عجائبات عالم کو دیکھنے اور محظوظ ہونے کی خواہش رکھتے تھے۔ پاکستان کی آب وہوا چونکہ سارا سال کم وبیش گرم ہی رہتی ہے لہٰذا ان کو بھی اسی قسم کے موسم کی تجربہ تھا لیکن وہ شدید سرد موسم سے لطف واندوز ہونے اور اس کا ذاتی تجربہ کرنے کی دیرینہ خواہش بھی رکھتے تھے۔ البتہ جب وہ وہاں پہنچے تو ان پر یہ حقیقت کھلی کہ ان ممالک کا موسم بھی اس قدر سرد نہ تھا جس کی ان کو توقع تھی بلکہ وہاں بھی دھوپ نکلی ہوئی تھی اور موسم میں گرمی اور حدت کا احساس بھی بڑھا ہوا تھا۔ انشاؔ کو ان ممالک میں ایسا موسم پاکر بہت مایوسی ہوئی۔ البتہ اس دورے سے انھیں اس بات کا اندازہ ضرور ہوا کہ پاکستان، فرانس، جرمنی اور انگلستان کے موسم سرما میں سردی کی شدت تقریباً ایک جیسی ہے حالانکہ ان کی یہ بات حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ بہرحال انشاؔ کو پاکستان، انگلستان، جرمنی اور فرانس کے موسم سرما میں سردی کی شدت کے حوالے سے اشتراک کی صورت نظر آئی۔

کسی ملک کے موسم میں بارش کے کردار اور اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بارش کا شمار ان موسمیاتی عناصر میں ہوتا ہے جو نہ صرف کسی جگہ کی زرخیزی اور شادابی میں اہم کردار ادا کرتی ہے بلکہ اس موسمیاتی عنصر کی کمی یا زیادتی کا براہ راست اثر اس جگہ کے درجہ حرارت پر بھی پڑتا ہے۔ انشاؔ نے یورپی ممالک کے سفر کے دوران جہاں ان ممالک کے موسم میں گرمی، سردی اور دیگر کئی حوالوں سے موسم کا مطالعہ کیا وہیں اس موسمیاتی عنصر کے حوالے سے بھی ان ممالک میں اہم معلومات اکٹھی کیں۔ یہ معلومات کہیں تو ان ممالک میں بارش کی مقدار کے حوالے سے ہیں اور کہیں اس موسمیاتی عنصر کے حوالے سے لوگوں کے اندازِ فکر کے بارے میں ہیں۔ انھیں یورپی ممالک کے سفر کے دوران اس موسمیاتی عنصر کے حوالے سے مختلف خطوں کے لوگوں کے خیالات جاننے کا موقع ملا۔ انھیں یہ جان کر بڑی حیرانی ہوئی کہ اس موسمیاتی عنصر کے حوالے سے پاکستانی اور انگریز قوم میں اختلاف رائے کی سی صورتحال موجود ہے۔ اس اختلاف رائے کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ انگریز قوم بارش کی آمد پر نہ تو خوش ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی خوشی کا اظہار کرتے ہیں بلکہ وہ اسے اپنے لئے زحمت اور وبال جان سمجھتے ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں کے لوگ بارش کو نہ صرف پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ اسے اپنے لئے رحمت خداوندی بھی سمجھتے ہیں۔ اس کی آمد پر بے حد خوشی منائی جاتی ہے اور اس خوشی کا اظہار کئی طریقوں سے کیا جاتا ہے، کہیں خوبصورت نغمے اور گیت گا کر اور کہیں انواع واقسام کے پکوان تل کر اس خوشی کے لطف کو دوبالا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ کئی جگہوں پر تو اس کی آمد کی خوشی میں موسیقی کی رنگارنگ تقاریب بھی منعقد کی جاتی ہیں۔ بارش کے متعلق پاکستانی لوگوں کی سوچ کیا ہے اس سے تو انشا بخوبی واقف تھے البتہ ان مغربی ممالک کے سفر سے ان پر یہ حقیقت کھلی کہ انگریز قوم بارش کو قطعاً پسند نہیں کرتی۔ یوں ان مغربی ممالک کے سفر سے انھیں اس حقیقت سے شنوائی ہوئی کہ بارش کے حوالے سے پاکستانی اور انگریز قوم کے انداز فکر میں اختلاف کا پہلو موجود ہے۔

بارش کئی لوگوں کے لئے تو باران رحمت ہے اور کئی لوگوں کے لئے سوائے زحمت کے سوا اور کچھ نہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بارش زمین کو سرسبزی و شادابی اور زرخیزی بخشتی ہے۔ جن علاقوں میں بارش زیادہ ہوتی ہے وہ سرسبز و شاداب نظر آتے ہیں وہاں لہلہاتا سبزہ خودرو پودے اور نباتات اس جگہ کی خوبصورتی اور شادابی میں اضافہ کرتے ہیں۔ انشا نے یورپ کے سفر کے دوران جہاں قدرتی مناظر کو اپنی توجہ کا بنایا وہیں ان مناظر میں سرسبزی و شادابی کا بغور جائزہ بھی لیا۔ وہ جس جگہ بھی جاتے وہاں کے حسین مناظر میں ان کی نگاہ آنکھوں کو تراوٹ بخشنے والے سبزے کی متلاشی رہتی۔ ان کی سرکاری مصروفیات نے یورپ کے ایک خوبصورت ملک سوئٹزرلینڈ جانے کا موقع بھی فراہم کیا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انھوں نے سوئٹزرلینڈ کے ایک خوبصورت شہر لوزان کا انتخاب کیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب میں لوزان گیا تو وہاں گردونواح میں پھیلی ہوئی خوبصورتی اور شادابی دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس ساری خوبصورتی اور رعنائی کی وجہ صرف وہاں پر برسنے والی بارش تھی۔ انھیں یہ خوبصورتی اور شادابی دیکھ کر اپنے ملک کا صحرا اور کئی عرب ممالک کے صحرا یاد آئے جہاں بارش برائے نام ہوتی ہے اور سبزہ اور ہریالی نام کو نہیں ملتی۔ ان علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو پانی کی قلت جیسے مسئلے کا اکثر سامنا کرنا پڑتا تھا بلکہ بعض اوقات تو وہ بوند بوند پانی کو ترستے ہیں۔ پانی کی قلت اور عدم دستیابی کے بوجہ ان لوگوں کے لئے زندگی گزارنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے بلکہ بعض اوقات تو ان کی زندگی کا پورا نظام ہی درہم برہم ہو جاتا تھا۔ انشا اپنے آپ کو خیالات کی اس دنیا سے واپس لاتے ہیں اور دوبارہ لوزان کی سرسبزی و شادابی اور حسین کو اپنی آنکھوں میں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں وہ سوچتے ہیں کہ اگر بارش کی کثرت نے لوزان شہر کے طول و عرض میں ہریالی اور شادابی کی افزائش میں اس قدر اہم کردار ادا کیا ہے تو پھر پانی کی عام دستیابی کے سبب اس شہر کے لوگوں کی زندگی پاکستان اور عرب کے صحرا میں بسنے والے لوگوں کی زندگی سے یقیناً بہتر ہوگی۔ وہ بتاتے ہیں کہ بارش وہ موسمیاتی عنصر ہے جس کا اثر صرف اس جگہ کے درجہ حرارت پر ہی نہیں پڑتا بلکہ یہ عنصر اس جگہ کی زرخیزی اور شادابی اور وہاں پر موجود جنگلی حیات کی صحت و تندرستی میں بھی ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جن علاقوں میں بارش وافر مقدر میں ہوتی ہے وہاں سبزہ، گھاس اور نباتات کثرت سے اگتے ہیں یوں ان علاقوں میں موجود حیوانات کو اپنی خوراک وافر مقدار میں ملتی ہے۔ جس کے باعث وہ فربہ اور تنومند نظر آتے ہیں۔ اسی طرح جن علاقوں میں بارش کم ہوتی ہے وہاں پر موجود جانوروں کو وافر مقدار میں خوراک میسر نہیں آتی جس کے سبب وہ کمزور اور ناتواں دکھائی دیتے ہیں۔ شہر لوزان میں چونکہ گھاس اور دیگر نباتات کی بہتات تھی اس لئے انشا کو وہاں

تمام جانور بہت صحت منداور فربہ نظر آئے۔ ہمارے ہاں بارش چونکہ بہت کم ہوتی ہے اسی لئے یہاں گھاس اور دیگر نباتات اتنے زیادہ نہیں اگتے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن پر کسی جگہ کے جانوروں کی خوراک کا انحصار ہوتا ہے اس لئے ہمارے ہاں کے جانور اور مویشی خوراک کی قلت کا شکار نظر آتے ہیں۔ بہر حال انشا کو پاکستان اور سوئٹزر لینڈ کے موسم کے تقابل میں نہ صرف بارش کی مقدار کے حوالے سے اختلاف کی صورت نظر آئی ہے بلکہ یہ اختلاف بھی نظر آیا کہ اس موسمیاتی عنصر نے ان دونوں ممالک کے لوگوں کی زندگیوں، پودوں اور نباتات اور جانوروں کی صحت پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ البتہ اختلاف کی ان تمام صورتوں میں انھیں سوئٹزر لینڈ پاکستان سے کہیں بہتر نظر آیا۔

المختصر، انشا کو پاکستان اور یورپی ممالک کے موسم اور آب و ہوا کے تقابل میں جہاں اشتراک کی کئی صورتیں نظر آئیں وہیں اختلاف کے کئی پہلو بھی نظر آئے۔

وقت

انسانی زندگی میں وقت کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ وقت کی قدر و قیمت یوں تو ہر زمانے میں یقیناً رہی ہوگی لیکن آج کل کے مشینی دور میں اس کی اہمیت پہلے سے بھی کئی گنا بڑھ چکی ہے۔ ہماری زندگی کے عام معمولات سے لے کر دنیا میں آنے والی بڑی بڑی تبدیلیاں بھی وقت کے تابع ہیں بلکہ دیکھا جائے تو اس روئے زمین کا پورا نظام ہی وقت کے مرہون منت ہے۔ وقت گو کہ ایک غیر مادی شے ہے لیکن پھر بھی ہم اسے لمحوں، گھنٹوں، دنوں، مہینوں اور سالوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اس خطۂ ارض پر وقت کے صحیح تعین کا اندازہ سورج کے نکلنے اور غروب ہونے سے کیا جاتا ہے۔ جو ملک خط استوا سے جس قدر قریب ہوگا وہاں دن کا آغاز جلد ہوگا اور جو مقام اس سے جس قدر دور ہوگا وہاں دن کا آغاز اتنی ہی دیر سے ہوگا۔ یوں کسی جگہ کے وقت کا انحصار صرف اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ جگہ خط استوا سے کتنے فاصلے پر واقع ہے۔ ہماری زمین بہت سے خطوں پر مشتمل ہے جو نہ صرف جغرافیائی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ ان خطوں کے وقت میں بھی اختلاف کا پہلو موجود ہے۔ انشا کو ان کی سرکاری مصروفیات نے دنیا کے مختلف ممالک کے سفر کا موقع فراہم کیا۔ یہ ممالک دنیا کے کسی ایک خطے میں نہیں تھے بلکہ مختلف خطوں میں واقع تھے اس لئے ان کے سفر کے دوران جہاں انھوں نے ان ممالک کی تاریخ، جغرافیہ، آب و ہوا، زبان، تہذیب و تمدن، معاشرت فنون لطیفہ، سماجی و اخلاقی اقدار اور مذہب کے بارے میں جاننے کی کوشش کی وہیں ان ممالک کے وقت میں بھی خاص دلچسپی لی۔ انھوں نے ان ممالک کے وقت کا تقابل پاکستان کے وقت سے بھی کیا اور ان کے درمیان موجود اشتراک اور اختلاف کے پہلوؤں کو واضح کیا۔ انشا جب یورپ کے سفر پر گئے تو وہاں قیام کے دوران انھوں نے پاکستان اور یورپی ممالک کے وقت کے مابین موجود اختلاف کو اپنی خاص

دلچسپی کا موضوع بنایا۔ انھوں نے اپنے سفرناموں میں ان دونوں خطوں، یعنی مشرق اور مغرب میں وقت کے حوالے سے موجود اختلافات کو بیان کر دیا تا کہ قارئین ان دونوں خطوں کے وقت کے بارے میں آ گاہی حاصل کر سکیں۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو بیان کیا جاتا ہے۔

انشا کو امریکہ کے سفر کا موقع بھی ملا، اس ملک کا سفر بھی ان کی سرکاری مصروفیات کے سلسلے میں ہی ترتیب پایا۔ وہاں قیام کے دوران جہاں انھوں نے دیگر اشیاء و مظاہر میں دلچسپی لی وہیں وہاں کے وقت میں بھی دلچسپی لی۔ جب تک وہ امریکہ نہیں گئے تھے اس وقت تک انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ پاکستان اور امریکہ کے وقت میں کتنا فرق ہے لیکن امریکہ جانے کے بعد ان پر یہ حقیقت کھلی کہ ان دونوں ممالک کے وقت میں خاصا فرق موجود ہے۔ وقت کے اس اختلاف نے انشا کے مزاج اور ان کی روزمرہ زندگی کے معمولات کو بھی یقیناً متاثر کیا۔ انھوں نے ان مسائل و مشکلات کا ذکر کہیں مزاحیہ اور کہیں بڑے طنزیہ انداز میں کیا جو وقت کے اختلاف کے باعث انھیں پیش آئے۔ سفرنامہ دنیا گول ہے کے زیر مطالعہ حوالے میں انھوں نے وقت کے اختلاف کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل اور کیفیات کو بڑے طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں یوں بیان کیا ہے:

> ''اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے ہیں اور سارا عالم سوتا ہے۔ چاند جانے کس تاریخ کا ہے۔ اداسی سی بکھیرتا ہوا چمک رہا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن والوں نے بھی خدا حافظ کہہ کر پروگرام تہہ کر دیئے ہیں۔ اچھا تو اب ہم اخبار پڑھیں گے۔ ابھی ہم سان فرانسسکو کرانیکل کا آخری ایڈیشن لے کر آئے ہیں۔ پس اے صاحبان گڈ نائٹ۔ لیکن ارے ارے کہاں کی رات کہاں کا چاند، اور کہاں کی گڈ نائٹ۔ آپ کے ہاں تو ابھی دن کے دس گیارہ بجے ہوں گے۔ یعنی وہ وقت جب مردم بہ کاروبار روند اور بلاکشانِ محبت بہ کوئے یار روند۔ ہم اس وقت دنیا کے الٹی طرف ہیں۔ ہم اُلٹے۔ بات اُلٹی یار اُلٹا۔ اب سمجھ میں آیا کہ ہماری اور امریکہ والوں کی سوچ میں اتنا فرق کیوں ہے؟ کیوں ان کو ہر معاملے میں الٹی سوجھتی ہے۔ دن کو رات اور رات کو دن کہتے ہیں۔ وہ کرۂ ارض کے دوسری طرف جو واقع ہوئے۔ اور ان لوگوں کی کھوپڑی جو الٹی ہوئی۔''[۴]

درجہ بالا حوالے میں انشا نے نہ صرف اس بات کی وضاحت کی کہ پاکستان اور امریکہ کے وقت میں نمایاں فرق ہے بلکہ اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی کیا کہ اس اختلاف کے سبب پاکستان اور امریکہ میں بسنے والے لوگوں کے اندازِ فکر اور طبائع میں بھی نمایاں فرق موجود ہے۔ قاری ان سفرناموں کو پڑھ کر کبھی تو پاکستان اور امریکہ کے درمیان موجود وقت کے اختلاف پر حیران ہوتا ہے اور کبھی وہ اس اختلاف کے سبب لوگوں کے اندازِ فکر اور طبائع میں ہونے والی تبدیلیوں اور اثرات کو بڑی دلچسپی اور انہماک سے پڑھتا ہے۔ انھوں نے اس حوالے میں بھی پاکستان اور امریکہ کے درمیان موجود وقت کے اختلاف اور اثرات کو بڑے ہلکے پھلکے اور مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے البتہ ان دونوں اقوام کی سوچ اور طرزِ فکر کو کسی قدر

طنزیہ رنگ میں بیان کیا ہے۔انھوں نے ان دنوں اقوام کے طرز فکر پر جو چوٹ کی ہے وہ بالکل بجا ہے، واقعی ان دونوں اقوام کے طرز فکر میں تضاد کی سی کیفیت نمایاں ہے۔

انشا کو پاکستان اور انگلستان کے وقت میں بھی خاصا اختلاف نظر آتا ہے جس کو وہ یوں واضح کرتے ہیں کہ جب پاکستان میں صبح سویرے کا وقت ہو تو جانیے اس وقت لندن میں آدھی رات کا وقت ہوگا۔

بہر حال انشا کو پاکستان، انگلستان اور امریکہ کے وقت میں صرف اختلاف کا پہلو ہی نظر آیا۔

جغرافیائی عناصر

ہماری زمین بہت سے جغرافیائی عناصر پر مشتمل ہے۔جن میں بلند و بالا چوٹیاں، پہاڑ، میدان، سمندر، دریا اور ندی نالے شامل ہیں۔دنیا کے تقریباً سبھی ممالک میں موجود جغرافیائی عناصر کسی نہ کسی حوالے سے ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہیں، یوں کسی ملک کے جغرافیائی عناصر بھی کبھی کبھار اس کی شناخت کا حوالہ بن جاتے ہیں۔انشا نے یورپ اور امریکہ کے سفر کے دوران جہاں دیگر زاویوں کو پیش نظر رکھا وہیں ان ممالک کے جغرافیائی عناصر کے حوالے سے بھی معلومات حاصل کیں اور ان کا تقابل پاکستان کے جغرافیائی عناصر کی متعلقہ معلومات سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کی۔انھوں نے پاکستان، یورپ اور امریکہ کے جغرافیائی عناصر میں جن اشتراکات اور اختلافات کا مشاہدہ کیا انھیں ذیل میں بیان کیا جارہا ہے۔

دنیا کے بیشتر ممالک میں دریا موجود ہیں۔کبھی کبھی کوئی دریا بھی اپنے ملک کی شناخت کا حوالہ بن جاتا ہے۔ دریائے ٹیمز بھی ایک ایسا دریا ہے جو انگلستان کی شناخت کا حوالہ ہے۔انشا کو ان کی دفتری مصروفیات نے کئی بار انگلستان کے سفر کا موقع فراہم کیا۔انھوں نے اس دریا کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا اور بتایا کہ مجھے تو اس دریا میں کوئی ایسی خاص بات نظر نہیں آتی بلکہ دریائے ٹیمز کو دیکھ کر یہ افسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ دریا ہے جس کی شان میں انگریز شاعروں نے زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔انھوں نے بالکل بجا کہا ہے، انگریزی شاعری میں واقعی اس دریا کی تعریف و تحسین میں بے حد مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ایک مشہور انگریز شاعر Robert Herrick نے اپنی ایک نظم His Tears to Thamasis میں اس اس دریا کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ملاحظہ کیجئے۔

"I SEND, I send here my supremest kiss
To thee, my silver-footed Thamasis.
No more shall I reiterate thy strand,
Whereon so many stately structures stand:

Nor in the summer's sweeter evenings go,
To bath in thee, as thousand others doe:
No more shall I a long thy christall glide,
In barge with boughes and rushes beautifi'd,
With soft-smooth virgins for our chast disport,
To richmond, kingstone, and to Hampton-court:
Never againe shall I with finnie ore
Put from or draw unto th faithfull shore,
And landing here, or safely landing there,
Make way to my beloved westminister,
or to the golden cheap-side, where the earth
of julia Herrick gave to me my birth,
May all clean nimphs and curious water dames
With swan-like state flote up and down thy streams:
No drought upon thy wanton waters fall
To make them leane, and languishing at all:
No ruffling winds come hither to discease
Thy pure and silver-wristed naides.
Keep up your state, ye streams; and as ye spring,
Never make sick your banks by surfeiting.
Grow young with tydes, and though I see ye never,
Receive this vow, so fare ye well for ever." (3)

درجہ بالا نظم میں انگریز شاعر نے دریائے ٹیمز کی جس طرح ثنا خوانی کی ہے اس سے تو دریائے ٹیمز کا ایک بڑا ہی خوبصورت اور مسحور کن نقشہ ذہن میں آتا ہے۔البتہ انشا نے دریائے ٹیمز کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد اس دریا کی اصل حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔وہ دریائے ٹیمز کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اسے لیاری کے ایک نالے کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں اور اس نالے سے اس کا تقابل کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ ان دونوں میں گندگی اور غلاظت کی صورتحال تقریباً ایک

جیسی تھی۔ وہ مزاحیہ لب و لہجے میں کہتے ہیں کہ ویسے تو اس دریا میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے کہ اس کی تعریف کی جائے لیکن پھر بھی شاید انسان کی فطرت ہوتی ہے کہ اسے اپنی ہر چیز اچھی لگتی ہے چاہے وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ دریائے ٹیمز کی تعریف و تحسین کے در پردہ شاید انگریزوں کا یہی فطری جذبہ کارفرما ہو۔ اس لئے انھیں دریائے ٹیمز میں خوبصورتی اور رعنائی کے تمام پہلو نظر آتے ہوں حالانکہ اس دریا میں گندگی اور غلاظت کی صورتحال تو لیاری کے ایک عام نالے کی سی ہے۔ انشا بتاتے ہیں کہ جب تک میں نے دریائے ٹیمز کو خود نہیں دیکھا تھا تو اس وقت تک میں بھی انگریز شاعروں کی شاعری پڑھ کر دریائے ٹیمز کی خوبصورتی اور رعنائی سے مرعوب رہتا تھا لیکن اب اسے دیکھنے کے بعد میرا ذہن اس کے بارے میں کوئی بھی خوشگوار تاثر قائم نہیں کر سکتا۔

بہرحال انشا کو لیاری (کراچی) میں بہنے والے ایک عام نالے اور انگلستان کے مشہور دریائے ٹیمز میں گندگی اور غلاظت کی ایک سی صورتحال کے باعث اشتراک کا پہلو نظر آیا۔

باشندے

دنیا میں مختلف رنگ و نسل کے لوگ آباد ہیں جو کئی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ انشا کو یورپ اور امریکہ کے سفر کے دوران مختلف اقوام کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا جس سے انھیں ان لوگوں کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔ انھوں نے ان معلومات کا تقابل پاکستانی لوگوں کی متعلقہ معلومات سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراک اور اختلاف کی صورتوں کو واضح کیا۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو مختلف عنوانات کے تحت بیان کیا جارہا ہے۔

حسن و خوبصورتی:

حسن اور خوبصورتی بالعموم ہر انسان کو متاثر کرتی ہے۔ انشا کے نزدیک حسن کا تعلق صرف سرخ و سفید رنگت سے ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں تناسب اعضاء اور نفاست کو بھی دخل ہوتا ہے۔ دنیا کے ہر خطے اور ملک کے رہنے والوں کے رنگ، نین نقوش، قد و قامت اور جسامت میں کسی نہ کسی اعتبار سے فرق ضرور ہوتا ہے۔ انشا کو ان کے سرکاری فرائض نے دنیا کے طول و عرض میں سفر کرنے کے مواقع فراہم کیے جس سے انھیں یہ اندازہ ہوا کہ دنیا میں مختلف رنگ و نسل کے لوگ آباد ہیں۔ جن میں انگریز ایسی قوم ہے جن کے رنگ سرخ و سفید ہوتے ہیں اور افریقہ اور مشرق کے لوگوں کے رنگ کالے، گندمی یا سانولے سلونے ہوتے ہیں۔ انشا بتاتے ہیں کہ جب تک افریقہ کے حبشی منظر عام پر نہیں آئے تھے تو اس وقت تک انگریز ہمیں ہی کالا کہا کرتے تھے لیکن اب ان کے آجانے سے ہم نہ تین میں ہیں نہ تیرہ ہیں۔ وہ اہل مشرق کے ساتھ ہونے والی

زیادتی پر سراپا احتجاج ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ہم لوگوں کا رنگ انگریزوں جیسا سفید ہو جائے تب بھی ہمارا شمار انگریزوں میں نہیں ہوتا اور اگر حبشیوں جیسا کالا ہو جائے تو پھر بھی ہمیں کالا قرار نہیں دیا جاتا۔ اس کے بعد وہ حسن وخوبصورتی کے حوالے سے پاکستان اور دنیا کے دیگر ممالک کے باشندوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان اور ہوائی کے لوگوں کی رنگت بالکل ایک جیسی ہے یعنی سانولی اور سلونی۔ یورپ کے لوگ زیادہ تر سرخ وسفید رنگت کے مالک ہوتے ہیں لیکن انشا کے نزدیک سرخ وسفید رنگ میں وہ خوبصورتی اور جاذبیت نہیں جو سانولے سالونے رنگ میں ہوتی ہے۔ بلکہ وہ اہلِ مشرق کے حسن ورعنائی کی اصل وجہ صرف سانولے سالونے رنگ ہی کو قرار نہیں دیتے صرف یہی نہیں بلکہ ان کے نزدیک شرم وحیا ہی حقیقت میں وہ رنگ ہے جو اہل مشرق کے چہروں کو حسن وخوبصورتی اور چمک دمک عطا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے تو مشرق کے لوگ ہی سب سے زیادہ حسین وجمیل نظر آئے حالانکہ پیرس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں کے لوگ سب سے زیادہ حسین وجمیل ہوتے ہیں لیکن مجھے تو ان لوگوں میں خاص بات نظر نہ آئی۔ اس سلسلے میں وہ سفرنامہ دنیا گول ہے کے درج ذیل حوالے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''سب باتوں کو ملا کر دیکھئے تو ہمارے ہاں قابلِ دید صورتوں اور سراپاؤں کی فی صد تعداد یورپ کی صورتوں کے مقابلے میں پانچ گنا ہوگی۔ انگلستان کو تو خیر ہم کسی شمار میں نہیں رکھتے۔ دم تحریر پیرس کی بات کر رہے ہیں، یورپ اور سکنڈے نیویا کے آٹھ دس ملک اور بھی ہم نے دیکھے ہوں گے۔ یورپ ہی میں موازنہ ٹھہرے تو سویڈن بھی اس معاملہ میں فرانس پر فائق۔ سپین بیشک بہتر اور اٹلی اس سے بھی اچھا۔ مشرق کی طرف آتے جائیے۔ مشرق وسطیٰ میں حُسن وملاحت خاصی اگرچہ مصر میں آمیختہ بہ فربہی۔ مشرق بعید میں سانولے پن کے ساتھ نقوش کا تیکھا پن بھی بڑھتا جاتا ہے، لنکا اور ہندوستان کے کیا کہنے۔ ملایا میں ناک اتنی تیکھی نہیں رہتی لیکن ملاحت اور نازکی بہت۔ یہی بات انڈونیشیا کی جانئے۔ فلپائن میں غنیمت۔ جاپان میں حُسن کا تناسب پچیس تیس فیصد، کوریا میں صورت حال کہیں زیادہ بہتر اور تسلی بخش، جزائر ہوائی میں جہاں جنگل اور شہر مل گئے ہیں، وہاں گندمی چہرے اور کالے بال لبھاتے ہیں۔ اس سے آگے سمندر آجاتا ہے۔ امریکہ کے خوش چہرگان جانے کیوں یورپ سے بہرحال اچھے۔ شاید آب وہوا کا دخل ہو۔ لیکن پھر بھی ہائے دلی ہائے لاہور۔ اپنے وطن اور اپنے برعظیم کی کیا بات ہے۔''[۲۴]

یوں درجہ بالا حوالے میں انشا نے یہ بتایا ہے کہ حسن وخوبصورتی کے اعتبار سے اہلِ مشرق کو باقی تمام خطوں کے لوگوں پر برتری حاصل ہے۔

عادت واطوار

ہر انسان ایک انفرادی شخصیت کا مالک ہے اس کی عادات واطوار دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ انشا نے

دوران سیاحت مختلف اقوام کے لوگوں کی عادات واطوار کا تقابل کیا اور نتیجے میں آنے والے اشتراکات اور اختلافات کو اپنے سفرناموں میں بیان کردیا۔ذیل میں ان اشتراکات واختلافات کی تفصیل ملاحظہ کیجیے:

صبح سویرے اٹھنا:

صبح سویرے اٹھنا اچھی عادت ہے۔انشا جب اس عادت کے حوالے سے پاکستان اور ہالینڈ کے لوگوں کا تقابل کرتے ہیں تو اس تقابل میں انھیں اختلاف کا پہلو ہی نظر آتا ہے۔وہ بتاتے ہیں ہالینڈ قیام کے دوران جس ہوٹل میں وہ مقیم تھے اس کی مالک ایک معمر خاتون تھیں۔ان خاتون نے انشا سے ان کے ناشتے کے اوقات جاننے کے لیے ان سے پوچھا کہ آپ کتنے بجے اٹھتے ہیں، انشا نے انھیں بتایا کہ میں تو ذرا دیر سے اٹھتا ہوں تو وہ فرمانے لگیں کہ میں تو صبح سویرے اٹھتی ہوں۔انشا نے بتایا کہ میں تقریباً آٹھ بجے اٹھ جاتا ہوں تو وہ کہنے لگیں کہ میں ذرا دیر سے تقریباً نو بجے اٹھ جاتی ہوں۔یوں ناشتے کے اوقات جاننے کے دوران انشا کو یہ معلوم ہوا کہ ہالینڈ کے باشندوں کے مقابلے میں پاکستانی لوگ جلد صبح اٹھنے کے عادی ہیں۔یوں صبح اٹھنے کی عادت کے حوالے سے ان دونوں ملکوں کے لوگوں میں اختلاف کی صورت موجود ہے۔

بیٹھنے کا انداز:

ہر معاشرے میں نشست و برخاست کے اپنے ہی طور طریقے ہوتے ہیں۔انشا جب پاکستان اور انگلستان کے لوگوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ پتا چلتا ہے کہ ان دونوں ممالک کے لوگوں کے بیٹھنے کا انداز ایک دوسرے سے مختلف ہے۔وہ بتاتے ہیں کہ ہم لوگ تو آلتی پالتی مار کر بیٹھ سکتے ہیں لیکن انگریز اس طرح نہیں بیٹھ سکتے۔دراصل یوں ہوا کہ لندن قیام کے دوران انشا کا پڑوسی فرینک انھیں آلتی پالتی مار کر بیٹھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔وہ یہ سمجھا کہ شاید انشا یوگا کی مشق کر رہے ہوں لیکن انشا نے اسے بتایا کہ ہمیں تو یوں بیٹھنے کی عادت ہے۔فرینک نے بھی اس طرح بیٹھنے کی بہت کوشش کی لیکن بالآخر اس نے ایسا کرنے سے توبہ کر لی۔

لباس اور ظاہری حلیہ:

انشا نے یورپ اور امریکہ کے سفر کے دوران جہاں دیگر زاویوں کو اہمیت دی وہیں ان ممالک کے لوگوں کے لباس کا مشاہدہ بھی کیا۔جب وہ پاکستان اور انگلستان کے لوگوں کے لباس کا مشاہدہ کرتے ہیں تو انھیں پتا چلتا ہے کہ ان دونوں ممالک میں کچھ لوگ عجیب وغریب وضع قطع اختیار کرتے ہیں۔وہ بتاتے ہیں کہ لندن میں ایسے لوگوں کو ہپی کہا جاتا ہے، ایسے لوگ یوں تو پورے انگلستان میں ہی نظر آتے ہیں لیکن لندن انھیں کچھ زیادہ ہی پسند ہے۔ان کے ظاہری حلیے کے بارے میں وہ بتاتے ہیں کہ ان کے بال لمبے لمبے اور بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اور جسم گندہ۔یورپ میں داڑھی رکھنے کو آوارگی کی علامت سمجھا جاتا ہے لیکن ہپی داڑھیاں بھی رکھتے ہیں۔لوگ ان کے عجیب وغریب حلیے کو دیکھ کر مزے لیتے

ہیں۔انشا بتاتے ہیں کہ پاکستان میں بھی ایسے حلیے والے لوگ صدیوں سے موجود ہیں لیکن یہاں کے لوگوں کی رائے ان لوگوں کے بارے میں ایسی نہیں ہے جیسی یورپ والوں کی ہے۔ ہمارے ہاں ایسے لوگ عجیب وغریب کرتب اور کرامات دکھا کر سادہ لوح لوگوں کو بیوقوف بناتے ہیں۔ جو لوگ اولاد سے محروم ہوں انھیں یہ لوگ اولاد کی نعمت بخشتے ہیں اور اگر کوئی مقدمے میں پھنسا ہو تو یہ لوگ صرف اپنی پھونکوں سے اسے مقدمے سے بری کروا سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یوں انشا کو پاکستان اور انگلستان کے لوگوں میں یہ اشتراک نظر آیا کہ ان میں عجیب وغریب حلیے والے لوگ موجود ہیں البتہ دونوں ملکوں کے لوگوں کا اندازِ فکر ایسے لوگوں کے بارے میں انھیں مختلف نظر آیا۔

خوبیاں اور خامیاں:

انشا کو دنیا کے مختلف ممالک میں قیام کے دوران وہاں کے باشندوں کے قریب آنے اور ان سے گھلنے ملنے کا موقع بھی ملا جس سے انھوں نے ان ممالک کے باشندوں کے بارے میں ایک مجموعی رائے قائم کر لی۔ جرمنی قیام کے دوران انھیں اس بات کا اندازہ ہوا کہ جرمن لوگ حقیقت شناس ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کسی شخص کی صلاحیتوں کو پہچان کر اس کا نام رکھتے ہیں جبکہ پاکستانی لوگ اس صلاحیت سے بالکل محروم ہیں۔ ہمارے لوگ کسی ایسے شخص کا نام بھی نین سکھ رکھ دیں گے جو بالکل اندھا ہو جبکہ جرمن لوگ کسی شخص کو دیکھ کر اس کا نام رکھتے ہیں۔اس بات کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب ۱۹۷۱ء میں وہ جرمنی گئے، انشا بتاتے ہیں کہ اس بار جو خاتون بطور ترجمان میرے ساتھ تھیں ان کا نام Escort تھا۔ جب انھوں نے اس خاتون سے اس نام کا مطلب پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ میرے نام کا مطلب ہے "ریچھ کا بچہ"۔ دوران سیاحت انشا نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ یہ خاتون اپنی من پسند اشیاء دل کھول کر کھاتی تھیں اور ساتھ ہی ایپل جوس اور وائن بھی بے تحاشا پیتی تھیں۔ شاید اس کی کچھ وجہ یہ بھی تھی کہ دوران سیاحت ان کے کھانے پینے پر آنے والے تمام اخراجات انشا کے حساب میں لکھے جاتے تھے اس لئے وہ خوب مزے اڑاتی تھیں۔ بہرحال انشا نے یہ ضرور سوچا کہ اس خاتون کا نام اس کی شخصیت سے مکمل طور پر مطابقت رکھتا ہے۔

انشا جب پاکستان اور ڈنمارک کے لوگوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں دونوں ممالک کے لوگوں میں یہ خامی نظر آتی ہے کہ یہ لوگ دور دراز کے ممالک کی سیاحت کو تو جاتے ہیں لیکن اپنے ملک کے مشہور اور قابل دید مقامات کی سیر نہیں کرتے۔اس بات کا اندازہ انھیں اس طرح ہوا کہ وہ ایک ایسے معمر شخص سے ملے جن کا تعلق ڈنمارک سے تھا۔ اس نے انشا کو بتایا کہ میں پاکستان سمیت دنیا کے کئی ممالک کی سیر کر چکا ہوں لیکن ڈنمارک میں رہتے ہوئے السی نور کا قلعہ نہیں دیکھ سکا۔ انشا نے انھیں حوصلہ دیا اور بتایا کہ وہ بھی عمر کا ایک حصہ کراچی میں گزارنے کے باوجود منگھو پیر نہیں جا سکے۔

انشا نے پاکستان اور انگلستان کے لوگوں کا تقابل بھی کیا۔ اس تقابل سے انھیں یہ معلوم ہوا کہ پاکستان اور

انگلستان کے امراء میں یہ خامی ہے کہ یہ لوگ کسی غریب سے رشتہ داری نہیں کرتے بلکہ صرف طبقۂ امراء ہی سے رشتے ناطے جوڑتے ہیں۔ اس کی مثال وہ اس بات سے دیتے ہیں کہ برطانیہ میں شاہی خاندان اپنے بچوں کی شادیاں شاہی خاندان میں ہی کرتے ہیں اور پاکستان کے صنعت کار اپنے بچوں کی شادیاں اپنے ہم پلہ لوگوں سے ہی کرتے ہیں۔

جرمنی قیام کے دوران انؔشا کو یہ بات معلوم ہوئی کہ جرمن لوگ بہت سادہ طبیعت ہوتے ہیں۔ جرمنی میں مقیم ایک پاکستانی سفارتکار عبدالرحمٰن نے انھیں بتایا کہ جرمن لوگ بھی ہمارے ملک کے پٹھانوں کی طرح ہوتے ہیں ان میں تکلفات پسندی اور دوغلا پن نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بات انھیں اچھی لگے تو اس کی تعریف بھی کھل کر کرتے ہیں اور جو بات بری لگے اس پر بھی اپنے ردعمل کا اظہار بھی برملا کر دیتے ہیں۔ یوں انؔشا کو اپنے ملک کے پٹھانوں اور جرمن باشندوں میں یہ اشتراک نظر آیا کہ دونوں ہی بہت سادہ طبیعت ہوتے ہیں اور ان کی طبیعت میں دوغلا پن اور منافقت نہیں ہوتی۔

بہر حال انؔشا کو پاکستان اور مغربی ممالک کے باشندوں میں خوبیوں اور خامیوں کے حوالے سے اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

اخلاقی اقدار اور جرائم

جو معاشرہ جس قدر تعلیم یافتہ اور مہذب ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کے بارے میں یہ خیال جاتا ہے کہ وہ اخلاقی اعتبار سے بھی بہتر ہوگا۔ انؔشا کو دنیا کے مختلف ممالک اور خطوں کے سفر کا موقع ملا۔ ان ممالک میں مختلف رنگ و نسل کے لوگ آباد تھے۔ یہ لوگ نہ صرف ظاہری اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھے بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ انؔشا کو دنیا کے باقی خطوں کی طرح یورپ اور امریکہ میں بھی سرکاری فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں جانا پڑا۔ وہاں قیام کے دوران انھیں وہاں کے لوگوں سے ملنے اور ان کے بارے میں جاننے کا موقع ملا۔ انھوں نے ان ممالک کے لوگوں کا تقابل جہاں اور کئی اعتبار سے پاکستانی لوگوں سے کیا ہے وہیں اخلاقی اعتبار سے بھی ان کا تقابل پاکستانی لوگوں سے کیا اور ان کے درمیان پائے جانے والے اشتراکات اور اختلافات کو اپنے سفرناموں میں بیان کر دیا۔ انھوں نے اخلاقی اقدار کے حوالے سے پاکستان اور یورپ و امریکہ میں جو اشتراکات اور اختلافات محسوس کیے انھیں ذیل میں بیان کیا جا رہا ہے۔

ایثار:

ہر معاشرے کا اپنا ضابطۂ اخلاق ہوتا ہے جو ہو سکتا ہے کسی دوسرے معاشرے کے ضابطۂ اخلاق سے مختلف ہو۔ انؔشا نے سیر و سیاحت کے دوران جن ممالک کا سفر کیا وہاں کی سماجی و معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی اپنے مطالعے اور مشاہدے کا موضوع بنایا۔ ہمارے معاشرے میں ایثار و قربانی کو ایک عظیم اخلاقی قدر تصور کیا جاتا ہے۔ انؔشا نے یورپ

کے دیگر معاشروں میں اس اخلاقی قدر کے حوالے سے موجود صورتحال کا تقابل پاکستان میں اس اخلاقی قدر کے حوالے سے موجود صورتحال سے کیا اور ان کے درمیان موجود اختلافات اور مماثلتوں کو سامنے لانے کی کوشش کی۔ اس سماجی قدر کے حوالے سے جب انھوں نے پاکستان اور یورپی اقوام کے طرزِ عمل کا مشاہدہ کیا تو انھیں ان دونوں خطوں کے لوگوں کے طرزِ عمل میں خاصا اختلاف نظر آیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ہاں تو لوگ دوسروں کو پہل کرنے کی دعوت دی جاتی ہے لیکن یورپی اقوام کو اس قسم کے ایثار و قربانی کی عادت نہیں ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ہاں اکثر سفر ہوتے ہوئے اور نشست و برخاست کے وقت دوسروں کو پہل کرنے کا موقع دیا جاتا ہے لیکن ان کے ہاں ایثار و قربانی اور دوسروں کو پہل کرنے کی دعوت دینے کا رجحان ناپید نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں یہی توقع کرتا رہا کہ شاید یہاں بھی ہمارے ملک کی طرح دوسروں کو پہل کرنے کا موقع دیا جائے گا لیکن میرے یہ سارے اندازے اس وقت غلط ثابت ہوئے جب کسی نے مجھے پہل کرنے کا موقع نہ دیا۔

ایثار و قربانی کا جذبہ اگر معاشرے کے افراد کے درمیان فروغ پائے تو اس سے ان کے تعلقات بہتر ہو جاتے ہیں لیکن کچھ لوگ اپنے ملک اور قوم کے لئے بھی ایثار کرتے ہیں۔ زندگی میں یوں تو روپے پیسے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن پھر بھی روپیہ پیسہ بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ نہیں ہوتا۔ روپے پیسے کے حوالے سے بعض افراد و اقوام کا نقطہ نظر مادی ہوتا ہے اور بعض کا غیر مادی۔ انشا جب انگریز، پاکستانی اور چینی باشندوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگریز اور پاکستانی لوگ تو مادی نقطہ نظر کے حامی ہیں جبکہ چینی افراد غیر مادی نقطہ نظر کے حامی ہیں۔ اس کا اندازہ وہ اس بات سے لگاتے ہیں کہ انگریز اور پاکستانی لوگ تو اپنے بہتر مستقبل اور آرام و آسائش کے لئے اپنے ملک کو چھوڑ کر کسی دوسرے ملک چلے جانے پر خوشی خوشی راضی ہو جاتے ہیں لیکن چینی باشندے روپے پیسے کو اہمیت دینے کی بجائے اپنے ملک اور قوم کی ترقی و خوشحالی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو بیرون ملک بہتر مستقبل کے امکان نظر آئیں پھر بھی یہ لوگ اپنے ملک میں رہنے ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ انگلستان کے لوگوں کی مادہ پرست ذہنیت کے حوالے سے انشا بتاتے ہیں کہ برطانیہ میں لوگ ایک سرکاری رپورٹ سے پریشان ہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ برطانیہ میں ہر سال چھ ہزار دو سو انجینئر، ڈاکٹر اور سائنسدان بہتر مستقبل کے لئے کینیڈا چلے جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک پاکستانی سے بھی بیرون ملک جانے کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا کہ جناب اگر ملک پسماندہ ہے تو ہم کیا کریں ہمیں تو ترقی کرنی ہے۔ البتہ جب انھوں نے ایک چینی ڈاکٹر سے پوچھا کہ جناب آپ بہتر مستقبل کے لئے کسی دوسرے ملک کیوں نہیں چلے جاتے۔ تو وہ کہنے لگا کہ جناب روپیہ پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا اگر ہمارا ملک ہی کنگال ہے تو ہماری اس ترقی و خوشحالی اور بہتر مستقبل کا کیا فائدہ۔

انشا نے ایثار و قربانی کے حوالے مشرق و مغرب کا تقابل کیا بلکہ اس تقابل میں انھوں نے مشرق بعید کے ممالک کو بھی شامل کر لیا۔ سفرنامہ نگار نے تقابلی مطالعے میں مختلف خطوں کو اس لئے شامل کیا کیونکہ بطور انسان وہ اپنی ذہنی کیفیات کو

کسی ایک خطے یا مقام میں مقید نہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ایک خطے کا تقابلی مطالعہ جغرافیائی حدود میں منقسم ہونے کے باوجود اس حد بندی سے ماورا رہتا ہے۔ بہرحال انشا جب ایثار و قربانی کے حوالے سے پاکستانی، برطانوی اور چینی باشندوں کا تقابل کرتے ہیں تو ان پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ پاکستانی باشندے اس اعتبار سے برطانوی باشندوں سے بہتر ہیں کہ وہ سماجی تعلقات میں تو اس اخلاقی قدر کی ضرورت و اہمیت سے آگاہ ہیں جبکہ برطانوی باشندے اس اخلاقی قدر کی اس ضرورت و اہمیت سے یا تو آگاہ نہیں ہیں یا پھر جان بوجھ کر اس سے صرف نظر کرتے ہیں۔ جب وہ فرد کے ذاتی مفاد اور قومی وملکی مفاد کے حوالے سے پاکستانی، برطانوی اور چینی باشندوں کے طرز عمل کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں یہ پتا چلتا ہے کہ ذاتی اور ملکی مفاد کی حد تک تو پاکستانی اور برطانوی باشندوں کے طرز عمل میں مکمل اشتراک کا پہلو موجود ہے البتہ چینی باشندوں کے طرز عمل میں اس حوالے سے اختلاف موجود ہے۔ یوں ایثار و قربانی کے حوالے سے انھیں چینی لوگ پاکستانی اور برطانوی لوگوں سے کہیں بہتر نظر آئے۔

اخلاقی جرائم:

ہر انسان میں نیکی اور بدی کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ جس طرح ہر انسان میں کچھ خوبیاں ہوتی ہیں اسی طرح اس میں کچھ خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ انشا نے یورپ کی سیر و سیاحت کے دوران جہاں اس خطے کی سماجی زندگی کے مثبت زاویوں کو اپنا موضوع بنایا وہیں ان ممالک کے منفی اور تاریک پہلوؤں کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ جہاں وہ ہر معاشرے میں اخلاقی قدروں کے متلاشی رہے وہیں انھوں نے ان ممالک میں اخلاقی جرائم کے بارے میں جاننے کی کوشش بھی کی۔ انھوں نے پاکستان اور یورپی ممالک کا اخلاقی اعتبار سے تقابل کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت بھی کی۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو بیان کیا جاتا ہے۔

ا۔ گداگری:

بھیک مانگنا اچھی عادت نہیں ہے، یہ فعل نفس کی تذلیل کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس سے فرد کی خودی کو دھچکا لگتا ہے اور اس کی شخصیت تباہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ انشا نے یورپ کے سفر کے دوران اس خطے کے بعض ممالک میں اخلاقی جرائم کی صورتحال کے بارے میں جاننے کی کوشش بھی کی۔ انشا کو ہالینڈ قیام کرنے کا موقع بھی ملا۔ جب وہ ہالینڈ کی سماجی زندگی اور اس میں موجود جرائم کا کھوج لگاتے ہیں تو انھیں یہ پتا چلتا ہے کہ یہ اخلاقی برائی پاکستان کے علاوہ ہالینڈ میں بھی موجود ہے۔ جب وہ ان دونوں ممالک کے بھکاریوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں ممالک کے بھکاریوں کے بھیک مانگنے کے طریقۂ کار میں خاصا فرق نظر آتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہالینڈ میں بھیک مانگنے کے لئے گداگر جدید آلات کا استعمال کرتے ہیں اور منفرد انداز اپناتے ہیں جبکہ پاکستان میں صورتحال اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہالینڈ کے بھکاریوں کا احوال بیان

کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ وہاں میں نے ایک بھکاری کو سڑک پر ایک تھیلا لئے کھڑے دیکھا اور ساتھ ہی گراموفون پر بلند آواز میں ایک درد بھرا گیت بھی سنایا جا رہا تھا تا کہ راہگیر اس درد بھرے گیت کو سن کر بھیک دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ جبکہ ہمارے ہاں کے بھکاری بھیک مانگنے کے لئے وہی گھسا پٹا اور روایتی طریقہ اپناتے ہیں۔ یوں انشا کو گداگری جیسی اخلاقی برائی کے حوالے سے تو پاکستان اور ہالینڈ میں اشتراک کا پہلو نظر آیا البتہ پاکستان اور ہالینڈ کے بھکاریوں کے بھیک مانگنے کے طریقۂ کار میں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

۲۔ ملاوٹ اور ذخیرہ اندوزی کرنا:

ملاوٹ کرنا بھی ایک اخلاقی جرم ہے۔ انشا نے اس اخلاقی جرم کے حوالے سے پاکستان اور یورپ کے دیگر ممالک میں موجود صورتحال کا تقابل کیا اور اس تقابل کے نتیجے میں آنے والے اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت بھی کی۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو بیان کیا جاتا ہے۔

انگلستان کے سفر کے دوران انشا نے وہاں کے معاشرے کو بڑے قریب سے دیکھنے کی کوشش کی اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انگلستان اخلاقی اعتبار سے لاکھ برا سہی لیکن وہاں ملاوٹ جیسی برائی موجود نہیں ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ وہاں کھانے کی تمام اشیاء خالص ملتی ہیں جن میں دودھ، دہی، مکھن، چینی اور مسالے شامل ہیں۔ پاکستان کی بابت وہ بتاتے ہیں کہ یہاں ہر چیز ناخالص ہے۔ وہ پاکستان میں ملاوٹ کے حوالے سے موجود صورتحال پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھے انگلستان کی خالص اشیاء ذرا نہ بھائیں کیونکہ مجھے تو اپنے ملک کی ملاوٹ شدہ خوراک کھانے کی عادت تھی بلکہ اب اگر ہمیں اچھی اور خالص خوراک مل بھی جائے تو وہ ہمیں ہضم نہیں ہوتی۔ اس لئے اگر کوئی ہم وطن انگلستان آئے تو میرے لئے تحفے میں اپنے ملک کی ملاوٹ شدہ خوراک ضرور لائے تا کہ میں وطن سے دور رہ کر بھی اپنے کی ملاوٹ شدہ خوراک سے لطف اندوز ہو سکوں۔ ان جملوں میں انشا نے پاکستانی قوم کے اخلاق و کردار پر گہری چوٹ کی ہے، ان کی تحقیر و تنقید بلاوجہ نہیں ہے دیکھا جائے تو پاکستانی معاشرہ اس اخلاقی برائی کا شکار نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ کہنے کو مسلمان ہیں لیکن ہمارے اعمال کسی طرح بھی ہمیں مسلمان ثابت نہیں کرتے جبکہ انگریز لوگوں کے جذبۂ ایمان کو ہم لوگ شک و شبے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جب وہ ملاوٹ کے حوالے سے پاکستانیوں اور انگریزوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ جان کر افسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے ایمان کو ہم شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں وہ اخلاقی اعتبار سے ہم لوگوں سے کہیں بہتر ہیں۔ ہم ایمان کے ٹھیکیداروں کے ہاں شاید ہی کوئی ایسی چیز ہو جو خالص ملتی ہو جبکہ ان لوگوں کے ملک میں جنھیں ہم لوگ بے دین کہتے ہیں ملاوٹ کا شائبہ تک نظر نہ آتا۔ بہر حال انشا کو ملاوٹ جیسی اخلاقی برائی کے حوالے سے انگریز اور پاکستانی قوم کے طرز عمل میں صریحاً اختلاف نظر آیا۔

۳۔ بے ایمانی، جھوٹ، رشوت اور فرائض سے غفلت برتنا:

بے ایمانی، جھوٹ، رشوت اور فرائض سے غفلت برتنے جیسے جرائم کا شمار بھی اخلاقی جرائم میں ہوتا ہے۔انشا نے یورپی ممالک کی سیاحت کے دوران ان ممالک کے معاشروں میں جہاں دیگر اخلاقی جرائم کا جائزہ لیا وہیں مذکورہ اخلاقی برائیوں اور کوتاہیوں کو بھی اپنا موضوع بحث بنایا۔انھوں نے ان اخلاقی برائیوں کے حوالے سے پاکستان، یورپ اور امریکہ کا تقابل بھی کیا اور اس تقابل کے نتیجے میں آنے والے اشتراکات اور اختلافات کو اپنے سفرناموں میں بیان کر دیا۔ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو بیان کیا جاتا ہے۔

یوں تو کسی معاشرے کے تمام افراد ہی بے ایمانی، رشوت، جھوٹ اور فرائض سے غفلت جیسے جرائم کے مرتکب ہو سکتے ہیں لیکن محکمۂ پولیس میں شامل افراد ان اخلاقی برائیوں اور کوتاہیوں کا عموماً زیادہ شکار نظر آتے ہیں۔حالانکہ یہ وہ محکمہ ہے جس کے سپرد جرائم کے تدارک جیسے فرائض ہوتے ہیں۔جس طرح کسی ملک میں جرائم کے تدارک کے سلسلے میں وہاں کی پولیس کے کردار کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اسی طرح کسی ملک میں جرائم کے پھیلاؤ کے سلسلے میں بھی اس محکمے کے تعاون اور مدد سے اغماض نہیں برتا جا سکتا۔کیونکہ اگر پولیس فرض شناسی کے جذبے سے سرشار ہو اور جرائم کو پنپنے کا موقع نہ دے تو مجرموں میں جرائم کا ارتکاب کرنے کا حوصلہ پیدا نہ ہو تا لیکن اگر خود پولیس ہی جھوٹ، بے ایمانی، رشوت اور فرائض سے غفلت برتے تو پھر ایسی جگہوں پر جرائم کا اللہ ہی حافظ ہوتا ہے۔انشا بتاتے ہیں کہ انگلستان قیام کے دوران مجھے وہاں کی پولیس کے اخلاق و کردار کا قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہاں کی پولیس کا طرز عمل بالکل پاکستانی پولیس جیسا تھا یعنی وہاں کی پولیس بھی پاکستانی پولیس کی طرح مجرموں سے پورا تعاون کرتی ہے، دوسرے معنوں میں پولیس رشوت لیتی ہے، بے ایمانی کرتی ہے، جھوٹ بولتی ہے اور اپنے فرائض سے غفلت برتتی ہے۔ یوں برطانوی پولیس کے کردار میں انھیں اپنے ملک کی پولیس کے کردار کی پوری جھلک نظر آئی۔وہ بتاتے ہیں کہ برطانیہ میں بھی صفائی کی صورتحال انھیں بالکل پاکستان جیسی نظر آئی کیونکہ وہاں بھی جا بجا گندگی اور کوڑے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔کئی جگہوں پر انھوں نے کوڑا کرکٹ پھینکنے والوں کے لئے تنبیہی نوٹس بھی آویزاں دیکھے جس میں ایسے جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے سزاؤں کا تعین کیا گیا تھا۔البتہ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی آپ کو لندن شہر میں جا بجا کوڑے کے ڈھیر نظر آئیں گے۔اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ یہاں بھی ہماری طرح قوانین بنائے تو جاتے ہیں لیکن ان پر عمل درآمد نہیں کروایا جاتا۔پھر وہ پاکستانی پولیس کے اخلاق و کردار کو موضوع بحث بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ جرائم کے تدارک کے سلسلے میں پاکستانی پولیس جس قسم کی خدمت اور فرض شناسی کا مظاہرہ کرتی ہے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے لیکن اگر آپ پھر بھی ان کے کارہائے نمایاں سے نا آشنا ہیں تو اپنے ملک کے اخبارات دیکھ لیجئے۔جس میں آئے دن پولیس کی فرض شناسی

کی خبریں چھپتی رہتی ہیں کہ کس طرح پولیس نے کوکین اور چرس کے اسمگلروں کی مدد کی اور کس طرح مجرموں سے نرمی کا برتاؤ کیا۔ انشاؔ کہتے ہیں کہ پاکستان اور انگلستان کی پولیس کے کردار وطرزِ عمل کو دیکھ کر یہ اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں ممالک کی پولیس اپنے فرائض کو کس طرح سے سرانجام دے رہی ہے۔

پھر وہ پاکستان اور انگلستان کے عام لوگوں کے طرزِ عمل کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ممالک کے لوگ بے ایمانی جیسے جرم کا ارتکاب بھی کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ لندن قیام کے دوران ایک بس میں سفر کرتے ہوئے انھوں نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ وہاں بھی کنڈیکٹر ہمارے ہاں کے کنڈیکٹروں کی طرح بے ایمانی کرتے ہیں اور پیسے وصول کرنے کے باوجود مسافروں کو ٹکٹ نہیں دیتے۔ یوں انھیں کو انگلستان کے ڈرائیور حضرات کے طرزِ عمل میں اپنے ملک کے ڈرائیور حضرات کے طرزِ عمل کی چلتی پھرتی تصویر نظر آئی۔ البتہ اس بے ایمانی کو دیکھ کر مجھے نہ تو حیرانی ہوئی اور نہ ہی کسی قسم کی ناگواری کا احساس پیدا ہوا بلکہ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ چلو وطن نہیں تو وطن سی کوئی بات ہی سہی۔ بہر حال انشاؔ کو بے ایمانی جیسے جرم کے حوالے سے پاکستان اور انگلستان کے لوگوں اور پولیس میں مکمل اشتراک کی صورت نظر آئی۔

اپنے فرائض سے غفلت برتنا بھی اخلاقی جرائم کے زمرے میں آتا ہے۔ انشاؔ جب اس اخلاقی برائی کے حوالے سے پاکستان اور انگلستان کی پولیس اور عام لوگوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس برائی کے حوالے سے ان دونوں ملکوں کے عوام اور پولیس میں مکمل اشتراک موجود ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جس طرح ہمارے ہاں کی پولیس اپنے فرائض سے غفلت برتتی ہے اسی طرح لندن پولیس بھی اس معاملے میں کسی سے کم نہیں ہے بلکہ کارپوریشن اور محکمۂ تعلقات عامہ والے تو اس سلسلے میں پیش پیش ہیں۔ انشاؔ بتاتے ہیں کہ وہاں کے ایک اخبار نے شہر کی ایک مشہور شاہراہ پر گڑھے کی موجودگی کی خبر نمایاں طور پر شائع کی لیکن کارپوریشن والوں نے اگلے روز اس خبر کی تردید کر دی۔ اخبار والوں نے بھی ان کی جان نہیں بخشی اور اگلے دن اس گڑھے کی تصویر دوبارہ اخبار میں شائع کر دی۔ تصویر شائع ہو جانے سے ان کے لئے جھوٹ بولنے اور مکرنے کے تمام راستے بند ہو گئے اور انھیں اپنی نااہلی کو تسلیم کرتے ہوئے اس گڑھے کو پُر کرنا پڑا۔ یوں انشاؔ کو نااہلی اور فرائض سے غفلت برتنے کے حوالے سے بھی پاکستان اور انگلستان کے عوام اور پولیس کے کردار میں مکمل اشتراک کا پہلو نظر آیا۔

المختصر انشاؔ نے جب پاکستان اور انگلستان کی پولیس اور عوام کا تقابل کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ ان دونوں ممالک کے لوگوں میں بے ایمانی، رشوت، جھوٹ اور فرائض سے غفلت برتنے جیسے جرائم موجود ہیں اور ان جرائم کے پھیلاؤ میں ان دونوں ممالک کی پولیس اور عوام کا تعاون بھی بالکل ایک جیسا ہے۔ یوں انشاؔ نے پاکستانی اور یورپی اقوام کے اخلاق و کردار کا تقابل کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان دونوں اقوام میں اخلاقی اعتبار سے اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو موجود ہیں۔

سماجی اقدار

ہر معاشرے کی اپنی کچھ سماجی قدریں ہوتی ہیں جنھیں ہوسکتا ہے کہ کسی معاشرے میں تو قبول عام کا درجہ دیا جاتا ہو لیکن کسی دوسرے معاشرے میں ویسی پسندیدگی اور قدر و منزلت سے نہ دیکھا جاتا ہو۔

انؔشا نے جس طرح مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ کے سفر کے دوران سماجی اقدار کے بارے میں شناسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ویسے ہی یورپ اور امریکہ کے سفر کے دوران بھی سماجی اقدار کو اپنا موضوع بنایا۔ اس مطالعے اور مشاہدے سے ان پر یہ حقیقت کھلی کہ پاکستان، یورپ اور امریکہ میں سماجی قدروں کے حوالے سے صرف اختلاف کے پہلو ہی موجود ہیں۔ انھوں نے اس مطالعے اور مشاہدے کو صرف معلومات اور کوائف کی جمع آوری تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے تقابلی انداز میں پیش کر کے ان اشتراکات اور اختلافات کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ اس تقابلی مطالعے سے ان معلومات کی اہمیت میں نہ صرف اضافہ ہوا بلکہ یہ قارئین کی توجہ اور دلچسپی حاصل کرنے میں بھی کامیاب رہے۔

انؔشا کو پاکستان، یورپ اور امریکہ میں سماجی قدروں کے حوالے سے جو اختلافات نظر آئے انھیں ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

عفت وحیا:

عفت وحیا بھی ایک سماجی قدر ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سماجی قدر کا احترام زیادہ تر مشرقی ممالک میں ہی کیا جاتا ہے، اہل مغرب خود کو اس سماجی قدر کے احترام سے مستثنیٰ سمجھتے ہیں۔ انؔشا کو یورپی ممالک کے سفر کے دوران جہاں دیگر اشیاء اور مظاہر کے بارے میں جاننے کا موقع ملا وہیں اس سماجی قدر کے حوالے سے ان معاشروں کی عمومی حالت جاننے کا موقع بھی درآیا۔ وہ اس سماجی قدر کے حوالے سے جب پاکستان اور یورپی ممالک کا تقابل کرتے ہیں تو اس تقابلی مطالعے میں بھارت کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان اور بھارت مشرقی ممالک ہیں اس لیے مجھے ان دونوں ممالک کے لوگوں میں عفت وحیا کے حوالے سے تقریباً ایک جیسے انداز فکر اور طرز عمل کی توقع تھی لیکن مجھے ان دونوں ممالک میں بھی اس حوالے سے متضاد صورتحال نظر آئی۔ وہ اس اختلاف کی وضاحت کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ فلمیں پاکستان، بھارت اور انگلستان تینوں ممالک میں بنتی ہیں لیکن ان تینوں ممالک میں بننے والی فلموں میں عفت وحیا کے حوالے سے اختلاف کا پہلو موجود ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں تو اس مسئلے پر ابھی بحث ہو رہی ہے کہ فلموں میں چوما چاٹی اور بوسہ بازی کی اجازت ہونی چاہیے یا نہیں جبکہ پاکستان میں بننے والی فلموں میں چوما چاٹی اور بوس و کنار جیسی نازیبا حرکت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یوں انؔشا کو یہ جان کر بڑی حیرانی ہوئی کہ عفت وحیا جیسی سماجی قدر کے حوالے سے پاکستان اور بھارت جیسے مشرقی ممالک میں بھی اختلاف موجود ہے۔ اس کے بعد وہ انگلستان

میں اس سماجی قدر کی صورتحال کی بابت بتاتے ہیں کہ وہاں عفت وحیا کے تقدس کو ذرا بھی ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں بننے والی فلموں میں جسمانی ملاپ کے تمام مراحل فلم اور اسٹیج پر دکھا دیئے جاتے ہیں۔ یوں انؔشا نے ان تینوں ممالک میں بننے والی فلموں کے ذریعے ان ممالک میں اس سماجی قدر کے حوالے سے موجود اختلافی صورتحال کی وضاحت کی ہے۔

کسی بھی معاشرے میں عفت وحیا کے تصور کی وضاحت وہاں پر عاشق ومعشوق کے مابین معاملات عشق سے بھی کی جاسکتی ہے۔ عفت وحیا کے تصور میں اختلاف کے سبب پاکستان اور یورپ میں عاشق ومحبوب کے درمیان جذبۂ عشق بھی ایک اختلافی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ہاں کے عاشق تو مجنوں کی طرح ایک ہی محبوب کے پیچھے پاگل ہوئے جاتے ہیں اور اس کی تلاش میں در در کی خاک چھانتے ہیں۔ ہمارے ہاں چونکہ مرد اور عورت کے آزادانہ میل جول کو پسند نہیں کیا جاتا اس لئے عاشق کو محبوب سے رابطے کی جب کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی تو وہ بے بس اور لاچار دکھائی دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ نا امید ہو کر بیٹھ رہتا ہے اور صرف چاند کے ذریعے ہی محبوب تک اپنا پیغام پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ انگلستان کے بارے میں وہ بتاتے ہیں کہ وہاں تو عاشقی کا یہ انداز ہے کہ عاشق کسی ایک محبوب پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ایک ہی وقت میں ان کے پاس کئی محبوب ہوتے ہیں اور میل ملاپ کی آزادی بھی۔ وہاں عاشق محبوب کے درشت لہجے اور بے اعتنائی کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ کسی اور طرف جھک جاتے ہیں اس کے علاوہ ان کے ہاں منگیتر کے ہوتے ہوئے بھی بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ انؔشا بتاتے ہیں یورپی معاشرے میں عفت وحیا کے تقدس کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا وہاں فحاشی اور عریانی کے مظاہرے عام دکھائی دیتے ہیں، آپ بازار جائیں یا کسی بس یا ٹرین میں سفر کریں، کسی نہ کسی نازیبا حرکت یا عریانی وفحاشی کا کوئی نہ کوئی مظاہرہ آپ کی نظروں کے سامنے ضرور گزرے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان اور یورپی معاشرے کے طرز فکر میں یہ اختلاف ہے کہ یہاں اگر کوئی شخص عفت وحیا کی حدود کو پھلانگے تو اسے قابل گرفت سمجھا جاتا ہے اگلے ہی روز اخبارات میں اس کی نازیبا حرکت کو موضوع بنایا جاتا ہے جبکہ یورپی معاشرے میں ایسی نازیبا حرکات سے لوگوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی اور نہ ہی وہ ایسی حرکات کو نفرت یا حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

انؔشا نے لندن قیام کے دوران وہاں کی سماجی زندگی میں عفت وحیا کے تصور کا جائزہ بھی لیا۔ جب وہ اس سماجی قدر کے حوالے سے پاکستان اور انگلستان کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں پاکستانی معاشرے اور برطانوی معاشرے میں خاصا اختلاف نظر آتا ہے البتہ اختلاف میں انھیں پاکستانی لوگوں کا طرز عمل برطانوی شہریوں سے کہیں بہتر نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں چونکہ معاشرتی حدود وقیود کو ضروری سمجھا جاتا ہے اس لیے مرد اور عورت کے لیے شادی جیسے سماجی بندھن کو ضروری خیال کیا جاتا ہے تاکہ معاشرے میں کسی قسم کا بگاڑ اور بے راہ روی پیدا نہ ہو۔ جبکہ مغربی معاشروں میں عفت وحیا کے تصور کے نہ ہونے کے سبب بے حیائی کا کھلے عام ارتکاب کیا جاتا ہے

وہاں مرد اور عورت کے آزادانہ میل ملاپ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاتی اور نہ ہی مرد اور عورت کے لئے شادی جیسے سماجی بندھن کو زیادہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا بلکہ وہاں اس مقصد کے لئے دوستی کو رواج دیا جاتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ لندن کی دیواروں پر مجھے ایسے اشتہارات جابجا نظر آئے جن میں دوست بنانے کی ترغیبیں، نصیحتیں اور فوائد درج تھے۔ ہمارے معاشرے میں جس طرح لڑکے اور لڑکی کا انتخاب کرتے وقت اس میں چند خوبیوں کی تلاش کی جاتی ہے مثلاً یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ اچھے کردار و پاکیزہ اخلاق کی مالک ہو اور امورِ خانہ داری میں بھی مہارت رکھتی ہو اور لڑکے کا انتخاب کرتے ہوئے یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ اعلیٰ افسر ہو اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ اسی طرح انگلستان میں بھی دوست بنانے کا ایک پورا طریقۂ کار موجود ہے۔ اس بات کا اندازہ انھیں لندن کی آکسفورڈ اسٹریٹ جا کر ہوا۔ وہ بتاتے ہیں کہ کاؤنٹر پر کھڑی ایک لڑکی نے انھیں ایک فارم پکڑا دیا۔ جس میں دوست کے انتخاب کا پورا طریقہ درج تھا۔ جو شخص یہ فارم لیتا ہے تو اس سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ آپ مرد ہیں تو آپ اپنی ساتھی دوست میں کن کن خوبیوں کے متلاشی ہیں اور اگر آپ مؤنث ہیں تو پھر آپ اپنے مرد دوست میں کن کن خوبیوں کی خواہاں ہیں۔ لہٰذا ایسے تمام لوگ جنھوں نے یہ فارم لیے ہوں ان سے پانچ پاؤنڈ کی رقم لے کر یہ معلومات کمپیوٹر کے حوالے کر دی جاتی ہیں۔ اس کمپیوٹر میں پہلے سے ایسے تمام لوگوں کی تفصیلات اور کوائف موجود ہوتے ہیں جو اپنے لیے اچھے دوست کے متلاشی ہوتے ہیں۔ جب ایک شخص کا فارم پانچ پاؤنڈ کی رقم لے کر کمپیوٹر کے حوالے کیا جاتا ہے تو اس کے بعد کمپیوٹر اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ وہ ہر امیدوار کو اس کی خواہش کے مطابق موزوں اور مناسب امیدواروں کے ناموں کی فہرستیں اور ان کے ٹیلی فون نمبرز دے دیتا ہے۔ پھر ان لوگوں سے رابطہ کرنا اور دیگر معلومات طے کرنا ہر شخص کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے۔ کمپیوٹر اپنا کام کر دیتا ہے اب آگے ہر شخص کی اپنی قسمت ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہو جائے۔ بہر حال انؔشا کو عفت و حیا جیسی سماجی قدر کے حوالے سے پاکستان اور انگلستان کے لوگوں کے طرزِ عمل میں صریحاً اختلاف نظر آیا۔

جرمنی قیام کے دوران انؔشا نے وہاں کی سماجی اور معاشرتی زندگی کا بھی قریب سے مشاہدہ کیا۔ جب وہ عفت و حیا کے حوالے سے اس معاشرے کی صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں پتا چلتا ہے کہ یہاں بھی عفت و حیا کے تصور سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں مرد اور عورت کے آزادانہ میل جول کو پسند نہیں کیا جاتا جب کہ جرمن معاشرے میں اس حوالے سے صورتحال بالکل مختلف ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جرمنی قیام کے دوران ایک ترجمان خاتون میری رہنمائی اور میزبانی کا فریضہ ادا کرتی رہی، جب میں رخصت ہونے لگا تو اس خاتون نے اصرار کیا کہ وہ میرے ساتھ تصویر بنوانا چاہتی ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ ہماری تہذیب میں نامحرموں کے ساتھ میل جول کو معیوب سمجھا جاتا ہے اس لیے میں تمہارے ساتھ تصویر نہیں بنوا سکتا لہٰذا میری طرف سے معذرت سمجھو۔

انؔشا کو ان کی سرکاری مصروفیات کی غرض سے امریکہ کا سفر بھی اختیار کرنا پڑا۔ امریکہ قیام کے دوران انھوں نے

وہاں کی سماجی زندگی کو قریب سے دیکھا اور دیگر سماجی اقدار کے ساتھ ساتھ عفت وحیا کے حوالے سے بھی اس معاشرے کے لوگوں کے طرزِ عمل کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ جب وہ اس سماجی قدر کے حوالے سے پاکستان اور امریکہ کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس حوالے سے دونوں ممالک میں خاصا اختلاف نظر آتا ہے۔ انؔشا نے اس اختلاف کو سفرنامہ دنیا گول ہے کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

"مسرِ بازار چوما چاٹی کو جانے دیجئے کہ سوائے ہمارے ملک کے اور سب جگہ رواج ہے بس ہمارے ملک میں خبریں چھپتی ہیں کہ ایمپرس مارکیٹ پر مسمّی فلاں اور مسماۃ فلاں بوس وکنار کرتے یا دعوتِ گناہ دیتے ہوئے پکڑے گئے۔ یہاں یہ معمولات میں داخل ہے۔ آپ سامنے بیٹھے رہیئے، آپ سے کیا پردہ ہے؟"۵

درجہ بالا حوالے میں انؔشا نے عفت وحیا کے حوالے سے پاکستان، یورپ اور امریکہ اور دیگر یورپی ممالک میں موجود صورتحال کی وضاحت کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس سماجی قدر کے حوالے سے انھیں پاکستان، یورپ اور امریکہ میں اختلاف کا پہلو ہی نظر آیا۔

بہر حال انؔشا کو عفت وحیا کے حوالے سے پاکستان، ہندوستان، یورپ اور امریکہ میں اختلاف نظر آیا۔ البتہ اس سماجی قدر کے حوالے سے انھیں پاکستان میں صورتحال باقی ممالک کے مقابلے میں زیادہ بہتر نظر آئی۔

خواتین کی عزت واحترام کرنا:

خواتین کی عزت اور احترام کرنا دنیا کے اکثر معاشروں میں مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان سمیت دنیا کے کئی ممالک میں خواتین کی عزت واحترام کو ایک سماجی قدر کی حیثیت حاصل ہے۔ البتہ کچھ ممالک ایسے بھی ہیں جہاں اس سماجی قدر سے بے اعتنائی برتنے کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ انؔشا کو یورپ کے کئی ممالک میں سفر کرنے اور قیام کرنے کا موقع ملا۔ اس دوران انھوں نے جہاں اپنی دلچسپی کے دیگر زاویوں پر توجہ مرکوز کی وہیں ان ممالک کی سماجی زندگی کو بھی اپنے مطالعے اور مشاہدے کا مرکز بنایا۔ ہمارے ملک میں خواتین کو جس قدر عزت اور احترام دیا جاتا ہے اس سے تو انؔشا بخوبی واقف تھے لیکن وہ اس سماجی قدر کے حوالے سے یورپ کے لوگوں کے طرزِ عمل سے بھی آگاہی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جب وہ اس سماجی قدر کے حوالے سے پاکستان اور انگلستان کے لوگوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں اقوام کے لوگوں کے طرزِ عمل میں اس حوالے سے صریحاً اختلاف نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انگلستان یوں تو ایک ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ ملک ہے اور ایسے معاشرے میں تو سماجی اقدار کی زیادہ پاسداری کی جانی چاہیے لیکن وہاں کے لوگوں کا طرزِ عمل ایسا ظاہر نہیں کرتا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہمارا ملک انگلستان کے مقابلے میں کم تعلیم یافتہ اور کم ترقی یافتہ ہے لیکن پھر بھی یہاں کے لوگ خواتین کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اگر کسی خاتون کو سفر کرتے ہوئے نشست نہ مل سکے اور اسے مجبوراً کھڑا ہونا پڑے تو مرد حضرات اس خاتون کا احترام کرتے ہوئے اپنی نشست خالی کر دیتے ہیں لیکن یورپ کے لوگوں

کی اخلاقی تنزلی اور بے حسی کا یہ حال ہے کہ اب وہاں کے مرد حضرات خواتین کے لئے نشستیں خالی نہیں کرتے۔ یوں انشا کو ا
س سماجی اقدار کے حوالے سے پاکستان اور انگلستان میں صرف اختلاف کا پہلو ہی نظر آیا۔

رشتوں کا احترام کرنا:

رشتوں کا احترام کرنا بھی ایک سماجی قدر ہے۔ دنیا کے کئی معاشروں میں اس سماجی قدر کا بہت احترام کیا جاتا ہے اور کئی معاشروں میں تو اس سماجی قدر کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ انسان جب اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو وہ کئی خونی رشتوں سے متعارف ہوتا ہے ان میں ماں، باپ، بہن، بھائی اور دیگر قریبی رشتہ دار شامل ہیں۔ پھر جوں جوں اس کا رابطہ معاشرے کے دوسرے افراد سے بڑھتا چلا جاتا ہے ویسے ہی اس کی زندگی میں نئے تعلق اور نئے رشتے اپنی جگہ بنانا شروع کر دیتے ہیں، یوں فرد مختلف رشتوں کے بندھنوں میں بندھتا چلا جاتا ہے۔ دنیا کے تقریباً سبھی معاشروں کے افراد مختلف رشتوں اور سماجی بندھنوں میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ہر معاشرے کے افراد ان رشتوں اور بندھنوں کا ایک سا احترام بھی کرتے ہوں۔ اگر ہم بات کریں مشرق اور مغرب کی تو یہ صرف دو الگ خطے ہی نہیں بلکہ ان کا سماجی اور معاشرتی نظام بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ انشا نے اس سماجی قدر کے حوالے سے پاکستان اور ان ممالک کے لوگوں کے طرزِ عمل کا تقابل کیا اور ان میں موجود اختلافات اور مماثلتوں کو نمایاں کرنے کی کوشش بھی کی۔ انشا کو اس سماجی قدر کے حوالے سے پاکستان، یورپ اور امریکہ میں جو اختلافات نظر آئے انھیں ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

انشا کو متعدد بار انگلستان کے سفر کا موقع ملا۔ اس معاشرے کا اجمالی جائزہ لینے سے انھیں یہ معلوم ہوا کہ یہاں کے لوگ رشتوں کا بالکل احترام نہیں کرتے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس ملک میں ہر رشتہ اقتصادی ہے، باقی رشتوں کو تو رہنے دیجئے وہاں تو خونی رشتے بھی اپنا فرض نہیں نبھاتے۔ اگر کوئی شخص بیمار پڑ جائے تو اس کے گھر والے خود اس کی تیمارداری نہیں کرتے بلکہ اسے اسپتال والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ آتے ہیں۔ حالانکہ اس مشکل وقت میں تو اسے اپنوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس ملک میں یہ خونی رشتے بھی اتنے بے حس ہو جاتے ہیں کہ اس مشکل وقت میں اسے اپنی محبت و خلوص اور توجہ کا احساس دلانے کی بجائے اسے غیروں کے رحم و کرم پر چھوڑ آتے ہیں۔ اس سماجی قدر کے حوالے سے جب وہ پاکستان میں موجود صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں پاکستانی معاشرہ اس سماجی قدر کے حوالے سے برطانوی معاشرے سے کہیں بہتر نظر آتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ملک کے لوگ رشتوں کو نبھاتے ہیں اور ایک دوسرے کے لئے پیار، محبت، خلوص اور ہمدردی کے جذبات رکھتے ہیں۔ یہاں اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے تو صرف اس کے عزیز و اقارب ہی اس کی تیمارداری نہیں کرتے بلکہ دوست احباب بھی اپنا پورا حق ادا کرتے ہیں۔ یہ لوگ صرف مریض کی عیادت کرنے ہی نہیں آتے بلکہ اس کی دیکھ بھال بھی کرتے ہیں۔ یوں پاکستان میں رہنے والے لوگ خونی رشتوں کے ساتھ ساتھ سماجی رشتوں اور بندھنوں کو بھی

بخوبی نبھاتے ہیں۔ انشا لندن میں مقیم ایک پاکستانی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کا احوال بتاتے ہیں جو وہاں کے ایک ہسپتال میں بیماری اور بے چارگی کے دن گزار رہا تھا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان صاحب کی عیادت کو کوئی شخص نہیں آتا تھا۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ جناب آپ جیسے لوگ تو پاکستان میں بھی عیش وعشرت کی زندگی گزار سکتے ہیں تو پھر آپ یہاں کیوں آئے؟ اپنے ملک میں تو تمہاری خدمت اور مددگاری کے لئے کئی نوکر موجود ہوتے ہیں جبکہ یہاں تمہیں خود نوکروں کی طرح کام کرنا پڑتا ہے۔ اس آرام وآسائش کو بھی رہنے دو، آج جب تم اس بیماری اور لاچاری میں مبتلا ہو اور تمہاری تیمارداری اور دلجوئی کرنے والا کوئی نہیں، اگر یہی تم اپنے ملک میں ہوتے تو کم از کم ہسپتال کے بستر پر یوں اکیلے نہ پڑے ہوتے۔ میری بات سننے کے بعد اس نے جواب میں ایک سرد آہ بھری اور کہا ہاں واقعی اس ملک میں سب رشتے اقتصادی ہیں۔ بہر حال انشا کو انگلستان کے سفر کے بعد یہ جان کر خوشی ہوئی کہ پاکستانی لوگ ایک دوسرے کے لئے پیار ومحبت، خلوص اور ہمدردی کے جذبات رکھتے ہیں۔ یہاں کے لوگ خونی رشتوں اور سماجی بندھنوں دونوں کا احترام کرتے ہیں جبکہ انگلستان جیسے ترقی یافتہ ملک میں لوگ خونی رشتوں اور سماجی بندھنوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ ان لوگوں کے طرزِ عمل پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ویسے تو یہ لوگ بڑے ترقی یافتہ اور مہذب کہلاتے ہیں لیکن ان کے ہاں رشتوں کے احترام کے سلسلے میں جس قسم کی سرد مہری اور منفی طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا جاتا ہے وہ ان کی تعلیم اور تربیت دونوں پر ایک سوالیہ نشان ہے۔ جبکہ پاکستان میں خواندگی کا تناسب انگلستان کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن پھر بھی یہاں کے لوگ معاشرے میں پیار، محبت اور خلوص جیسے جذبات کی ضرورت اور اہمیت سے پوری طرح واقف ہیں اور رشتوں کا احترام کرنا جانتے ہیں۔

دوستی ایک انمول رشتہ ہے۔ اس رشتے کی قدر وقیمت سے صرف وہی شخص واقف ہو سکتا ہے جس کا کوئی دوست نہ ہو۔ زندگی بھی بہت سے لمحات ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں تمام رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک مخلص اور ہمدرد دوست کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ انشا نے دنیا کے مختلف ممالک کے سفر کے دوران ان میں بسنے والے لوگوں کے طرزِ عمل سے ان ممالک کی سماجی اور معاشرتی زندگی میں اس رشتے کی قدر وقیمت کا اندازہ لگانے کی کوشش بھی کی۔ انھوں نے سرکاری فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں کئی بار انگلستان کا سفر اختیار کیا، وہاں قیام کے دوران ان پر یہ حقیقت کھلی کہ وہاں دوستی جیسے رشتے کی نہ تو کوئی قدر کی جاتی اور نہ ہی وہاں بسنے والے لوگ دوستی کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستانی لوگ جس طرح دوستی کے تقاضوں کو نبھاتے ہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے پورے یورپ میں گھوم کر دیکھ لیا لیکن کسی بھی شخص نے نہ تو میری خاطر مدارت کی اور نہ ہی میرے شعر سنے، ایسے میں مجھے اپنا وطن اور اپنے وطن کے لوگ بہت یاد آئے۔ مجھ جیسے شاعر کے لئے تو یہی غم سب سے بڑا ہے کہ اتنے دنوں تک مجھ سے کسی نے میرا کلام نہیں سنا۔ پھر وہ بتاتے ہیں کہ وہاں میری ملاقات وہاں مقیم چند پاکستانی دوستوں سے بھی ہوئی۔ ان لوگوں نے انشا کے ساتھ جس قسم کے طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا اسے انھوں نے سفرنامہ آوارہ گرد کی ڈائری کے درج ذیل حوالے میں یوں

بیان کیا ہے۔

''ہوا یہ کہ جس شام ہم یہاں وارد ہوئے ہوٹل میں ایک پاکستانی صاحب مل گئے بولے چلئے، پہلے آپ کو کھانے کا ٹھکانا بتا دوں۔ ہم نے کہا: ''بسم اللہ'' وہ پر پیچ گلیوں میں لے گئے اور ایک جگہ لے جا کر کہا ''یہاں آپ کو عمدہ پاکستانی کھانا اور حلال گوشت ملے گا''۔ اچھا تو نہ تھا۔ قیمے میں پانی بہت ڈال کر رکھا تھا۔ لیکن خیر۔ دوسرے روز بی بی سی میں ہمارے دوست آصف جیلانی نے بی بی سی کلب میں ہمیں پراٹھا اور کباب کھلائے۔ تیسرے دن انعام عزیز کھینچ کے ایک جگہ لے گئے جہاں بُھنا گوشت، مغز اور ماش کی دال، اور بگھارے بینگن وغیرہ سبھی تھے۔ چوتھے دن بدر عالم صاحب نے مہمان نوازی کا حق ادا کیا اور ہمیں روغن جوش کھلا کر جوش کے روغنی شعر بھی سنائے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ یارو چھری کانٹے کی نوبت بھی آئے گی کہ نہیں کہ عبداللہ ملک اپنے گھر لے گئے اور کہا۔ ولایتی کھانا کھا کر تم بے مزہ ہو گئے ہو گے، لو آج پاکستانی کھاؤ۔ اب ہم ان سے کیا کہتے۔ بہت رغبت سے ان کی روٹیاں بھی توڑیں۔ پھر سید سبط حسن کی ایسٹرن فیڈرل کمپنی نے ایک دعوت کر دی۔ اس میں بھی پلاؤ، بریانی، سیخ کباب اور پراٹھے ہی تھے۔

ایک جگہ تو جہاں بدر عالم ہمیں لے گئے تھے۔ بیرے نے کہا۔

''جناب کیا پان نہیں کھائیے گے؟''

ہم نے کہا: پان؟

بولے: جی ہاں! کیسا کھاتے ہیں آپ برابر کا؟

بہت دن سے پان نہیں کھایا تھا۔ اس روز اس کا بیڑا بھی منہ میں رکھا۔''[۷]

یوں درجہ بالا حوالے میں انؔشا نے چند پاکستانی دوستوں کے طرز عمل سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان میں دوستی کے رشتے کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور پاکستانی لوگ اس رشتے کو نبھانے میں اپنی مثال نہیں رکھتے جبکہ انگلستان میں نہ تو دوستی کے رشتے کی کوئی قدر کی جاتی ہے اور نہ ہی دوستی کے آداب کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بہرحال انؔشا کو مختلف سماجی اقدار کے حوالے سے پاکستان، یورپ، امریکہ اور کئی دیگر ممالک میں اشتراک اور اختلاف دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

خوراک

خوراک انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ کوئی بھی جاندار خوراک کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندگی کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے اور چاک و چوبند نظر آنے کے لیے ہمیں صرف خوراک کی نہیں بلکہ متوازن خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔

متوازن خوراک سے مراد ایسی خوراک ہے جس میں تمام غذائی اجزاء کی اشیاء شامل ہوں جن میں اناج، دالیں، گوشت، پھل و سبزیاں، دودھ مشروبات اور دیگر اشیاء شامل ہیں۔

انشا نے جب دنیا کے مختلف ممالک کا سفر اختیار کیا تو سفر کے دوران یقیناً ان کی دلچسپی ان ممالک میں بسنے والے لوگوں کی خوراک اور غذائی عادات میں بھی ہوگی۔ انشا نے یورپ اور امریکہ کے سفر کے دوران جن کھانوں اور مشروبات سے لطف اٹھایا ان کا تقابل اپنے ملک کی مذکورہ اشیاء سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت بھی کی۔ ان غذائی معلومات کی بوجہ ان کے سفرنامے قارئین کے لئے نہ صرف زیادہ پرکشش بن گئے بلکہ گھر بیٹھے وہ دنیا کے مختلف خطوں کو اور ان میں بسنے والے لوگوں کو زیادہ بہتر طور پر جاننے لگے۔

انشا نے یورپ اور امریکہ کے سفر کے دوران پاکستان اور اس خطۂ ارض کے ممالک کی خوراک میں جو اشتراکات اور اختلافات محسوس کیے وہ درج ذیل ہیں۔

پھل اور سبزیاں:

پھل اور سبزیاں بھی ہماری خوراک کا ایک اہم جزو ہیں۔ ہمارے جسم میں ان کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سبزیاں اور پھل قدرتی پیداوار ہونے کے سبب دنیا کے اکثر ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں اور ممالک میں زمین کی تاثیر مختلف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک جگہ پر پائے جانے والے پھل اور سبزیاں دوسری جگہ پر پائے جانے والے پھلوں اور سبزیوں سے اپنے رنگ، ذائقے اور جسامت کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔

کیلا بہت ہی خوش ذائقہ اور میٹھا پھل ہے۔ یہ پھل پاکستان سمیت دنیا کے اکثر ممالک میں پایا جاتا ہے اور بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔ انشا کو پرتگال اور یونان قیام کے دوران وہاں کے کیلے کھانے کا موقع بھی ملا۔ وہ بتاتے ہیں کہ کیلے تو میں نے چار و ناچار کھا لیے لیکن مجھے وہاں کے کیلوں کا ذائقہ ذرا بھی بھلا معلوم نہ ہوا بلکہ یوں لگا جیسے میں کیلا نہیں بلاٹنگ پیپر چبا جا رہا ہوں۔ ہاں بلاٹنگ پیپر اور اس کیلے میں اگر کوئی فرق تھا تو وہ صرف یہ کہ بلاٹنگ پیپر میں مٹھاس بالکل نہیں ہوتی اور اس میں ہلکی سی مٹھاس محسوس کی جا سکتی تھی۔ وہ اپنے ملک میں پائے جانے والے کیلوں کے ذائقے سے تو بخوبی واقف تھے۔ جب وہ یونان اور پرتگال کے کیلوں کا تقابل پاکستان کے کیلوں سے کرتے ہیں تو انھیں اپنے ملک میں پائے جانے والے کیلے ذائقے اور مٹھاس دونوں اعتبار سے ان ممالک میں پائے جانے والے کیلوں سے بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ پھر وہ پرتگال اور یونان میں پائے جانے والے کیلوں کا تقابل پاکستان میں پائے جانے والے آلوؤں سے کرتے ہیں تو انھیں اپنے ملک میں پائے جانے والے آلو بھی غذائیت کے اعتبار سے ان ممالک کے کیلوں سے بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ انشا نے

پاکستان میں پائے جانے والے پھلوں اور سبزیوں کو یونہی نہیں سراہا واقعی ہماری زمین میں ایسی تاثیر ہے کہ اس میں پیدا ہونے والے پھل اور سبزیاں اپنے ذائقے اور غذائیت کے لئے دنیا بھر میں اپنی شہرت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اکثر ممالک میں پاکستانی پھلوں اور سبزیوں کی بہت مانگ ہے اور لوگ پاکستانی چیز کہہ کر طلب کرتے ہیں۔

بہر حال انشا کو پرتگال، یونان اور پاکستان کے پھلوں اور سبزیوں کے تقابل میں زیادہ تر اختلاف کے پہلو ہی نظر آئے۔

کھانے:

قدیم دور کا انسان خوراک کو بغیر پکائے ہی استعمال کیا کرتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دیگر علوم وفنون کی طرح وہ پکانے کے فن سے بھی آشنا ہوا۔ اس فن کی بدولت دنیا میں انواع واقسام کے لذیذ اور خوش ذائقہ کھانے اور بھات بھات کے پکوان وجود میں آنے لگے اور انسان نے اپنے دستر خوان کو بڑھانا شروع کر دیا۔ یورپ اور امریکہ کی سیاحت کے دوران انشا نے جہاں اس خطے کے پھلوں اور سبزیوں سے لطف اٹھایا وہیں اس خطے میں کھائے جانے والے کھانوں سے بھی لطف اٹھایا۔ انشا کو یہ جان کر بڑی حیرانی ہوئی کہ پاکستان اور انگلستان میں کچھ کھانے ایسے بھی ہیں جو اپنی ظاہری شکل و ہیت اور اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے بھی بالکل ایک جیسے ہیں۔ اگر ان کھانوں میں اختلاف کی کوئی صورت موجود ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ دونوں جگہ ان کے نام مختلف ہیں۔ اس بات کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب لندن قیام کے دوران انھیں کوئینز وے اسٹیشن جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں پہنچ کر انھیں شدید بھوک محسوس ہوئی، کوئینز وے اسٹیشن کے قریب ہی ایک کونے میں وِمپی نام کی کوئی چیز فروخت کی جا رہی تھی، انشا بتاتے ہیں کہ قریب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو برگر سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے۔ جب وہ کوئینز وے اسٹیشن کے قریب بکنے والی وِمپی اور کراچی کے ریو سینما کے قریب فروخت ہونے والے برگر کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں اشیاء میں اشتراک کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ اشتراکات کا ذکر کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ وِمپی اور برگر دونوں میں کباب اور بن ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جب انھوں نے وِمپی کے بنانے اور پیشکش کرنے کے سارے مراحل کا بغور مشاہدہ کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ ان دونوں کھانوں کے اجزائے ترکیبی، شکل وہیئت، بنانے کے طریقۂ کار اور پیشکش کے انداز میں بھی اشتراک کے پہلو موجود ہیں۔ یوں انشا کو پاکستانی برگر اور لندن کے کھانے وِمپی میں اشتراک کی کئی صورتیں نظر آئیں۔

بہر حال انشا نے یورپی ممالک میں پائے جانے والے پھلوں اور کھانوں کا تقابل پاکستان میں پائے جانے والے پھلوں، سبزیوں اور کھانوں سے کیا تو اس تقابل میں انھیں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

طرزِ زندگی

ہر انسان کا طرز زندگی دوسرے انسان سے مختلف ہوتا ہے اسی طرح ایک قوم کا طرز زندگی بھی دوسری قوم سے

مختلف ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے سفر کے دوران انشا کو ان ممالک کے لوگوں کے طرزِ زندگی کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوئیں جن کا تقابل انھوں نے پاکستانی لوگوں کے طرز زندگی سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو واضح کیا۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کو مختلف عنوانات کے تحت بیان کیا جاتا ہے۔

ا۔ اپنا کام خود کرنا:

اپنا کام خود کرنا اچھی عادت ہے۔ انشا کو پاکستان اور یورپ کے طرزِ زندگی میں ایک اختلاف تو یہ نظر آیا کہ وہاں ہر شخص کو اپنا ہر کام خود کرنا پڑتا ہے جبکہ پاکستان میں نوکر، ملازم، خانساموں یا آیا جیسی سہولیات موجود ہوتی ہیں۔ انشا بتاتے ہیں کہ لندن جا کر مجھے یہ پتا چلا کہ وہاں خواہ مرد ہوں یا خواتین، سب کو اپنے سارے کام خود کرنا پڑتے ہیں۔ اگر کوئی مرد ہے تو اسے فائل پر لکھنے کے بعد خود ہی اسے دوسرے اہلکار کو دینا پڑتا ہے اور خاتون خانہ کو بھی اپنے تمام گھریلو کام خود کرنے پڑتے ہیں کیونکہ وہاں نوکرانی، ملازمہ یا دھوبن نام کی چیزیں نہیں ہوتیں۔ اس لیے اگر کسی پاکستانی کو جسے اپنے ملک میں نوکروں اور ملازموں کی عادت ہو لندن رہنا پڑ جائے تو اسے اپنے نوکر بار بار یاد آتے ہیں جیسے انشا کے دوست سیّد سبط حسن ''ہائے بشیرا ہائے بشیرا'' کہا کرتے تھے۔ ملازموں کی عزت و احترام کے حوالے سے البتہ انھیں پاکستان اور یورپ میں یہ اختلاف نظر آیا کہ ہمارے ہاں تو انھیں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا لیکن یورپ میں انھیں بہت عزت و احترام دیا جاتا ہے اور صرف اجرت دے کر ان پر احسان نہیں کیا جاتا۔

۲۔ جدید سہولیات سے استفادہ کرنا:

ولایت قیام کے دوران انشا کو اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ وہاں سائنسی ترقی کے باعث جدید سہولیات اور مشینوں کا استعمال عام ہے۔ جبکہ ہمارا ملک چونکہ سائنسی ترقی کے لحاظ سے بہت پیچھے ہے اس لئے یہاں جدید سہولیات اور مشینوں کا استعمال عام نہیں ہے۔ اس کے علاوہ انھیں پاکستان اور امریکہ کے لوگوں میں یہ اختلاف بھی نظر آیا کہ امریکہ کے لوگ جدید ترین اشیاء کو استعمال کرتے ہیں جبکہ ہم پرانی اشیاء ہی کا استعمال کرتے ہیں۔ انشا بتاتے ہیں کہ امریکہ میں ۱۹۶۸ ماڈل کی کاروں کو بھی ردی کے بھاؤ بیچ دیا جاتا ہے اور اس سے پرانی کو تو لوگ کوڑے کے ڈھیر پر چھوڑ آتے ہیں۔ جبکہ پاکستان کا حال یہ ہے کہ یہاں تو لوگوں کے پاس اول تو گاڑی ہی نہیں ہے اور اگر کسی کے پاس پرانی گاڑی بھی ہو تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتا۔ اس سلسلے میں وہ اپنے دوست باری صاحب کی مثال دیتے ہیں جو ۱۹۲۹ء ماڈل کی فورڈ میں بھی پیدل چلنے والوں کو حقارت سے دیکھتے تھے۔ اس کے علاوہ انشا یہ بھی بتاتے ہیں کہ یورپ میں تقریباً ہر کام مشین سے کیا جاتا ہے۔ اس بات کا اندازہ انھیں لندن قیام کے دوران ہوا، جہاں انھوں نے ایک ایسی مشین دیکھی جو مالش کی غرض سے بنائی گئی تھی۔ اس مشین کی نوعیت کے بارے میں بتاتے ہیں کہ دراصل ایک ڈبا تھا جس کے دو بٹن تھے، ایک بٹن

دبانے پر اوہسکی نکل آئی اور دوسرا بٹن دبانے سے ایک اور ڈبا نکل آتا جس کا نام مساج بوائے تھا اس ڈبے پر ایک تحریر لکھی گئی تھی۔ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد انشا نے ایک فرانک اس میں ڈالا اور پلنگ پر دراز ہو گئے۔ ان کے لیٹتے ہی مشین نے تیزی سے چلنا شروع کر دیا لیکن جونہی پیسے ختم ہوئے مشین بھی بند ہو گئی۔ ان کو اس مشین میں مالش کروا کر ذرا بھی مزا نہ آیا کیونکہ ان کی ذرا بھی تسلی نہ ہوئی تھی۔ انھیں لاہور کے ٹی ہاؤس میں کی جانے والی مالش اس مالشیا مشین سے کہیں بہتر لگی کیونکہ یہاں مالش والا جسم کی تھکان اتارنے کے لئے جسم کے ایک ایک حصے کو دباتا اور رگڑتا تھا جس سے مالش کرانے والے کو سکون ملتا تھا۔

۳۔ صفائی:

انشا نے یورپ اور امریکہ کے سفر کے دوران ان ممالک کے لوگوں کے طرز رہن سہن میں صفائی کی صورتحال کا جائزہ بھی لیا اور اس سلسلے میں آنے والے اشتراکات اور امتیازات کی وضاحت بھی کی۔ جب انشا صفائی کے حوالے سے پاکستان، انگلستان، جرمنی اور ہالینڈ کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں رخ ہی نظر آتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ لندن میں صفائی کے سلسلے میں بنائے گئے قوانین کی پابندی کی جاتی ہے اس لئے وہاں تھوکنے اور سڑکوں پر کاغذ پھینکنے پر پابندی ہے جبکہ ہالینڈ میں ایسا کرنے کی آزادی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اگر ہالینڈ میں بارش ہو جائے تو وہاں کیچڑ نظر آتا ہے اور جب گاڑیاں گزرتی ہیں تو راہگیروں پر چھینٹے بھی پڑتے ہیں۔ انشا بتاتے ہیں کہ اگر جرمنی یا انگلستان میں کوئی شخص گھر بناتا ہے تو اسے پہلے اس کے گرد ایک پردہ کھینچنا پڑتا ہے تاکہ راہگیروں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو جبکہ پاکستان اور ہالینڈ میں اس قسم کا کوئی انتظام نہیں کیا جاتا۔ وہاں بھی ہمارے ملک کی طرح راہگیروں پر ریت، سیمنٹ، گاڑ اور کبھی کبھی اینٹیں بھی گر جاتی ہیں۔ جس سے بجائے ناگواری کے خوشی کا احساس ہوتا ہے اور اپنے وطن سے وابستہ یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہالینڈ قیام کے دوران ایک بار راہ چلتے ہوئے ان پر گارا آگرا لیکن انھیں ناگواری کا احساس نہ ہوا بلکہ اس سے اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو آئی۔ جرمنی میں صفائی کے حوالے سے انھیں اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں نظر آئیں۔

جسمانی صفائی کے حوالے سے جب انشا پاکستان اور انگلستان کے لوگوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں پتا چلتا ہے کہ مسلمان جسمانی صفائی کے لئے غسل کرنا ضروری سمجھتے ہیں جبکہ انگریز قوم غسل نہیں کرتی۔ ان لوگوں کو جب اپنے جسم سے بدبو آئے تو زیادہ سے زیادہ یہ لوگ پاؤڈر یا عطر چھڑک لیتے ہیں۔

بہر حال انشا کو پاکستان، انگلستان، جرمنی اور ہالینڈ کے باشندوں کے طرز زندگی میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

سیاسی نظام

انشا نے مختلف ملکوں کے سفر کے دوران وہاں کے سیاسی نظام کا مطالعہ بھی کیا۔ جب وہ پاکستان اور انگلستان کے سیاسی نظام کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ملکوں میں بادشاہی طرز حکومت رائج تھا۔ برطانیہ سمیت کئی مسلم ملکوں میں تو یہ نظام اب بھی رائج ہے البتہ پاکستان میں اب یہ نظام رائج نہیں ہے۔ جہاں بھی اس طرز کا نظام حکومت رائج ہوتا ہے وہاں کے عوام بادشاہوں کا دل جیتنے کے لئے بہت سی تقریبات منعقد کرتے ہیں مثلاً سلور جوبلی اور گولڈن جوبلی وغیرہ۔ اس قسم کی تقریبات برطانیہ میں بھی منعقد کی جاتی ہیں اور پاکستان میں بھی۔ اس تقریب کے حوالے سے ان دونوں ممالک میں اختلاف یہ ہے کہ متحدہ ہندوستان جس کا پاکستان بھی پہلے ایک حصہ تھا میں ملکہ وکٹوریہ اور دیگر سربراہوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایسی تقریبات منائی جاتی تھیں لیکن اب یہ تقریب صرف شعراء کرام کے یوم پیدائش اور یوم وفات تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں البتہ برطانیہ میں اب بھی یہ تقریب کا انعقاد صرف بادشاہوں اور ملکاؤں کے دل جیتنے تک ہی محدود ہے۔ جب انشا پاکستان اور انگلستان میں منعقد کی جانے والی اس تقریب کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس تقریب کے انعقاد کے حوالے سے بھی دونوں جانب اختلاف نظر آتا ہے کیونکہ پاکستانی لوگ ان تقاریب کو بڑے دھوم دھام سے مناتے ہیں جبکہ انگریزوں کے ہاں ایسے مواقع پر ایسا جوش وخروش دکھائی نہیں دیتا۔ انشا مزاحیہ لب و لہجے میں کہتے ہیں کہ انگریز تو ابھی تک اپنی ملکہ کی سلور جوبلی مناتے ہیں ہمارے ہاں اگر بادشاہت قائم نہیں تو کیا ہوا بہادر شاہ ظفر کا ایک وارث تو موجود ہے، لوگوں کو چاہیے کہ اسی کی سلور جوبلی منالیں۔ انشا کو انگریزوں کے طرز عمل میں ایک اختلاف یہ بھی نظر آیا کہ ایک طرف تو یہ اپنی ملکہ کی سلور جوبلی منا کر ان سے محبت وعقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور دوسری طرف میگنا کارٹر نامی معاہدے کے ذریعے ہر سال ان کے اختیارات میں کمی کر دیتے ہیں۔ انشا کو پاکستان اور انگلستان کے سیاسی نظام میں جہاں اور بہت سے اختلاف نظر آئے وہیں ایک اختلاف بادشاہوں کے ناموں کے حوالے بھی نظر آیا کہ ان کے ناموں میں اختلاف کا پہلو موجود ہے۔ اس اختلاف کو انھوں نے سفر نامہ نگری نگری پھرا مسافر کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

> ''انگریزوں کو بادشاہ تو ملتے تھے لیکن ان کے نام نہیں ملتے تھے لہٰذا ایک دو نام لے کر ان پر نمبر شمار ڈالتے رہتے تھے۔ ہمارے ہاں ہمنامی کا چکر زیادہ نہیں۔ یوں خاندان مغلیہ کے آخری دنوں میں ایک آدھ اکبر بادشاہ یا اکبر ثانی ہوا یا ایک دو شاہ عالم یکے بعد دیگرے ہوئے۔ ورنہ بادشاہ کیسا بھی ہو نام اس کے لئے ڈھونڈ ڈھونڈ کر عمدہ اور فصیح وبلیغ لاتے تھے۔ فرخ سیر، رفیع الدولہ، رفیع الدرجات وغیرہ۔''[7]

انشا جب پاکستان اور انگلستان کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں ان دونوں ممالک میں یہ اشتراک بھی نظر آیا کہ ان کی تاریخ میں حالات وواقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر برطانیہ کے دو بادشاہوں ایڈمنڈ اور

شاہ کینوٹ کے بارے میں جو کچھ ان کی تاریخ میں درج ہے اس پر سب کا اتفاق نہیں ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں بھی جہانگیر، نور جہاں اور شیر افگن کے بارے میں جو کچھ درج ہے اس میں بھی سو فیصد حقیقت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ انھیں یہ اشتراک بھی نظر آیا کہ ان دونوں ملکوں کے حکمران طاقت کے بل بوتے پر اقتدار حاصل کرتے ہیں اور اسی کی بدولت اس پر براجمان رہتے ہیں۔ ان دونوں ملکوں میں اس حوالے سے بھی اشتراک موجود ہے کہ ان کے ہاں بادشاہت کا سلسلہ نسل در نسل چلتا ہے البتہ ہمارے ہاں کی قدیم داستانوں سے یہ پتا چلتا ہے کہ اگر بادشاہ کی اولاد نہ ہو تو پھر کسی بھی ایسے اجنبی شخص کو بادشاہ بنایا جاسکتا ہے جو دارالخلافے میں سب سے پہلے داخل ہو۔ جبکہ انگلستان میں چونکہ شہر کے گرد دروازے اور فصیلیں نہیں ہیں اس لئے وہاں کسی اجنبی شخص کو بادشاہ نہیں بنایا جا سکتا۔ آنشا کو پاکستان اور انگلستان کے سیاسی نظام میں یہ اشتراک بھی نظر آیا کہ ان دونوں ملکوں کے لوگ حکمرانوں کو خوش کرنے کے لئے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے تھے ان کی منزل پھانسی گھاٹ ہوتی تھی۔ جو لوگ حکمرانوں کا دل جیت لیتے وہ بڑے بڑے عہدے اور خطابات حاصل کرتے، انگریزوں نے نہ صرف اپنے ملک میں لوگوں کو لارڈ اور نائٹ جیسے خطابات دیئے بلکہ ہمارے ہاں بھی جب تک ان کا اقتدار قائم رہا وہ لوگوں کو خان بہادر، خان صاحب اور اہل علم کو شمس العلماء جیسے خطابات نوازتے رہتے تھے۔ انھیں یہ اشتراک بھی نظر آیا کہ ان دونوں ملکوں کے کچھ لوگ حکمرانوں کو پٹیاں پڑھاتے رہتے ہیں اور حکمران انھی کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں ملکوں میں مسائل کے حل کے لئے گول میز کانفرنس کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔ برطانیہ میں پہلی گول میز کانفرنس کنگ آرتھر نے منعقد کروائی جس میں وہ سر لانسیلاٹ کے ساتھ ملکی معاملات پر بات چیت کیا کرتے تھے اور ہمارے ہاں بھی صدر ایوب گول میز کانفرنس میں منعقد کروا کر ملکی معاملات پر گفت وشنید کیا کرتے تھے۔

بہر حال آنشا کو پاکستان اور انگلستان کے سیاسی نظام میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

معاشی نظام

کسی ملک کی خوشحالی کا دارومدار وہاں کے معاشی نظام پر ہوتا ہے۔ کسی ملک کے معاشی استحکام اور عدم استحکام کا انحصار بہت سی باتوں پر ہوتا ہے جن میں کرنسی کی قدر و قیمت، افراط زر کی شرح اور مہنگائی میں کمی یا زیادتی وغیرہ شامل ہے۔ آنشا نے یورپ اور امریکہ کے سفر کے دوران ان ممالک کی معیشت اور معاشی استحکام کے بارے میں معلومات اور کوائف اکٹھے کیے اور ان کا تقابل پاکستان کے معاشی نظام سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کے پہلوؤں کی وضاحت بھی کی۔ آنشا کو پاکستان، یورپ اور امریکہ کے معاشی نظام میں اشتراک اور اختلاف کے جو پہلو نظر

آئے وہ درج ذیل ہیں۔

آج دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف نوع اور سائز کر کرنسیاں استعمال کی جا رہی ہیں۔ پرانے وقتوں میں جب کرنسی کا وجود نہیں تھا تو لوگوں کو لین دین میں بہت دشواری پیش آتی تھی، وہ زیادہ تر اشیاء کے تبادلے سے ہی باہمی لین دین کیا کرتے تھے۔ انشانے کئی بار انگلستان کا سفر اختیار کیا۔ وہاں قیام کے دوران انھوں نے اس ملک میں رائج کرنسیوں کی کرنسی کی قدر و قیمت، نوعیت اور ہیئت کے بارے میں بھی معلومات اکٹھی کیں۔ جب وہ پاکستان اور انگلستان کی کرنسی کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کرنسیوں میں وزن اور قدر و قیمت کے حوالے سے اختلاف کا پہلو موجود ہے اس اختلاف کو انشانے سفر نامہ *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

''ہاں سکے کا مسئلہ ہمیں ضرور پیش آیا۔ انگلستان والوں نے ہمارے پچھلے سفر اور اس سفر کے درمیان اپنے سکے بدل دیئے ہیں یعنی اعشاریہ کر دیئے ہیں۔ شلنگ کو تو بالکل نکال باہر کیا۔ ہم شلنگ کا نام لیتے تھے تو لوگ پوچھتے تھے شلنگ کیا ہوتا ہے؟ اس کے علاوہ پینی Wise ہو گئی اور پونڈ Foolish ہو گیا یعنی جو پینی ایک اکنی کی ہوتی تھی اب وہ ڈھائی آنے کی ہے اور پونڈ میں اب اس چیز کو ہم فقط دور سے دیکھ سکتے ہیں۔ جسے پہلے خرید سکتے تھے۔ پھر ہم جو پونڈ کی قیمت اپنے سکے کے حساب سے گنتے ہیں۔ پہلے نئے پنس کو پرانے شلنگوں میں بدلتے ہیں۔ پھر شلنگ کو روپے آنے پائی میں منتقل کرتے ہیں کہ قیمت کا اندازہ ہو جائے۔ بعض اوقات اس میں اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ دکاندار کا سودا بک جاتا ہے اور ہمیں سکندر کی طرح دکاندار سے خالی ہاتھ آنا پڑتا ہے۔ یہ نئے سکے بھاری بھی بہت ہیں، خصوصاً ہم ایسے ہلکی جیب والے کو تو بہت بھاری معلوم ہوتے ہیں۔ پانچ سات پونڈ کی ریزگاری کے لئے کسی نہ کسی جانور کی ضرورت پڑتی ہے۔ بھاری ہونے کا ایک فائدہ ہے کہ اس سے کبھی کبھی جان بچ جاتی ہے۔ آئرستان کے ہنگاموں میں ایک روز لنڈن ڈیری میں ایک شخص کے گولی لگی لیکن اس کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ گولی جیب میں دس پینی کے سکے پر پڑی اور اچٹ کر رہ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جس کے پاس پیسہ ہے اس کو گولی کا بھی ڈر نہیں۔'' [8]

درجہ بالا حوالے میں انشانے پاکستانی کرنسی روپے، آنے اور اکنی کا تقابل انگلستان کی کرنسی پونڈ، شلنگ اور پینی سے کر کے یہ واضح کیا ہے کہ انگلستان کی کرنسی کی قدر و قیمت پاکستانی کرنسی سے زیادہ ہے۔ پھر انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان دونوں کرنسیوں کے وزن میں بھی اختلاف کا پہلو موجود ہے۔ پاکستانی کرنسی کا وزن کم ہے جبکہ انگلستان کی کرنسی کا وزن زیادہ ہے۔ ایک جگہ وہ پاکستان اور انگلستان کی کرنسی کا تقابل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک بلین سوملین کے برابر ہوتا ہے اور اگر میرے حساب میں کوئی غلطی نہ ہو تو اس میں 45 کروڑ پونڈ اور سات ارب 65 کروڑ روپے ہوتے ہیں۔ یوں اس تقابل سے بھی انھوں نے پاکستان اور انگلستان کی کرنسی کی قدر و قیمت میں اختلاف کی وضاحت کی ہے۔

کسی ملک کے معاشی حالات کا اندازہ وہاں پر مہنگائی کی شرح میں ہونے والی کمی یا اضافے سے بھی لگایا جا سکتا

ہے۔انگلستان ایسا ملک ہے جہاں انشا نے متعدد بار سفر کیا، وہ بتاتے ہیں کہ میں نے ۱۹۶۹ء،۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں انگلستان کا سفر کیا اور ہر بار مہنگائی کو پہلے سے بڑھ کر پایا لیکن ۱۹۷۱ء میں تو یہاں کے لوگ بھی مہنگائی کے ہاتھوں پریشان تھے۔وہ بتاتے ہیں کہ ۱۹۷۰ء میں جب وہ انگلستان گئے تو وہاں ایک سروے رپورٹ شائع کی گئی جس میں سال ۱۹۶۹ء میں گھریلو صارفین کے اخراجات کی اوسط تفصیلات یوں درج کی گئی تھیں۔

کھانے پینے پر ہونے والے اخراجات:	۲۰فی صد
رہائش، ایندھن اور بجلی کی مد میں ہونے والے:	۱۷ء۶۵فی صد
آمدورفت اور تفریح پر اٹھنے والے اخراجات:	۱۹ء۶۴فی صد
نشہ آور اشیاء مثلاً تمباکو اور شراب وغیرہ:	۱۲ء۶۳فی صد
گھریلو سامان کی مد میں ہونے والا خرچ:	۱۳ء۶۵فی صد
کپڑوں اور جوتوں پر ہونے والے اخراجات:	۸ء۶۴فی صد
کار اور موٹر سائیکل پر ہونے والے اخراجات:	۸فی صد

انشا بتاتے ہیں کہ سروے میں یہ بات بھی بتائی گئی تھی کہ اس سال یعنی ۱۹۶۹ء میں تنخواہوں میں ساڑھے ۷ فیصد اضافہ کیا گیا ہے۔البتہ اس اضافے کا ۷ فیصد مہنگائی ہی کی نذر ہو گیا۔یوں وہاں کے لوگوں کو تنخواہ میں اس اضافے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔وہ بتاتے ہیں کہ وہاں کے بازاروں میں بھی ہمارے ہاں کے بازاروں کی طرح قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے کرنسی اپنی قدر کھوتی جا رہی ہو۔بیروزگاری بڑھ رہی تھی البتہ یہاں بیروزگاروں کو الاؤنس دیا جاتا ہے جبکہ پاکستان میں بیروزگاروں کو اس سہولت سے بھی محروم رکھا جاتا ہے۔انگلستان کے لوگوں کے اخراجات کی تفصیل پڑھ کر انھیں یہ پتا چلا کہ یہاں کے لوگوں کے اخراجات پاکستانی عوام سے زیادہ ہیں۔انگلستان میں تو لوگ تفریحات کے ساتھ ساتھ نشہ آور اشیاء کی مد میں بھی خرچ کرتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں تو لوگ صرف دال، روٹی اور سر چھپانے کی جگہ ہی کو کافی سمجھتے ہیں۔ بہر حال انشا کو پاکستان اور انگلستان کے معاشی نظام کے تقابل میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔اشتراک کی صورت تو انھیں یہ نظر آئی کہ دونوں ممالک میں مہنگائی بہت زیادہ ہے جس کے سبب اشیاء کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور دوسرے یہ کہ بازاروں میں خریداری کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے جیسے اس کرنسی کی کوئی قدر ہی نہیں رہی۔اختلافات کے پہلو انھیں یہ نظر آئے کہ ان دونوں ممالک کی کرنسیوں کی قدر و قیمت اور وزن میں اختلاف کا پہلو موجود ہے۔اس کے علاوہ وہاں بیروزگاروں کو الاؤنس بھی دیا جاتا ہے اور سروے رپورٹ سے انھیں اس بات کا اندازہ بھی ہوا کہ پاکستان اور انگلستان کے لوگوں کی بنیادی ضروریات میں بھی اختلاف کا پہلو موجود ہے۔

انشا کی دفتری مصروفیات نے انھیں امریکہ قیام کے سفر کے مواقع بھی فراہم کیے۔ انھوں نے پاکستان اور امریکہ کے معاشی نظام کا تقابل بھی کیا گو کہ اس تقابل کا دائرہ زیادہ تر مہنگائی تک ہی محدود رہا البتہ اس تقابل میں انھوں نے جرمنی کو بھی شامل کرلیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ جنیوا قیام کے دوران مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ یہاں اشیائے خورد ونوش کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک تو یہاں مجھے حرام وحلال جیسے مسائل کا سامنا رہا۔ جس کے باعث بھیڑ اور بکرے کے گوشت سے تو میں اجتناب ہی کرتا رہا اور سبزیوں کی قیمتیں قوت خرید سے ہی باہر تھیں، لے دے کے ایک مرغ ہی رہ جاتا تھا لیکن اس کی قیمت بھی کچھ کم نہ تھی بہر حال مجبوراً اسی پر اکتفا کرنا پڑا۔ جب انشا مرغ کی قیمت کے حوالے سے پاکستان، جرمنی اور امریکہ کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ان تینوں جگھوں اس کی قیمت کے حوالے سے خاصا اختلاف نظر آتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان میں مرغ کی ایک ٹانگ کی قیمت پانچ سے سات روپے تھی، جرمنی کے ہرٹی ڈیپارٹمنٹل سٹور میں اس کی قیمت ڈھائی مارک تھی۔ البتہ جنیوا میں روز بروز بڑھنے والی مہنگائی کے سبب اس کی کوئی ایک قیمت مقرر نہ تھی کہ ایک دن میں نے مرغ کی ٹانگ ساڑھے پانچ فرانک میں خریدی اور دوسرے دن یہی ٹانگ چھ میں ملی۔ یوں مرغ کی قیمت کے حوالے سے انھیں پاکستان، امریکہ اور جرمنی میں خاصا اختلاف نظر آیا اور یہ بھی پتا چلا کہ امریکہ میں اس کی قیمت سب سے زیادہ ہے اور پاکستان میں باقی ممالک کے مقابلے میں کم۔

بہر حال انشا کو پاکستان اور انگلستان کے معاشی نظام میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔ البتہ جب انھوں نے مہنگائی کے حوالے سے پاکستان، جرمنی اور امریکہ کا تقابل کیا تو اس تقابل میں انھیں صرف اختلاف کا پہلو ہی نظر آیا۔

تعلیمی نظام

انشا نے مختلف ممالک کے سفر کے دوران جہاں دیگر حوالوں سے معلومات حاصل کیں وہیں وہاں کے نظام تعلیم کے بارے میں معلومات بھی حاصل کیں۔ انھوں نے پاکستان اور انگلستان کے نظام تعلیم میں جو اشتراکات اور اختلافات محسوس کیے انھیں ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

انشا نے انگلستان قیام کے دوران وہاں کے تعلیمی نظام کا تقابل بھی کیا۔ وہ بتاتے ہیں وہاں طالب علموں سے او ایل کا ٹیسٹ لیا جاتا ہے جس سے ان کے طبعی رجحان کا پتا چل جاتا ہے جبکہ ہمارے ہاں اس قسم کے ٹیسٹ نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں جس شخص میں اچھا خانساماں بننے کی صلاحیت ہوتی ہے اسے شاعر بننے پر مجبور کر دیا جاتا ہے اور جو شاعر بن سکتا ہے اسے خانساماں بنا دیا جاتا ہے۔

انشا نے انگلستان قیام کے دوران وہاں کی لائبریریوں کا سروے بھی کیا اور وہاں موجود کتابوں پر بھی ایک

سرسری نگاہ ڈالی۔ جس سے انھیں یہ اندازہ ہوا کہ وہاں کی لائبریریوں میں کتابیں تلاش کرنا آسان ہے جبکہ ہمارے ہاں یہ کام بے حد مشکل۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ وہاں کتابوں کی فہرست بندی کا طریقہ بہت آسان ہے کیونکہ یہ لوگ مصنفین کے ناموں میں نہ تو ردوبدل کرتے ہیں اور نہ ہی ان میں کوئی اضافہ کرتے ہیں جس کے باعث انھیں تلاش کرنا آسان ہوتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں کتابوں کی فہرست بندی کا نظام بہت پیچیدہ اور وقت طلب ہے کیونکہ اس میں مصنف کے نام کا اندراج کرتے ہوئے اول تو اسے جوں کا توں درج نہیں کیا جاتا اور دوسرے اصل نام کے ساتھ علاقے کا نام اور القابات کا اضافہ بھی کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر غالب کی کتب کو غالب کی بجائے اسد اللہ خان کے تحت درج کیا جاتا ہے اور پھر آگے چل کر یہ بھی لکھ دیا جاتا ہے کہ موصوف غالب بھی کہلاتے تھے۔ یوں ہمارے ہاں کسی لائبریری سے کتاب تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اگر کسی انگریز کو ہمارے ملک کی لائبریری میں کتاب ڈھونڈنے کا کہا جائے تو اسے یہ کام جوئے شیر لانے کے برابر لگے۔

اس کے بعد انشا پاکستان اور یورپی ممالک کے تعلیمی نصاب کا تقابل کرتے ہیں تو اس تقابل میں بھی انھیں اختلاف کا پہلو ہی نظر آتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ یورپی ممالک کے تعلیمی نصاب میں سائنسی علوم کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے جبکہ ہمارے ہاں شعروشاعری کو۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں خود شعر کہنے اور دوسروں کے اشعار پر داد دینے کی روایت بہت پرانی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہم نے اپنے اساتذہ سے علم الکلام کے رموز تو سیکھ لیے لیکن سائنسی علوم سے ناواقف رہے۔ وہ اہل مشرق اور اہل مغرب کا تقابل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب کپلر اور گیلیلیو آسمان کو تسخیر کر رہے تھے تو ہمارے ہاں اس وقت شعروشاعری اپنے زوروں پر تھی، جب واٹ اور اسٹیفن بھاپ کو تسخیر کر رہے تھے تو ان دنوں شاہ نصیر قافیہ پیمائی میں مصروف تھے۔ اسی طرح جب ایڈیسن اور مارکونی بجلی اور آواز پر تحقیق کر رہے تھے تو ان دنوں ہمارے ہاں شعری گلدستے فتنہ اور عطرِ فتنہ شائع کیا جا رہا تھا، جب رائٹ برادران جہاز بنا رہے تھے تو ہم لوگ لفظوں سے کھیل رہے تھے۔ علم فلکیات کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اب اگر روس اور امریکہ کو اس میدان میں ہم پر سبقت حاصل ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی خود ہماری توجہ دوسرے علوم کی طرف ہے ورنہ ہمارے بزرگ تو ستاروں اور سیاروں کو دیکھے بغیر ہی ان کی قسمت کا حال بنا دیا کرتے تھے۔ بلکہ ہمارے ہاں تو ہر سال اس موضوع پر مختلف تصانیف اور جنتریاں بھی چھپتی ہیں جن میں قسمت کا حال جاننے کے علاوہ صابن سازی، بوٹ پالش اور خضاب تیار کرنے کے نسخے بھی ہوتے ہیں۔ یہی نہیں صنعت و حرفت کے میدان میں بھی ہم بہت آگے ہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ ہمارے ہاں یہ لفظ زبان و بیان کی باریکیاں بیان کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یورپ میں یہ لفظ اور معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ انشا بتاتے ہیں کہ مشرق اور مغرب کی نوجوان نسل کے صرف تعلیمی نصاب میں ہی فرق نہیں ہے بلکہ ان کے کھلونوں میں بھی فرق ہے۔ اس بات کا اندازہ انھیں جرمنی کے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں کھلونوں کی دکان کو دیکھ کر ہوا۔ اس ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں کھلونوں

اور پاکستان میں موجود کھلونوں کو دیکھ کر انھیں ان میں اختلاف کا ایک پہلو نظر آیا۔ اس اختلاف کو انھوں نے سفر نامہ آوارہ گرد کی ڈائری کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

"ایمسٹرڈم میں اور برلن میں ایسے ڈپارٹمنٹل اسٹور دیکھے کہ پوری منزل میں کھلونے ہی کھلونے ہیں۔ ان میں گڑیاں گڈے بھی ہیں۔ لیکن تمام مشینوں کے ماڈل بھی دیکھے جن سے پتہ چلے کہ پسٹن کیا ہوتا ہے، گیئر کیسے کام کرتے ہیں، ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے۔ یہی التزام یہاں کی کتابوں اور کورسوں میں ہے۔"[9]

درجہ بالا حوالے میں انشا نے یہ واضح کیا کہ مغربی ممالک میں بچوں کو کھیل ہی کھیل میں سائنسی معلومات فراہم کی جاتی ہیں جبکہ ہمارے ہاں صرف قصے، کہانیاں اور المیہ شاعری پر زور دیا جاتا ہے۔

بہر حال انشا کو تعلیم اور اس سے متعلقہ حوالوں سے پاکستان، جرمنی، ہالینڈ، انگلستان اور دیگر ممالک میں زیادہ تر اختلاف کے پہلو ہی نظر آئے۔

ذرائع آمد و رفت

انسانی زندگی سفر سے عبارت ہے۔ شروع میں انسان پیدل ہی سفر کیا کرتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جوں جوں اس نے ترقی کی ویسے ہی تبدیلی اس کے ذرائع آمد و رفت میں آنے لگی۔ انشا نے یورپ اور امریکہ کے ذرائع آمد و رفت کا بغور مشاہدہ کیا اور ان کا تقابل پاکستان میں استعمال ہونے والے ذرائع آمد و رفت سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراک اور اختلاف کی صورتوں کی وضاحت کی۔

انشا کو جرمنی، ہالینڈ اور سوئٹزرلینڈ کے سفر کے مواقع بھی ملے۔ ان ممالک میں قیام کے دوران انھیں وہاں کے ذرائع آمد و رفت میں سفر کرنے کا موقع ملا جس سے انھیں ان کو قریب سے دیکھنے اور ان کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع بھی در آیا۔ وہ پاکستان اور مغربی ممالک کے ذرائع آمد و رفت کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں پتا چلتا ہے کہ ہمارے ہاں چلنے والی بسوں، گاڑیوں اور ان کے ہاں چلنے والی بسوں اور ٹراموں کی ساخت میں بہت فرق ہے۔ ان کے ہاں استعمال ہونے والے ذرائع آمد و رفت کی ساخت میں صارفین کی سہولت اور آرام کو اہمیت دی جاتی ہے جبکہ ہمارے ہاں ایسی باتوں کو سرے سے کوئی اہمیت دی ہی نہیں جاتی۔ اس بات کا اندازہ انشا کو یہ دیکھ کر ہوا کہ وہاں چلنے والی بسوں اور ٹراموں میں صرف ایک دروازہ ہوتا ہے جس کے باعث تمام مسافروں کو اسی دروازے سے گزرنا پڑتا ہے یوں تمام مسافروں کو چارو ناچار کنڈیکٹر کے سامنے سے گزرنا پڑتا ہے، اس طرح ان کی جانچ پڑتال بھی بآسانی ہو جاتی ہے اور انھیں ٹکٹ بھی دے دی جاتی ہے۔ ان بسوں اور ٹراموں کے تمام دروازے ایک ہی بٹن سے بند ہوتے اور کھلتے ہیں اس لئے کنڈیکٹر جب چاہتا ہے ایک بٹن دبا کر تمام دروازے بند کر دیتا ہے اور جب چاہے کھول دیتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں بسوں اور گاڑیوں کے

کئی دروازے ہوتے ہیں جس سے نہ صرف چیکنگ کرنے میں دشواری پیش آتی ہے بلکہ مسافروں کو نظر بچا کر چھپ جانے کے مواقع بھی میسر آتے ہیں ۔ بہرحال انشا پاکستان اور مغربی ممالک جن میں جرمنی اور ہالینڈ شامل ہیں کے ذرائع آمدورفت کی ساخت میں اختلاف کی صورت نظر آئی۔

ذرائع آمدورفت میں بہت سی سواریاں ایسی ہیں جو پاکستان سمیت دنیا کے دیگر ممالک میں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ان میں ایک سواری ریل بھی ہے۔انشا نے یورپ اور امریکہ کے سفر کے دوران وہاں اس سواری اور اس سے متعلقہ زاویوں کا تقابل پاکستان میں اس سواری کے متعلقہ زاویوں سے کر کے ان کے درمیان اشتراکات اور اختلافات کے پہلو واضح کیے۔جب وہ پاکستان اور سوئٹزرلینڈ میں ریل کے مسافروں کے طرزِ عمل کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں نتیجے میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آتے ہیں۔اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے پہلے تو وہ یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ملک میں لوگوں کو بغیر ٹکٹ کے سفر کرنے کی عادت ہے لیکن سوئٹزرلینڈ کے مسافروں کو ایسی عادت نہیں ہے۔اس سلسلے میں وہ بتاتے ہیں کہ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ وہاں کے لوگ ویسے ہی بہت ایماندار ہوں اور دوسری وجہ غالباً یہ ہوگی کہ وہاں ٹکٹ چیکنگ کا نظام ہی اتنا سخت ہے کہ کوئی ایسی بے ایمانی کرنا چاہے بھی تو نہ کر سکے۔وہ بتاتے ہیں کہ سوئٹزرلینڈ قیام کے دوران مجھے زیورخ جانا تھا، ہر اسٹیشن پر کوئی نہ کوئی چیکر ضرور آتا اور ٹکٹ میں سوراخ کر کے چلا جاتا۔یوں کٹتے کٹتے یہ ٹکٹ زیورخ سے دو اسٹیشن پہلے ہی ختم ہوگیا اور اگلے سٹیشن پر جب چیکر نے ٹکٹ مانگا تو میں نے اپنی انگلی سامنے کردی اور بتایا کہ ٹکٹ تو چیکنگ کے دوران ہی کٹتے کٹتے ختم ہوگیا۔لہٰذا اب نشان دہی کے لئے یہ انگلی حاضر ہے یا پھر اب یہ ذمہ داری آپ کی ہے کہ مجھے ریلوے اسٹیشن سے باہر بخیریت پہنچائیں ۔انشا کو پاکستان اور سوئٹزرلینڈ کے مسافروں کے طرزِ عمل میں جہاں اختلاف کا پہلو نظر آیا وہیں اشتراک کی ایک صورت بھی نظر آئی جسے انھوں نے سفرنامہ آوارہ گرد کی ڈائری کے درج حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

> ''یہ گاڑی بھی ذرا سا چلتی تھی اور رُک جاتی تھی جیسے جھولے کی بیماری ہو۔مسافر آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے ۔ پہلے اسٹیشن سے بچے سوار ہوئے دوسرے سے دیہاتیوں کا ایک غول سیٹوں پر پھسکڑے مار کر بیٹھ گیا اور گاجریں کھانے لگے۔اب ہمیں اپنی گاڑیاں یاد آئیں۔تہمد باندھے ہوئے بڈھے ان کے بقچے اور گٹھریاں۔کسی میں گڑ، کسی میں چاول، کسی میں تمباکو، کسی نے نئی ہنڈیا یا ایلومینم کی پرات خریدی ہے۔کسی کے پاس نئی چنگیر ہے۔تولئے میں نمک کے ڈبے بندھے ہیں۔قصبے میں خریداری کرنے آئے تھے۔جن عورتوں سے سیٹوں پر بیٹھا نہیں گیا۔وہ فرش پر یا کسی ٹرنک پر بیٹھ گئیں اور بُھنے دانے نکال کر کھانے شروع کیے۔اب گاڑی کھڑی ہے اور کھڑی ہے کیونکہ کسی اور لاڈلی گاڑی کو پہلے گزرنا ہے۔ایک بڑے میاں نے فرش کے کونے کھدروں سے کاغذ اور تنکے جمع کئے۔اور فرش پر آگ جلا کر حقہ بھرا۔کوئی ہمت والا دوڑ کر گیا اور پاس کے کھیت سے گنے اکھاڑ لایا۔اور اب گاڑی کے اندر ہی چھلکوں کا ڈھیر لگ

گیا ہے۔"۱۰

درجہ بالا حوالے میں انشا کو پاکستان اور سوئٹزرلینڈ میں دیہاتی مسافروں کا طرز عمل بالکل ایک جیسا لگا۔ ہمارے ہاں کے دیہاتی مسافر جس قسم کے طرز عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں اور جس قسم کا سامان اپنے ساتھ لاتے ہیں انشا نے اس کی بالکل صحیح تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔

الغرض، انشا کو پاکستان اور یورپ کے ذرائع آمد ورفت اور اس کے متعلقہ زاویوں میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

علاج معالجہ

زندگی کی گاڑی ہمیشہ ایک رفتار سے رواں دواں نہیں رہتی بلکہ کئی بار اس میں بیماری کے باعث رکاوٹ بھی آ جاتی ہے۔ بیمار ہونے کی صورت میں انسان کو علاج معالجے کی ضرورت پڑتی ہے۔ انشا نے دوران سیاحت پاکستان اور مغربی ممالک کے ڈاکٹر حضرات کے طرز عمل، امراض وادویات کی اقسام اور علاج کے طریقۂ کار کا تقابل کیا۔ انھوں نے اس تقابلی مطالعے میں جن اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت وہ درج ذیل ہیں۔

علاج معالجے کے سلسلے میں ڈاکٹر حضرات کا طرز عمل بہت اہمیت رکھتا ہے۔ انشا نے دوران سیاحت پاکستان اور مغربی مالک کے ڈاکٹر حضرات کا تقابل بھی کیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان میں تو ڈاکٹر حضرات کسی بھی وقت مریض کا معائنہ کر لیتے ہیں اس لئے پہلے سے وقت لینا لازمی نہیں ہوتا جبکہ جرمنی، امریکہ، ہالینڈ اور انگلستان میں ڈاکٹر حضرات سے معائنے سے پہلے وقت لینا پڑتا ہے۔ اگر کوئی ہنگامی صورتحال پیش آ جائے اور ان حضرات سے مریض کا معائنہ کرنے کی درخواست کی جائے تو پھر یہ لوگ یہ کہہ کر معذرت کر لیتے ہیں کہ آپ نے چونکہ پہلے وقت نہیں لیا اس لئے آپ کا معائنہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ انشا کو پاکستان اور انگلستان کے ڈاکٹروں میں یہ فرق بھی نظر آیا کہ پاکستانی ڈاکٹر مریض کو زیادہ وقت دیتے ہیں، یہ حضرات مریض کا احوال بڑی تسلی سے سنتے ہیں، مرض کی علامات پوچھتے ہیں، غذا اور پرہیز کے بارے میں مکمل معلومات اور مشورے دیتے ہیں۔ جبکہ یورپی ممالک میں ڈاکٹر حضرات مریضوں کو زیادہ وقت نہیں دیتے صرف پرچی پر دوا لکھ کر دو منٹ میں فارغ کر دیتے ہیں۔ انشا بتاتے ہیں کہ خود مجھے علاج کے سلسلے میں لندن کے میری اسپتال جانے کی ضرورت پڑی تو مجھے وہاں کے ڈاکٹر صاحب کے معائنے سے ذرا بھی تسلی نہ ہوئی کیونکہ مجھے تو اپنا تفصیلی احوال بیان کرنے کی عادت تھی لیکن انھوں نے صرف پرچی پر دوا لکھ کر مجھے فارغ کر دیا۔ یوں انشا کو انگلستان، ہالینڈ اور جرمنی کے ڈاکٹر صاحبان کے طرز عمل میں تو اشتراک نظر آیا لیکن اسی حوالے سے پاکستان کے ڈاکٹر حضرات کے طرز عمل میں خاصا اختلاف نظر آیا اور اس اختلاف میں پاکستانی ڈاکٹر انھیں بہتر نظر آئے۔

اس کے بعد انشاؔ ڈاکٹر حضرات کی فیس اور علاج معالجے کی سہولیات کے حوالے سے پاکستان، امریکہ اور انگلستان کا تقابل کرتے ہیں تو اس تقابل میں انھیں ان تینوں ممالک میں اختلاف کا پہلو نظر آتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ انگلستان میں تو علاج معالجے کی سہولیات سب کو مفت فراہم کی جاتی ہیں لیکن پاکستان میں یہ سہولت مفت تو نہیں البتہ بہت کم قیمت پر دستیاب ہیں جبکہ امریکہ میں نہ صرف علاج معالجے کی سہولیات بہت مہنگی ہوتی ہیں بلکہ ڈاکٹر صاحبان منہ مانگی فیس کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر مریض فیس ادا نہ کر سکتا ہو تو وہ فیس پوری کرنے کے لئے اس کے گھر کا سامان تک اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ انگلستان کے اسپتالوں میں موجود اشیاء پاکستان کے اسپتالوں میں استعمال ہونے والی اشیاء کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور ترقی یافتہ اور خود کار نظام کے تابع تھیں۔ انھوں نے پاکستان اور لندن کے اسپتالوں میں استعمال ہونے والے بستروں کا موازنہ بھی کیا جس سے انھیں ان کی نوعیت اور طریقۂ استعمال میں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔ اس اختلاف کو انھوں نے سفرنامہ *نگری نگری پھرا مسافر* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

> ''بستر کی پائنتی پر کئی بٹن ہیں جو کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آئے اکثر نتیجہ خلاف منشا نکلا۔ کئی بار بلا ارادہ ہاتھ کسی بٹن پر گیا تو مشین چلنی شروع ہوگئی اور سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہوتیں چلی گئیں۔ شیطانی کارخانہ ہے ہمارے ملک کے اسپتالوں میں ہتھیلی گھما کر اوپر نیچے کرتے ہیں وہ ٹھیک ہے لیکن اس سے زیادہ آزمودہ نسخہ یہ ہے کہ جس طرف سے پلنگ اونچا کرنا ہو ادھر پایوں کے نیچے اینٹیں رکھ دی جائیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اینٹیں وقت کے وقت نہیں ملتیں، تب یہ کام کتابوں سے لیا جاتا ہے۔''[۱۱]

اس کے بعد انشاؔ پاکستان اور دیگر مغربی ممالک میں ڈاکٹروں کے طریقۂ علاج، امراض اور ادویات کو اپنے تقابلی مطالعے کا موضوع بناتے ہیں۔ علاج معالجے کے ان تینوں زاویوں کے حوالے سے انھیں صرف اختلاف کے پہلو ہی نظر آتے ہیں۔ اس اختلاف کو انھوں نے سفرنامہ *نگری نگری پھرا مسافر* کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

> ''ان انگریزوں، امریکنوں، جرمنوں کو نئے نئے مرض دریافت کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں پھر ایک مرض کے لئے دس دس دوائیں کھلواتے ہیں کہ کوئی تو کارگر ہوگی، اپریشن وغیرہ اس کے علاوہ۔ یہ نہیں کہ ایک امرت دھارا ایجاد کر لیا اسی کو کھایا۔ اسی کو لگایا اس کو پانی میں ڈال کر پی گئے اسی کو رومال میں ڈال کر سونگھ لیا۔ ہمارے ڈاکٹروں اور حکیموں نے ایسے سفوف بنا رکھے ہیں کہ قبض والے کو بھی وہی، اسہال والے کو بھی وہی، کان دکھتا ہو، پھنسی نکلی ہو، پیشاب نہ آتا ہو، پیشاب بہت آتا ہو، سر کے بال جھڑتے ہوں تو نہار منہ کھایئے۔ ورنہ پانی میں گھول کر بطور بال صفا پوڈر کے لگایئے۔ ایک صاحب تو اپنی دوا کا اشتہار دیتے ہیں کہ بواسیر اور دیگر امراض چشم کے لئے اکسیر ہے، یعنی سرمے ہمارے حکما نے ایجاد کر رکھے ہیں کہ بصارت کے علاوہ بصیرت بھی عطا کرتے ہیں انسان کو دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں۔''[۱۲]

درجہ بالا حوالے میں انشا نے اپنے ہاں کے معالجوں کے طریقۂ علاج اور ادویات کے کثیر المقاصد استعمال کو طنز و تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ جرمنی اور امریکہ میں معالج امراض کی تشخیص کے لئے اندازے کی بجائے ٹیسٹوں سے مدد لیتے ہیں اور علاج کے لئے ان کے پاس ہر مرض کی دوا موجود ہوتی ہے۔ ادویات کی دستیابی کے حوالے سے انشا کو پاکستان اور مغربی ممالک میں یہ اختلاف نظر آیا کہ وہاں ڈاکٹر حضرات مریض کا معائنہ تو کر سکتے ہیں لیکن دوا نہیں دے سکتے، دوا انھیں کیمسٹ سے ہی خریدنی پڑتی ہے جبکہ پاکستان میں صورتحال اس کے برعکس ہے۔

ادویات کے حوالے سے جہاں انشا کو پاکستان اور انگلستان میں اختلاف کا پہلو نظر آیا وہیں اس حوالے سے ایک اشتراک کی صورت بھی نظر آئی وہ یہ کہ پاکستان اور انگلستان میں جنسی امراض کی دوائیں فروخت کی جاتی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ستمبر ۱۹۷۰ء میں جب میں لندن گیا تو ان دنوں وہاں اپنے سمرز نامی خاتون کی Sex Shop کا اشتہار لندن کے تمام اخبارات میں شائع کیا گیا تھا۔ اس دکان میں جنسی امراض اور شباب رفتہ لٹانے والی ادویات کی تشہیر کی گئی تھی۔ انشا کو یاد آیا کہ ایسی ادویات تو ہمارے ہاں بھی ایک عرصۂ دراز سے فروخت ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ وہ اس دکان کی افتتاحی تقریب میں بھی گئے جہاں انھیں کوئی خاص چیز تو نظر نہ آئی صرف چند شیشیاں اور پڑیاں ہی نظر آئیں۔ اس کے علاوہ کچھ کتابچے بھی نظر آئے لیکن اس قسم کے کتابچے تو ہمارے ملک کے نواحی علاقوں میں بھی مل جاتے ہیں۔ بہر حال انشا کو اپنے سمرز کی اس Sex Shop میں موجود ادویات ویسی ہی معلوم ہوئیں جیسی ہمارے ہاں اس قسم کی ادویات ہوتی ہیں۔ اختلاف انھیں یہ نظر آیا کہ پاکستان میں ان ادویات کی تشہیر کرتے ہوئے عفت و حیا کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے جبکہ انگلستان میں اس سماجی قدر سے اغماض برتا جاتا ہے۔

اس کے بعد انشا امراض کے حوالے سے پاکستان اور مغربی ممالک کا تقابل کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ دانت کا درد ایسی تکلیف ہے جس میں مریض تکلیف سے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ انگلستان میں ہیں اور آپ کو ہفتہ یا اتوار کے دن دانت درد ہو جائے تو پھر آپ کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا کیونکہ ان دنوں وہاں کے اسپتالوں میں چھٹی ہوتی ہے۔ وہاں کے ہسپتالوں میں ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کے لئے عملہ تو موجود ہوتا ہے لیکن دانت درد کو وہاں کے لوگ کسی تشویشناک مرض میں شمار نہیں کرتے۔ یوں دانت کے درد میں مبتلا مریض کو نہ تو ڈاکٹر کے نسخے کے بغیر دوا مل سکتی ہے اور نہ ہی کوئی معالج اس کا معائنہ کر سکتا ہے، یوں اس بے چارے کا اللہ ہی حافظ ہوتا ہے۔ انشا کو یہ بھی پتا چلا کہ انگلستان میں دانتوں کے ڈاکٹر دانت درد کی دوا نہیں دیتے بلکہ مریض کا دانت ہی نکال دیتے ہیں جبکہ پاکستان میں دانت درد کے علاج کے حوالے سے انھیں اختلاف کا پہلو نظر آیا جسے انھوں نے سفر نامہ نگری نگری پھرا مسافر کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

''دانت کا درد بڑی ظالم چیز ہے لیکن دانت کا ڈاکٹر اس سے بھی ظالم چیز ہے۔ ہم یہاں کی بات کر رہے

ہیں، اپنے ملک کی نہیں۔ جہاں دانت نکالنے کے لئے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ لوگ فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے زنبور ڈال کر نکال دیتے ہیں اور جہاں لکڑ ہضم قسم کے منجن ہر جگہ دستیاب ہیں یہاں ہمارے ایک دانت میں تکلیف ہوئی ہم اس کے پاس گئے۔ یہاں کے دانتوں کے ڈاکٹر دوا وغیرہ نہیں جانتے۔ ہمیں تب ہوش آئی جب انھوں نے ایک ساتھ ہمارے تین دانت نکال کر سامنے رکھ دیئے۔''[۱۳]

بہرحال انؔشا کو پاکستان، امریکہ، جرمنی، ہالینڈ اور انگلستان میں معالجین کے طریقۂ علاج، علاج معالجے کی سہولیات اور ادویات کے حوالے سے اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

تفریح کے ذرائع

انسانی زندگی میں تفریح کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جب انسان دن رات کی محنت و مشقت سے تھک جاتا ہے تو آرام و سکون کے لمحات کا خواہاں ہوتا ہے۔ انسان کی اسی ضرورت اور خواہش کو پیش نظر رکھتے ہوئے دنیا میں مختلف طرح کے مشاغل و دلچسپیاں اور دیگر تفریحات وجود میں آئیں تاکہ تھکا ماندہ ہوا شخص کچھ دیر ذہنی آسودگی حاصل کر کے زندگی کی دوڑ میں دوبارہ شامل ہو سکے۔ انؔشا کی دفتری مصروفیات نے انھیں یورپ اور امریکہ کے سفر کے مواقع بھی فراہم کیے۔ ان ممالک کے سفر کے دوران جہاں انھوں نے دیگر حوالوں سے معلومات حاصل کیں وہیں ان ممالک میں موجود تفریحی ذرائع کے بارے میں جاننے اور معلومات حاصل کرنے کی کوشش بھی کی۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان سے مختلف ہوتا ہے اس کا نہ صرف ظاہری حلیہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا بلکہ اس کی عادات و اطوار بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں جس کا اثر یقیناً اس کے مشاغل اور دلچسپیوں پر بھی پڑتا ہے۔ انؔشا نے یورپی ممالک کے سفر کے دوران ان ممالک میں موجود تفریحی ذرائع کا تقابل پاکستان میں موجود تفریحی ذرائع سے کیا اور ان کے درمیان موجود اشتراک اور اختلافات کے پہلوؤں کو نمایاں بھی کیا۔ بعض جگہوں پر تو انھوں نے ان اشتراکات اور اختلافات کے در پردہ عناصر کی وضاحت بھی کی تاکہ قارئین مشرق اور مغرب کے تہذیبی اور جغرافیائی امتیازات کو سامنے رکھ کر ان معاشروں میں بسنے والے لوگوں کو بہتر طور پر جان سکیں۔ انھیں کو پاکستان اور یورپ کے تفریحی ذرائع میں اشتراک اور اختلاف کے جو پہلو نظر آئے انھیں ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

ٹیلی ویژن بھی تفریح کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ دورِ جدید میں یوں تو تفریح کے بہت سے ذرائع موجود ہیں پھر بھی ٹیلی ویژن کی مقبولیت اور اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوئی ہے۔ ٹیلی ویژن وہ تفریح ہے جس سے پاکستان سمیت دنیا کے بیشتر ممالک کے لوگ محظوظ ہوتے ہیں۔ آج دنیا میں شائد ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جہاں ٹیلی ویژن اسٹیشن موجود نہ ہو اور وہاں کے لوگ دل بہلانے کے لئے اس تفریحی ذریعے کو استعمال نہ کرتے ہوں۔ ٹیلی ویژن میں معاشرے کے مختلف طبقات اور عمر

کے لوگوں کی آراء کو مدنظر رکھتے ہوئے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ انشا نے متعدد بار انگلستان کا سفر کیا جس سے انھیں وہاں کے ٹیلی ویژن کے پروگراموں کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع بھی ملا۔ لندن میں ان کا قیام زیادہ تر ہوٹلوں میں رہا جہاں وقت کے اختلاف کے باعث وہ رات دیر تک جاگتے رہتے تھے۔ چنانچہ وقت گزارنے کے لئے وہ اکثر ٹیلی ویژن دیکھا کرتے تھے جس سے نہ صرف ان کا وقت اچھا گزر جاتا بلکہ انھیں لندن ٹیلی ویژن کے پروگراموں کے بارے میں معلومات بھی حاصل ہوتیں۔ جب وہ پاکستان اور لندن ٹیلی ویژن کے پروگراموں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ممالک کے ٹیلی ویژن پروگراموں میں اشتراک کے ساتھ ساتھ اختلاف کے پہلو بھی موجود ہیں۔ اشتراکات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ ان دونوں ممالک کے ٹیلی ویژن پروگراموں میں کچھ پروگرام ایسے بھی ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل ایک جیسے ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان ٹیلی ویژن سے پیش کیا جانے والا پروگرام نیلام گھر اور لندن ٹیلی ویژن سے پیش کیا جانے والا پروگرام دی سیل آف دی سینچری دونوں معلوماتی پروگرام ہیں اور ان میں سوال و جواب کا سلسلہ ہوتا ہے۔ ان دونوں پروگراموں کے میزبان پروگرام میں موجود حاضرین سے سوالات کرتے ہیں جن کا درست جواب دینے پر وہ انھیں انعامات دیتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام نیلام گھر اور لندن ٹیلی ویژن کے پروگرام دی سیل آف دی سینچری میں پہلا اختلاف تو انھیں یہ نظر آیا ہے کہ نیلام گھر کی مقابلے میں دی سیل آف دی سینچری میں انعامات کی تعداد زیادہ تھی بلکہ کئی بار تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ انعام میں ایک آدھ چیز دینے کے بجائے پورے گھر کا فرنیچر ہی دے دیا جاتا۔ جبکہ نیلام گھر میں اول تو انعامات کی تعداد کم ہوتی اور دوسرے یہ انعامات اس نوعیت کے نہیں ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ انھیں ان دونوں پروگراموں کے میزبانوں کے کمپیئرنگ کے انداز میں بھی فرق نظر آیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ نیلام گھر کے کمپیئر اپنے شاعرانہ انداز سے پروگرام کو چار چاند لگاتے ہیں، وہ پروگرام کے دوران سامعین اور حاضرین کو مختلف شعراء کے کلام سے محظوظ کرتے رہتے ہیں۔ انشا نے نیلام گھر کے کمپیئر کے انداز کمپیئرنگ کو نہ صرف منفرد قرار دیا ہے بلکہ اسے سراہا بھی۔ اس پروگرام کے کمپیئر طارق عزیز کے لئے ان کی تعریف و ستائش بالکل بجا ہے۔ واقعی نیلام گھر کے میزبان پروگرام کے دوران اشعار کے موزوں اور برجستہ استعمال سے اس پروگرام کے حسن میں مزید اضافہ کر دیتے ہیں۔ جبکہ لندن ٹیلی ویژن کے پروگرام دی سیل آف سی سینچری کے میزبان کمپیئرنگ کرتے ہوئے زیادہ تر نثر ہی کو اپنے وسیلہ اظہار بناتے ہیں۔ میزبانوں کے تقابل کے بعد وہ ان پروگراموں میں شامل مددگار لڑکیوں کا تقابل بھی کرتے ہیں جس میں انھیں ان دونوں طرف کی مددگار لڑکیوں کے پہناوے میں خاصا فرق نظر آتا ہے۔ اس اختلاف کی وضاحت کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ دی سیل آف دی سینچری میں شامل مددگار لڑکیوں کا لباس فحاشی اور عریانیت کا نمونہ تھا جبکہ پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام نیلام گھر میں شامل مددگار لڑکیوں کا لباس فحاشی اور عریانیت کے مظاہرے سے یکسر پاک تھا۔ یوں انشا کو پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام نیلام گھر اور برطانوی ٹیلی ویژن کے پروگرام دی

سیل آف سی سینچری میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔ انھیں ان دونوں پروگراموں کے میز بانوں کے انداز کمپیئرنگ، مددگار لڑکیوں کے لباس اور انعامات کی تعداد اور قدر و قیمت کے حوالے سے تو اختلاف کا پہلو نظر آیا البتہ اشتراک کی یہ صورت نظر آئی کہ دونوں جگہ پروگراموں کی نوعیت معلوماتی تھی۔

ٹیلی ویژن میں یوں تو بہت سے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں لیکن کوئی پروگرام کیوں مقبول ہوتا ہے اس کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ ناظرین اس میں کتنی دلچسپی لیتے ہیں۔ انشا نے پاکستان، یورپ اور امریکہ کے پروگراموں کے تقابلی مطالعے کے ساتھ ساتھ وہاں پر موجود ناظرین کے طرز عمل کا موازنہ بھی کیا جس سے اس تقابلی مطالعے کو اور وسعت اور اہمیت ملی۔ امریکہ قیام کے دوران انھیں امریکی ناظرین کے طرز عمل کے بارے میں جاننے کا موقع ملا۔ جب وہ پاکستانی اور امریکی ناظرین کے طرز عمل کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں ممالک کے ناظرین کے طرز عمل میں یہ اشتراک نظر آیا کہ یہ لوگ کسی پروگرام کو یا تو بہت پسند کرتے ہیں یا پھر بالکل پسند نہیں کرتے۔ وہ پاکستانی اور امریکی ناظرین کے طرز عمل کے موازنے کے لئے پاکستان ٹیلی ویژن کے مقبول ترین پروگرام آپ کی رائے اور بی بی سی ٹیلی ویژن کی مقبول ترین ڈرامہ سیریز روٹس کا انتخاب کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تو وہ بی بی سی ٹیلی ویژن پر پیش کی جانے والی ڈرامہ سیریز روٹس کے بارے میں بتاتے ہیں کہ پہلے یہ ایک ناول تھا جسے ایک سیاہ فام امریکی ایلیکسن ہیلی نے تحریر کیا تھا۔ اس ناول پر مبنی ایک ٹیلی ویژن سیریز روٹس کے نام سے بنائی گئیں، جس کی کل چھ اقساط تھیں۔ یہ ٹیلی ویژن سیریز امریکی عوام میں بے حد مقبول ہوئیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس پروگرام کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بی بی سی ٹیلی ویژن پر ابھی اس ڈرامہ سیریز کی صرف تین اقساط ہی نشر کی گئیں تھیں کہ ہر جگہ ان کی دھوم مچ گئی۔ انشا پاکستان ٹیلی ویژن پر پیش کیے جانے والے مقبول ترین پروگرام آپ کی رائے کے بارے میں بتاتے ہیں کہ یہ پروگرام اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت منفرد ہے کیونکہ اس پروگرام میں پاکستان ٹیلی ویژن سے پیش کیے جانے والے دیگر پروگراموں کے بارے میں ناظرین کی پسندیدگی کی شرح بتائی جاتی ہے۔ اس پروگرام کو یہاں کے ناظرین کی تقریباً نوے پچانوے فیصد تعداد دیکھتی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ کئی پروگرام تو ایسے بھی ہیں جن کی شرح پسندیدگی اس سے بھی زیادہ ہے البتہ مجھے ان کے نام اس وقت معلوم نہیں ہیں۔ یوں انشا کو پاکستانی اور امریکی ناظرین کے طرز عمل میں یہ اشتراک تو نظر آیا کہ دونوں جب کسی پروگرام کو پسند کرتے ہیں تو اس پروگرام کی پسندیدگی کی شرح بہت زیادہ ہوتی ہے۔ البتہ جب وہ پاکستان ٹیلی ویژن کے مقبول ترین پروگرام آپ کی رائے اور بی بی سی ٹیلی ویژن کی مقبول ترین ڈرامہ سیریز روٹس کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام آپ کی رائے کی شرح پسندیدگی 95 فیصد تھی اور بی بی سی ٹیلی ویژن پر پیش کی جانے والی ڈرامہ سیریز روٹس کی شرح پسندیدگی 73 فیصد۔ یوں انھیں ان دونوں ممالک کے مقبول ترین پروگراموں میں شرح پسندیدگی کے حوالے سے خاصا اختلاف نظر آیا۔

ٹیلی ویژن وہ تفریحی ذریعہ ہے جس کا شمار جدید دور کے مقبول ترین تفریحی ذرائع میں ہوتا ہے۔ یہ تفریحی ذریعہ اشتہارات کے بغیر نہیں چل سکتا اس لئے دنیا کے جن ممالک میں یہ تفریح موجود ہے وہاں ٹیلی ویژن پر اشتہارات بھی لازماً پیش کیے جاتے ہیں۔ انشا نے دنیا کے مختلف ممالک میں قیام کے دوران وہاں کے اشتہارات کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور ان کا تقابل پاکستان ٹیلی ویژن پر پیش کیے جانے والے اشتہارات سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کو واضح کیا۔ ذیل میں ان کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

انشا کی دفتری مصروفیات نے انھیں امریکہ کے سفر کے مواقع بھی فراہم کیے۔ اس ملک میں بھی ان کا قیام زیادہ تر ہوٹلوں میں ہی رہا جہاں دفتری مصروفیات کو نبٹانے کے بعد اکثر اوقات وہ ہوٹل کے کمرے میں اکیلے ہوتے۔ چنانچہ فارغ وقت بتانے سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ تفریح کے کسی نہ کسی ذریعے کے متلاشی رہتے۔ ہوٹل کے کمرے میں تفریح کا کوئی اور سامان موجود ہوتا یا نہ ہوتا لیکن ٹیلی ویژن ضرور موجود ہوتا۔ یوں انشا تفریح کے اس ذریعے کو کام میں لاتے اور اپنا فارغ وقت اکثر و بیشتر فلمیں، ڈرامے اور دیگر معلوماتی پروگرام دیکھ کر گزارتے۔ جس سے ایک طرف تو ان کا وقت اچھا گزر جاتا اور دوسری طرف اس تفریحی ذریعے کے بارے میں جاننے کا موقع بھی مل جاتا۔ انشا کو امریکہ کے ٹیلی ویژن پروگرام دیکھ کر اس بات کا اندازہ ہوا کہ یہاں کے ٹیلی ویژن پروگراموں کے درمیان بھی وقت بے وقت اشتہارات پیش کیے جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو اشتہارات کے ایک لامتناہی سلسلے کا آغاز ہو جاتا ہے جس سے ناظرین سر پٹا کر رہ جاتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ امریکہ قیام کے دوران وقت گزارنے کے لئے میں اکثر اوقات رات کو فلمیں دیکھا کرتا لیکن فلم کے دوران اشتہارات کی اتنی بھرمار کر دی جاتی تھی کہ پروگرام کا تسلسل ہی ٹوٹ جاتا اور مجھ سمیت دیگر ناظرین کا مزا کرکرا ہو جاتا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بھلا کہاں کی شرافت ہے کہ دیکھنے والے اتنے انہاک سے پروگرام دیکھ رہے ہوں اور درمیان میں لوگ اچانک چیزیں بیچنے آ جائیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک رات میں نے ایک فلم دیکھی جس کا نام Sevix Year Itch تھا اس کے بعد Herizoix West نامی فلم کا آغاز ہو گیا، میں بھی فارغ تھا لہٰذا سوچا کہ یہ فلم بھی دیکھ لی جائے لیکن ابھی فلم کا آغاز ہی ہوا تھا کہ اچانک اشتہارات کے ایک طویل سلسلے کا آغاز ہو گیا۔ فلم کے دوران ایک دلچسپ صورتحال اس وقت پیش آئی جب ایک گنجا آدمی اچانک پرانی کاروں کی پبلیسٹی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی نہیں پھر ایک الیکٹرک توتھ برش کا اشتہار بھی پیش کیا جاتا ہے، جس میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ ٹوتھ برش ۴۲ فیصد زیادہ بہتر دانت صاف کرتا ہے، پھر کلی کے ایک محلول کا اشتہار بھی آ جاتا ہے جس میں حیرت انگیز نتائج کا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اسے استعمال کرتے ہی محبوب آپ کے قدموں میں ہوگا۔ پھر یہیں اختتام نہیں ہوتا بلکہ ایک اشتہار کتوں کی خوراک کے بارے میں بھی پیش کر دیا جاتا ہے۔ غرض اشتہارات کا دائرہ صرف انسانوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ جانوروں کی ضرورت کی اشیاء کے بارے میں بھی اشتہارات پیش کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اشتہارات کی اتنی بڑی تعداد کو برداشت کرنے کے بعد فلم کا سارا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور ناظرین

میں پہلی سی دلچسپی اور انہماک قائم نہیں رہتا۔ پاکستان ٹیلی ویژن پر اشتہارات کی بے وقت آمد اور بھرمار سے جس قسم کی صورتحال پیدا ہوتی ہے انشاؔ اس سے تو یقیناً بخوبی واقف ہوں گے البتہ امریکہ کے سفر سے ان پر یہ حقیقت بھی کھلی کہ امریکی ٹیلی ویژن بھی اشتہارات کی پیش کش کے سلسلے میں کسی طرح ہم سے کم نہیں ہے۔ یوں پاکستان اور امریکہ کے ٹیلی ویژن میں اشتہارات کی بے وقت آمد اور بھرمار کے حوالے سے انھیں مکمل اشتراک کی صورت نظر آئی۔

انشاؔ کو پاکستان اور امریکہ کے ٹیلی ویژن میں اشتہارات کے حوالے سے جہاں اشتراک کی صورت نظر آئی وہیں اس حوالے سے اختلاف کا ایک پہلو بھی نظر آیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک روز میں خبرنامہ دیکھ رہا تھا کہ اچانک اشتہارات کی بے وقت آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا جس سے بڑی عجیب و غریب صورتحال پیدا ہو گئی۔ اس صورتحال کو انھوں نے سفرنامہ دنیا گول ہے کے درج ذیل حوالے میں بڑے مزاحیہ انداز میں یوں بیان کیا ہے:

> ''دوسرے پروگراموں میں تو ٹھیک یہاں خبروں کے بیچوں بیچ بھی اشتہار دیئے جاتے ہیں۔ ابھی اس ہفتے یہاں کان کا ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ نیوز ریڈر اعلان کر رہا تھا کہ ستر آدمی ملبے میں دب گئے ہیں اور تازہ اطلاع کے مطابق ــــــ یہاں کٹ اور اشتہار شروع کہ''ـــــ آپ یہ سن کر خوش ہوں گے پام آلیو شیمپو کے استعمال کے بعد آپ ناچ میں جائیں گی تو سبھی پروانہ وار آپ ہی پر گریں گے ــــــ نیوز ریڈر پھر نمودار ہو کر خبر مکمل کرتا ہے کہ ــــــ خیال کیا جاتا ہے وہ سب کے سب مر گئے ہیں۔ لہذا تلاش ختم کی جا رہی ہے''۔[۱۴]

یوں درج بالا حوالے میں انشاؔ نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ خبرنامہ ایک اہم پروگرام ہے جسے اشتہارات سے پاک ہونا چاہیے کیونکہ اس میں پیش کی جانے والی خبروں کی اہمیت اور تسلسل کو اشتہارات کی بے وقت آمد اور کثرت سے سخت نقصان پہنچتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ٹیلی ویژن ایک ایسا تفریحی ذریعہ ہے جو مالی اعانت کے بغیر نہیں چل سکتا اس لئے اس میں مجبوراً اشتہارات پیش کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن وہ بتاتے ہیں کہ مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ پروگرام تو پروگرام امریکی ٹیلی ویژن پر تو خبروں کے درمیان بھی اشتہارات پیش کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ خبروں کے درمیان اشتہارات پیش کرنے سے ان کا تسلسل بری طرح متاثر ہوتا اور خبر کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ کئی بار تو ایسا بھی ہوتا کہ کسی خبر کا کچھ حصہ تو پیش کر دیا جاتا اور بقیہ حصہ اشتہارات کے بعد پیش کیا جاتا جس سے خبر کا تسلسل اور تاثر بری طرح متاثر ہوتا پاکستان ٹیلی ویژن پر بھی اشتہارات پیش کیے جاتے ہیں اور بڑی کثرت سے پیش کیے جاتے ہیں لیکن پھر بھی خبروں کے درمیان اشتہارات پیش نہیں کیے جاتے۔ یوں ہمارے ہاں خبروں کی اہمیت کے پیش نظر اس کے درمیان اشتہارات پیش نہیں کیے جاتے جبکہ امریکی ٹیلی ویژن خبروں جیسے سنجیدہ اور اہم پروگرام کے درمیان بھی اشتہارات دینے سے نہیں چوکتا۔ بہرحال انشاؔ کو پاکستان اور امریکی ٹیلی ویژن میں اشتہارات کے حوالے سے اشتراکات اور اختلافات کے دونوں پہلو ہی

نظر آئے۔

انشا کو پاکستان اور امریکہ کے ٹیلی ویژن پر پیش کیے جانے والے اشتہارات میں زیادہ تر اشتراک کے پہلو ہی نظر آئے کیونکہ ان دونوں ممالک کے ٹیلی ویژن پر ایک تو اشتہارات کی بھرمار ہوتی ہے اور دوسرے یہ موقع بے موقع پیش کیے جاتے ہیں۔ البتہ اختلاف یہ سامنے آیا کہ پاکستان ٹیلی ویژن پر خبروں کی اہمیت کے پیش نظر اس کے درمیان اشتہارات پیش نہیں کیے جاتے جبکہ امریکی ٹیلی ویژن میں خبروں کی اہمیت کی پروا بھی نہیں کی جاتی اور اس کے درمیان بھی اشتہارات پیش کیے جاتے ہیں۔

آج کل کے دور میں فلم تفریح کا ایک ذریعہ ہے۔ اکثر ممالک میں لوگ تفریح کے اس ذریعے سے بھی دل بہلاتے ہیں۔ دنیا میں ایسے ممالک کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو خود فلمیں بناتے ہیں اس کے علاوہ کئی ایسے ممالک بھی ہیں جو دوسرے ممالک کی بنائی گئی فلمیں دیکھتے ہیں۔ انشا فلموں کے بہت دلدادہ تھے، وہ جس ملک بھی جاتے ان کا یہی شوق انھیں ان ممالک کے سینما گھروں میں بھی لے جاتا۔ جب وہ پاکستان اور انگلستان میں بننے والی فلموں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ممالک میں فلموں کی تعداد کے حوالے سے اختلاف کا پہلو موجود ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ انگلستان قیام کے دوران میں وہاں کے سینما گھروں میں بھی گیا۔ اردگرد کے سینما گھروں میں جو فلمیں لگی ہوئی تھیں ان کے بارے میں میں نے خوب چھان بین کی جس سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ یہاں فلمیں بہت زیادہ تعداد میں بنتی ہیں۔ جب وہ فلموں کی تعداد کے اعتبار سے انگلستان، پاکستان اور ہندوستان کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں پاکستان اور ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ فلمیں بنتی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ انگلستان کے سینماؤں میں اتنی فلمیں لگتی ہیں کہ شاید پورے ہندوستان اور پاکستان میں بھی اتنی فلمیں نہیں لگتیں ہوں گی۔ یوں فلموں کی تعداد کے حوالے سے انھیں انگلستان، پاکستان اور ہندوستان میں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

اس کے بعد انشا فحاشی اور عریانی کے حوالے سے پاکستان اور انگلستان کی فلموں کا تقابل کرتے ہیں۔ اس تقابل میں انھیں ان دونوں ملکوں میں بنائی جانے والی فلموں میں خاصا اختلاف نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان اور انگلستان نہ صرف جغرافیائی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ ان ممالک کی سماجی قدریں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ برطانوی معاشرے میں عفت وحیا کا تصور ناپید نظر آتا ہے جس کا واضح اثر ہمیں وہاں پر بنائی جانے والی فلموں میں بھی نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں پر بننے والی اکثر فلمیں فحاشی اور عریانی پر مبنی ہوتی ہیں جبکہ ہمارے معاشرے میں عفت وحیا کے تصور کو ایک سماجی قدر کی حیثیت حاصل ہے اس لئے یہاں پر بننے والی اکثر فلموں میں فحاشی اور عریانی کا مظاہرہ بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ یوں انشا کو اس سماجی قدر کے حوالے سے پاکستان اور انگلستان کی فلموں میں خاصا اختلاف نظر آیا۔

انشا کو پاکستان اور انگلستان کی فلموں میں جہاں اختلاف کا پہلو نظر آیا وہیں ان میں اشتراک کی ایک صورت بھی

نظر آئی۔ وہ بتاتے ہیں کہ لندن قیام کے دوران بھی میں نے حسب روایت بہت سے سینما گھروں میں حاضری لگوائی اور بہت سی فلمیں دیکھیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب میں نے فینی ہل نامی فلم دیکھی تو مجھے اس فلم کا انجام بالکل پاکستانی فلموں جیسا لگا کیونکہ اس فلم میں بھی پاکستانی فلموں کے آخری سین کی طرح یہی دکھایا جارہا تھا کہ ہیروئن کی شادی زبردستی کسی بدمعاش سے کی جارہی ہے اور اچانک کہیں سے ہیرو آدھمکتا ہے اور بلند آواز میں اعلان کرتا ہے کہ یہ شادی نہیں ہوسکتی، اگر اس لڑکی کی شادی ہوگی تو صرف میرے ساتھ ورنہ نہیں۔ آخر میں ایک طویل جنگ وجدل اور خون ریزی کے بعد ہیرو کو فتح حاصل ہو جاتی ہے اور اس کی شادی ہیروئن سے کر دی جاتی ہے جس کے بعد انھیں ہنسی خوشی زندگی گزارتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ یوں انؔشا کو پاکستان اور انگلستان کی فلموں میں یہ اشتراک نظر آیا کہ ان کا انجام بالکل ایک سا ہوتا ہے۔

المختصر، انؔشا نے جب پاکستان، یورپ اور امریکہ کے تفریحی ذرائع کا تقابل کیا تو انھیں اس تقابل میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

شہر اور دیہات

انؔشا نے مختلف ممالک کی سیاحت کے دوران وہاں کے شہروں اور دیہات کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ جب وہ پاکستان، انگلستان اور فرانس کے رہائشی علاقوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں کسی جگہ کو تلاش کرنا آسان ہے جبکہ فرانس اور انگلستان میں کسی جگہ کو تلاش کرنا بے حد مشکل۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ لوگ گلیوں کے نام کے ساتھ گارڈن یا پارک کا اضافہ کر دیتے ہیں حالانکہ ان کے قریب کوئی ایسی جگہ موجود نہیں ہوتی۔ انؔشا کہتے ہیں کہ کوئنز گارڈن کو تو پھر اپنے نام کے ساتھ کچھ مناسبت ہے کیونکہ اس کے سامنے اگر زیادہ بڑا نہیں تو اتنا باغیچہ ضرور موجود ہے جتنا ہمارے گھر کے سامنے ہے البتہ کچھ جگہیں تو ایسی بھی ہیں جن کے سامنے باغ یا پارک تو کیا سبزے کا نام تک موجود نہیں ہے۔ فرانس میں انھیں یہ دشواری پیش آئی کہ وہاں ایک ہی نام کی کئی جگہیں ہوتی ہیں مثلاً لنیسٹر نام کی ایک سڑک بھی ہوگی ایک گارڈن بھی ہوگا لنیسٹر اسٹریٹ بھی ہوگی، سکوئر اور پیلس بھی ہوگا اور لینسٹر میوز بھی ہوگا۔ بہر حال انؔشا کو پاکستان، انگلستان اور فرانس میں یہ اختلاف نظر آیا کہ پاکستان میں کسی جگہ کو تلاش کرنا آسان ہے اور ان ممالک میں ایسا کرنا بے حد مشکل۔

ہوٹل

دنیا کے مختلف ممالک کی سیاحت کے دوران انؔشا کو کئی ممالک کے ہوٹلوں میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ ان ممالک میں سے انھیں جرمنی کے شہر برلن اور جاپان کے شہر ٹوکیو کے ہوٹل بہت اچھے لگے جبکہ ہالینڈ کے ہوٹلوں سے تو وہ کراچی

کے ادنیٰ درجے کے ہوٹلوں کو بھی بہتر قرار دیتے ہیں جہاں زیادہ تر حکیم، سنیاسی، ماہر نجوم اور عامل ہی زیادہ تر رہتے ہیں۔ ہالینڈ کے ہوٹلوں کو غیر معیاری قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ جرمنی سے سفر کرتے ہوئے ہالینڈ پہنچے تھے۔ جرمنی کے خوب صورت اور جدید سہولیات سے آراستہ ہوٹلوں میں قیام کے بعد جب وہ ہالینڈ کے ادنیٰ درجے کے ہوٹلوں میں آئے تو انھیں یوں لگا جیسے وہ ٹوکیو سے میر پور خاص آ گئے ہوں۔ ٹوکیو شہر میں نہ صرف جدید سہولیات موجود تھیں بلکہ یہ شہر صفائی وستھرائی میں بھی اپنی مثال نہیں رکھتا جبکہ پاکستانی شہر میر پور خاص میں صورتحال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یوں انشا کو دنیا کے مختلف ممالک کے ہوٹلوں کے تقابل سے یہ پتا چلا کہ جرمنی کے شہر برلن کے ہوٹل اپنی مثال آپ ہیں اور کراچی کے ادنیٰ درجے کے ہوٹل لاکھ برے سہی لیکن ہالینڈ کے ہوٹلوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔

اس کے بعد انشا فرانس کے ہوٹلوں کا تقابل بھی پاکستانی ہوٹلوں سے کرتے ہیں۔ جب وہ کراچی کے ملباری ہوٹل کا تقابل پیرس کے ہوٹل مالار سے کرتے ہیں تو اس تقابل میں انھیں اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں ہی نظر آتی ہیں۔ اختلاف کے حوالے سے وہ بتاتے ہیں ملباری ہوٹل میں قیام کرنے والوں کو مزیدار اور پرتکلف کھانے دیئے جاتے ہیں لیکن پیرس کے مالار ہوٹل میں مجھے کھانے کے لئے صرف پنیر کے چند قتلے ہی دیئے گئے اور ساتھ میں تھوڑا سا نمک دے دیا گیا تا کہ اس کے پھیکے پن کو کسی قدر کم کیا جاسکے۔ انشا کو کراچی کے ملباری ہوٹل اور پیرس کے ہوٹل میں جہاں اختلاف کی صورت نظر آئی وہیں اشتراک کا ایک پہلو بھی نظر آیا۔ انھوں نے اس اشتراک کو سفر نامہ آوارہ گرد کی ڈائری کے درج ذیل حوالے میں یوں بیان کیا ہے:

> ''ہوٹل مالار کو پیرس کا ملباری ہوٹل کہہ لیجئے تو مضائقہ نہیں۔ وہی ہیبت وہی شوکت، وہی شان دلارائی۔ یہاں ہمیں گھر کا سا آرام میسر ہے۔ اس کے غسل خانے میں ہمارے گھر کی طرح پانی کم کم آتا ہے۔ بلب کی روشنی خاص طور پر اس لئے دھیمی رکھی گئی ہے کہ کوئی راتوں کو پڑھ پڑھ کر اپنی آنکھیں خراب نہ کرے۔ باتھ روم ایسی تنگنائے غزل ہے کہ ہم نے فوارہ کھول تو لیا لیکن بدن پر صابن نہ لگا سکے، کیونکہ ہمارے قارئین میں سے جو صاحبان کبھی نہائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ صابن لگانے کے لئے کہنیوں اور گھٹنوں کو حرکت دینی پڑتی ہے۔ اور اس حمامِ بادگرد کی دیواریں اس قسم کی عیاشی اور خوش فعلی کی گنجائش نہیں رکھتیں۔ ایک اور بات اس ہوٹل میں ہمارے گھر کی سی یہ ہے کہ یہاں کوئی ہماری بات سنتا نہیں۔ سنتا ہے تو سمجھتا نہیں۔ اور سمجھتا ہے تو جواب نہیں دیتا۔'' ۱۵

یوں انشا کو کراچی کے ملباری ہوٹل اور پیرس کے ہوٹل مالار کے تقابل میں کھانے پینے کی اشیاء کی دستیابی کے حوالے سے تو اختلاف نظر آیا لیکن ان دونوں اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں بنیادی سہولیات کی دستیابی کے حوالے سے اشتراک کا پہلو بھی نظر آیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ فرانس کی مشہور سٹرک شانزالیزے پر مجھے ہوٹلوں اور کیفوں کی ایسی ہی بڑی تعداد نظر آئی جیسے مری کے مال روڈ پر ہوتی ہے۔ ان دونوں جگہوں کے ہوٹلوں میں انھیں یہ اشتراک بھی نظر آیا کہ یہاں

کھانے پینے کی اشیاء بہت مہنگی فروخت کی جاتی ہیں البتہ انھیں یہ اختلاف نظر آیا کہ شانز الیزے پر موجود ہوٹلوں میں شراب ہر جگہ عام مل جاتی ہے لیکن چائے اور کافی جیسے مشروبات نہیں ہوتے۔

یوں انشا کو پاکستان، انگلستان، جرمنی، ہالینڈ، فرانس اور ٹوکیو کے ہوٹلوں میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

بازار

بازار سے مراد ایسی جگہ ہے جو لین دین اور خریداری کا مرکز ہو۔ پرانے وقتوں میں انسان کو اپنی مطلوبہ اشیاء کے حصول کے لئے بہت تگ و دو کرنی پڑی تھی اور دور دراز کے علاقوں تک جانا پڑتا تھا، جو نہ صرف ایک دقت طلب کام تھا بلکہ اس میں اس کا قیمتی وقت بھی ضائع ہوتا تھا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان نے بازار اور تجارتی مراکز قائم کر کے زندگی میں سہولت پیدا کی۔ انشا کو ان کی دفتری مصروفیات نے دنیا کے مختلف ممالک کے سفر کے موقع فراہم کیے یہی سرکاری مصروفیات انھیں یورپ اور امریکہ بھی لے گئیں۔ انھوں نے ان ممالک میں قیام کے دوران وہاں کے بازار اور تجارتی مراکز بھی دیکھے۔ انھوں نے ان بازاروں اور تجارتی مراکز کو صرف ایک خریدار کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ ایک مسافر اور ایک سیاح کی نگاہ سے بھی دیکھا۔ یوں انھوں نے ان جگہوں کو کھوجنے اور دریافت کرنے کی کوشش بھی کی۔ مثال کے طور پر ان کی دلچسپی اور توجہ زیادہ تر ان زاویوں کے گرد رہی کہ ان بازاروں کا ظاہری نقشہ کیسا ہے؟ دکانیں کس قسم کی ہیں اور ان کی تفصیلات کیا ہیں؟ ان دکانوں میں موجود سامان اپنی کیفیت اور قیمت کے اعتبار سے کیسا ہے؟ گاہکوں کی قوت خرید کیا ہے؟ اشیاء کی قیمتیں مقرر ہیں یا بات چیت کی سہولت موجود ہے؟ مزید یہ کہ گاہکوں اور دکانداروں کا طرز عمل کیسا ہے وغیرہ وغیرہ۔ انھوں نے صرف ان معلومات کی جمع آوری ہی کو کافی نہیں سمجھا بلکہ ان معلومات کا تقابل پاکستانی بازاروں اور تجارتی مراکز کی متعلقہ معلومات سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت بھی کی اور یوں اس مطالعے و مشاہدے کو مزید دلچسپ بنا دیا۔

انگلستان یورپ کا ایک اہم ملک ہے۔ وہاں قیام کے دوران انھوں نے وہاں کے بازاروں کو تفریح، معلومات اور خریداری تینوں چیزوں کا مرکز بنایا۔ جب وہ پاکستان اور انگلستان کے بازاروں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں لندن کی پکاڈلی اسٹریٹ اور لاہور کی انارکلی میں اشتراک کی ایک صورت نظر آتی ہے۔ وہ اشتراک یہ ہے کہ یہ دونوں بازار اصل میں ہیں تو شاہراہیں لیکن ان شاہراؤں پر اب بازار بن چکے ہیں اور اب یہ شاہراہیں بازار کے طور پر ہی مشہور ہیں۔ یوں انشا کو لاہور کی انارکلی اور لندن کی پکاڈلی اسٹریٹ میں اشتراک کا پہلو نظر آیا۔

کسی بازار کا ظاہری نقشہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ انشا نے اس حوالے سے پاکستان اور انگلستان کے بازاروں کا تقابل بھی کیا ہے۔ انشا بتاتے ہیں لیسٹر اور برمنگھم قیام کے دوران مجھے ایک پاکستانی دوست حبیب الرحمان ملے جو ایشیا کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے مجھے یہاں کے کئی محلوں اور ان سے ملحقہ بازاروں کی خوب سیر کرائی جس سے مجھے ان بازاروں کے ظاہری نقشے اور احوال کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع ملا۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہاں کے بازاروں میں مجھے جا بجا پاکستانی دکانداروں کی دکانیں نظر آئیں یہاں تک کہ ایک سڑک پر تو 70 فیصد دکانیں ہی پاکستانیوں کی تھیں۔ بازار گھوم پھر کر مجھے ایسا لگا جیسے میں برمنگھم کی بجائے گوجرانوالہ یا سیالکوٹ میں ہوں۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس بازار میں مٹھائیوں کی بھی کئی دکانیں تھیں جن میں سے ایک دکان کا نام یونس سویٹ مارٹ تھا۔ یہاں میں نے اور حبیب صاحب نے پیڑے اور جلیبیاں بھی کھائیں۔ یوں انشا کو لیسٹر اور برمنگھم کے بازاروں میں اشتراک کی یہ صورت نظر آئی کہ ان میں گوجرانوالہ اور سیالکوٹ کی طرح مٹھائیوں کی دکانیں تھیں اور ان میں مٹھائیاں بھی بالکل ویسی ہی تھیں جیسی ہمارے ہاں ہوتی ہیں۔ بہر حال انشا کو پاکستان اور انگلستان کے بازاروں میں اشتراک کی بہت سی صورتیں نظر آئیں۔ یہ اشتراک کہیں تو انارکلی اور پکاڈلی اسٹریٹ کے ظاہری نقشے میں نظر آیا اور کہیں برمنگھم و لیسٹر اور سیالکوٹ و گوجرانوالہ میں مٹھائیوں کی دکانوں اور پاکستانی دکانداروں کی ایک بڑی تعداد کی موجودگی کے حوالے سے نظر آیا۔

اس کے بعد انشا پاکستان اور انگلستان میں موجود گوشت کی دکانوں کا مختلف حوالوں سے تقابل کرتے ہیں۔ اس تقابل میں انھیں صرف اختلافات کے پہلو ہی نظر آتے ہیں۔ ان اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ برمنگھم اور لیسٹر کے بازاروں میں گوشت کی کئی دکانیں موجود تھیں جن میں سے کچھ دکانیں تو پاکستانی دکانداروں کی تھیں اور کچھ انگریز دکانداروں کی۔ دکانوں کے باہر حلال گوشت لکھا گیا تھا لیکن بعض جگہوں پر حلال گوشت کی بجائے ہلال گوشت لکھا گیا تھا۔ وہ بتاتے ہیں کہ وہاں پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد ایک عرصے سے مقیم تھی جن میں سے زیادہ تر لوگ پاکستانی دکانداروں سے ہی گوشت خریدتے تھے البتہ ان میں سے چند ایسے بھی تھے جو انگریز دکانداروں سے گوشت خریدتے تھے۔ ہر دکاندار کا طرز عمل دوسرے دکانداروں سے مختلف ہوتا ہے، جب وہ پاکستانی دکانداروں اور انگریز دکانداروں کے طرز عمل کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں ممالک کے دکانداروں کے طرز عمل میں خاصا اختلاف نظر آتا ہے۔ اس اختلاف کو انشا سفر نامہ آوارہ گرد کی ڈائری کے درج ذیل حوالے میں ایک پاکستانی خاتون کی زبانی بیان کرتے ہیں جو پاکستانی اور انگریز دونوں طرح کے دکانداروں سے گوشت خریدتی تھی، درج ذیل حوالے میں یہ صاحبہ فرماتی ہیں کہ:

> ''ہمارے یہ بھائی اوّل تو گوشت مہنگا بیچتے ہیں پھر اس میں پاؤ بھر ہڈی ضرور ڈالتے ہیں۔ پھر ان کا رویہ خاصا دُرشت ہوتا ہے۔ لہٰذا میں تو اب انگریز قصائی کے ہاں سے لینے لگی ہوں۔ سستا ہوتا ہے اور صاف اور عمدہ، ہڈی چھیچھڑے کی مصیبت بھی نہیں۔''[۱۶]

درجہ بالا حوالے میں انشا نے پاکستانی دکانداروں کے طرز عمل کی عکاسی جس انداز میں کی ہے وہ بالکل بجا ہے۔ واقعی ہمارے ہاں کے قصائی گاہکوں سے جس قسم کے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ یہ حضرات گوشت بھی اچھا اور صاف ستھرا نہیں دیتے اور اس کی قیمت بھی زیادہ وصول کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ لیسٹر اور برمنگھم میں گوشت کی دکانوں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ یہاں گوشت کی ساری دکانیں شیشے کی بنی ہوئی تھیں یہاں تک کہ ان کے دروازے اور کھڑکیاں بھی شیشے کے بنے ہوئے تھے۔ دکانوں میں صفائی کی صورتحال قابل دید تھی اور حیرانی ہوتی تھی کہ کیا گوشت کی دکانیں بھی ایسی صاف ستھری ہو سکتی ہیں۔ پھر وہ بتاتے ہیں کہ یہاں جو جانور ذبح کیے جاتے ہیں وہ بالکل تندرست ہوتے ہیں، ذبح کرنے سے پہلے ڈاکٹر صاحبان ان کا باقاعدہ معائنہ کرتے ہیں اور ان کے تندرست ہونے کی پوری تسلی کرتے ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں چونکہ رشوت کا دور دورہ ہے اس لئے رشوت کی رقم دے کر گوشت پر جامنی مہریں لگوا لی جاتی ہیں خواہ یہ گوشت کتنا ہی مضر صحت کیوں نہ ہو۔ انھوں نے اس بات کا بھی مشاہدہ کیا کہ وہاں گوشت کو بڑے سلیقے سے باریک پارچوں کی صورت میں کاٹا جاتا ہے پھر اسے مومی کاغذ میں لپیٹ کر سجایا جاتا ہے اور اس کی قیمت اس پر درج ہوتی ہے۔ گوشت رکھنے کے لئے دکان میں فریج بھی موجود ہے۔ انشا بتاتے ہیں کہ گوشت کی دکان کے معائنے کے دوران جب میں نے ایک دکان میں موجود فریج میں پڑا ہوا گوشت دیکھا تو اسے دیکھ کر میرا دل للچایا کہ اسے کچا ہی کھالوں۔ اس کے علاوہ گوشت کے انتخاب کے معاملے میں بھی یہ دونوں اقوام اپنے مذہبی اختلاف کے سبب الگ نقطۂ نظر رکھتی ہیں۔ ہر مذہب کے کچھ اپنے اصول وضوابط اور ممنوعات ہوتے ہیں جن کا احترام اس مذہب کے ماننے والوں کو بہر صورت کرنا پڑتا ہے، کچھ ممنوعات ایسے بھی ہیں جن کا تعلق خوراک سے ہوتا ہے۔ پاکستانی قوم کا مذہب اسلام ہے اور انگریز قوم کا عیسائیت۔ دین اسلام میں خوراک خصوصاً گوشت کے معاملے میں چند ممنوعات ومکروہات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یوں پاکستانی مسلمانوں کو بھی گوشت کے انتخاب کے معاملے میں دیگر شرائط وضوابط کے علاوہ حرام وحلال کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ذبیحہ یعنی حلال گوشت کھاتے ہیں اور عیسائی گوشت کے انتخاب کے سلسلے میں اس قسم کی پابندی کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ انگلستان قیام کے دوران انشا پر یہ حقیقت بھی کھلی کہ حرام وحلال کی پابندی کا زیادہ خیال بھی شاید پاکستانی مسلمان ہی کرتے ہیں باقی ممالک حتیٰ کہ کئی دوسرے مسلم ممالک کے باشندے بھی ان پابندیوں کا زیادہ خیال نہیں رکھتے۔ اس سلسلے میں وہ بتاتے ہیں کہ لندن کے جس ہوٹل میں میں قیام پذیر تھا اس میں ایک اسلامی ملک کے صاحب بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ صاحب چونکہ انگریزی زبان سے ناواقف تھے اس لئے کئی بار میری مدد کے طالب ہوتے تھے۔ انشا بتاتے ہیں کہ ایک دن ہوٹل کی ملازمہ مسٹر واٹسن نے ان صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ کو ناشتے میں انڈا اور بیکن دیا جائے تو میں نے مسز واٹسن کو ایسا کرنے سے روکا اور بتایا کہ صاحب مسلمان ہیں اس لئے بیکن والا ناشتہ نہیں کریں گے۔ چنانچہ میرے بتانے پر انھوں نے انھیں صرف انڈے اور توس لا کر دیئے۔ یوں ان صاحب کو چاروناچار یہ ناشتہ کھانا پڑا لیکن اگلے ہی روز انھوں نے

خود فرمائش کی کہ مجھے انڈوں کے ساتھ بیکن بھی دیا جائے۔ میں نے انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ جناب آپ مسلمان ہیں اور اسلام میں ایسی اشیاء کھانے کی ممانعت ہے، تو کہنے لگے کہ جناب مسلمان کا ایمان معدے میں نہیں دل میں ہوتا ہے پھر اپنے عمل کی توجیح کرتے ہوئے وہ مزید کہنے لگے کہ جناب ویسے بھی سؤر پہلے گندگی کھاتا تھا اس لئے حرام کیا گیا تھا لیکن اب تو اسے ایسی خوراک دی جاتی ہے جس میں گندگی نام کی کوئی چیز نہیں ہے اس لئے اب اسے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ جناب مجھے تو اس سے باز ہی رکھیے، یہ سوغات آپ ہی کو مبارک ہو۔

بہر حال اَنشا کو پاکستان اور انگلستان میں گوشت کی دکانوں کے تقابل میں زیادہ تر اختلاف کے پہلو ہی نظر آئے۔ انھیں یہ پتا چلا کہ لیسٹر اور برمنگھم میں موجود گوشت کی دکانیں پاکستان میں موجود اس قسم کی دکانوں کے مقابلے میں زیادہ جدید طرز کی تھیں کیونکہ وہ پوری شیشے کی بنی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ انھیں یہاں کی دکانوں میں صحت وصفائی کی صورتحال، اس سلسلے میں کیے جانے والے حفاظتی اقدامات، گوشت کے انتخاب، نوعیت، پیش کش کے انداز اور گوشت رکھنے کے لئے دستیاب سہولتوں کی فراہمی غرض ہر حوالے سے پاکستان کے مقابلے میں انگلستان بہتر نظر آیا۔ یوں اَنشا کو پاکستان اور انگلستان میں موجود گوشت کی دکانوں میں ہر حوالے سے صرف اختلاف کے پہلو ہی نظر آئے۔

اس کے بعد اَنشا لندن کے بازاروں میں موجود دیگر اشیائے خورد ونوش کو اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ میرا خیال تھا کہ انگلستان چونکہ انگریزوں کا ملک ہے اس لئے یہاں کے بازاروں میں صرف انگریزوں کی خوراک میں استعمال ہونے والے مسالہ جات اور اشیائے خورد ونوش ہی ملتے ہوں گے۔ البتہ بازاروں کے سروے سے مجھے معلوم ہوا کہ یہاں دال، اچار، ہلدی، مرچ، دھنیا اور ایسے کئی مصالحے بھی عام ملتے ہیں جو ہمارے کھانوں میں استعمال ہوتے ہیں ۔ہاں اگر فرق تھا تو صرف یہ کہ یہاں گھی نہیں ملتا تھا جس کے متبادل کے طور پر مکھن ہر جگہ دستیاب تھا اور اگر کوئی شخص بضد ہو کہ اسے گھی ہی چاہیے تو ایسے شوقین حضرات کے لئے بعض دکاندار پنجاب کا دیسی گھی بھی منگوا کر رکھتے ہیں۔ یوں اَنشا کو انگلستان کے بازاروں کے معائنے اور سروے کے دوران اشتراک اور اختلاف کی دونوں صورتیں ہی نظر آئیں۔

اس کے بعد اَنشا انگلستان کے مشہور تجارتی مرکز آکسفورڈ اسٹریٹ کے دکانداروں کے طرز عمل کا تقابل اپنے ہاں کے دکانداروں سے کرتے ہیں۔ اس تقابل کے نتیجے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان دونوں ممالک کے دکاندار گاہکوں کی نفسیات سے خوب واقف ہوتے ہیں اسی لئے سیل یا رعایت کا لالچ دے کر یہ گاہکوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان دونوں ملکوں کے دکاندار پہلے تو اشیاء کی قیمت اصل قیمت سے کئی گنا بڑھا دیتے ہیں پھر رعایتی قیمت یا سیل میں وہی پرانی والی قیمت لکھ دیتے ہیں۔ یہ لوگ گاہکوں پر ظاہر کرتے ہیں کہ چیزوں کی قیمت بہت کم کر دی گئی ہے یوں گاہک بے چارہ فائدے کے لالچ میں خریداری پہ خریداری کیے جاتا ہے۔ اَنشا بتاتے ہیں کہ لندن کی آکسفورڈ اسٹریٹ کی دکانوں میں ہر چیز پر دو قیمتوں کی پرچی چسپاں ہوتی ہیں یہ پرچیاں کارخانے سے ہی لگی ہوئی آتی ہیں دکاندار خود بھی گاہکوں سے یہ

اصرار کرتے ہیں کہ چیزیں سیل یا رعایتی قیمت پر خریدیں ورنہ کہیں اور جائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آکسفورڈ اسٹریٹ جو دنیا کا سب سے بڑا خریداری کا مرکز ہے، وہاں بھی رعایتی قیمتوں کا لالچ دے کر گاہکوں کو بے وقوف بنایا جاتا ہے اور لوگ خریداری پر خریداری کیے جاتے ہیں۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ آکسفورڈ اسٹریٹ کے علاوہ یہاں کے آگوس نامی اسٹور میں بھی گاہکوں کو رعایتی واؤچر کے ہتھکنڈے سے بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ اس اسٹور میں ہر دس پونڈ کی خریداری پر ایک پونڈ کی رعایت والا واؤچر گاہک کو دیا جاتا ہے تا کہ اگر وہ دوبارہ خریداری کرنے آئے تو اس رعایتی واؤچر کو دکھا کر ایک پونڈ کی رعایت حاصل کر سکے۔ یوں گاہک بے چارہ رعایت پانے کے چکر میں خریداری پر خریداری کیے جاتا ہے۔ خود انشا نے بھی اس اسٹور سے بارہ سے چودہ پاؤنڈ کی خریداری کی جس کے بعد انھیں بھی ایک پونڈ والا رعایتی واؤچر دیا لیکن جلد ہی وہ اس رعایتی واؤچر کا مقصد جان گئے اور مزید خریداری سے باز رہے۔ بہر حال انھیں پاکستان اور انگلستان کے دکانداروں کے طرز عمل میں یہ اشتراک نظر آیا کہ دونوں ہی سیل یا رعایت کا لالچ دے کر گاہکوں کو بے وقوف بناتے ہیں اور خوب منافع کماتے ہیں۔

قصہ مختصر، انشا نے پاکستان اور انگلستان کے بازاروں کا تقابل مختلف حوالوں اور زاویوں سے کیا جس کے نتیجے میں انھیں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

اخبارات

آج کل کے دور میں اخبارات کی ضرورت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ دور میں جو شخص جتنا زیادہ باخبر ہے اتنا ہی زیادہ زندگی میں کامیاب نظر آتا ہے۔ دنیا سمٹ کر ایک گلوبل ولیج بن چکی ہے اس لئے یہ ضروری ہو چکا ہے کہ ہر شخص دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور واقعات سے باخبر رہے تا کہ وہ اپنے آپ کو بدلتے ہوئے حالات اور وقت کے مطابق ڈھال سکے۔ یوں تو ہر باشعور شخص اخبارات میں دلچسپی لیتا ہے لیکن انشا کی دلچسپی اخبارات سے اس لئے بھی تھی کہ وہ خود بھی ایک کالم نگار تھے۔ وہ نہ صرف اپنے ملک کے اخبارات میں دلچسپی لیتے تھے بلکہ جب انھیں سرکاری فرائض کی انجام دہی کی غرض سے یورپ اور امریکہ جانا پڑا وہ ان ممالک کے اخبارات کا یا تو خود مطالعہ کیا پھر کسی ترجمان کی مدد سے ان اخبارات کے نفس مضمون سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ پاکستانی اخبارات کے رنگ ڈھنگ سے تو یقیناً واقف ہوں گے لیکن انھوں نے یورپی ممالک کے اخبارات کے مطالعے کے بعد اپنے قارئین کو یہ بتایا کہ آیا پاکستانی اخبارات بہتر ہیں یا یورپی ممالک کے اخبارات اور اگر ہیں تو کیوں؟ یورپ کے سفر کے دوران انشا کو بیرونی ممالک کے اخبارات میں جو اشتراکات اور اختلافات نظر آئے انھیں ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

انشا کی دفتری مصروفیات نے انھیں کئی بار لندن کے سفر کے مواقع بھی فراہم کیے۔ وہاں قیام کے دوران انھوں

نے وہاں کے اخبارات کا مطالعہ بھی کیا۔ انھیں یہ جان کر بڑی حیرانی ہوئی کہ انگلستان میں بسنے والوں کی اکثریت کی زبان انگریزی ہے لیکن پھر بھی وہاں اردو زبان میں اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ جب وہ پاکستان میں شائع ہونے والے اردو اخبارات کا موازنہ لندن میں شائع ہونے والے اردو اخبارات سے کرتے ہیں تو انھیں لندن میں شائع ہونے والے اردو اخبارات پاکستان میں شائع ہونے والے اردو اخبارات سے بہتر نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ لندن کے اردو اخبارات پاکستان کے حالات وواقعات کے بارے میں پاکستانی اردو اخبارات سے زیادہ معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں کے اخبار فضول و بے مقصد خبروں اور قتل و اغواء جیسی سنسنی خیز اور ہیجان آمیز خبروں سے صفحات پُر کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ ہی مسالے دار خبروں کو اخبار کی زینت بناتے ہیں بلکہ صرف ضروری اور با مقصد خبروں ہی کو اخبارات میں جگہ دیتے ہیں۔ اس کے بعد جب انھوں نے دونوں ملکوں کے اخبارات میں موجود خبروں کا تجزیہ کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ لندن کے اردو اخبارات انتہا پسندی کی بجائے مثبت اور متوازن انداز نظر کو پیش نظر رکھتے ہیں جبکہ پاکستان کے اردو اخبارات خبروں میں سنسنی اور انتہا پسندی کے رجحان کو فروغ دے رہے ہیں۔ یہ لوگ جب تک خبر کو مرچ مسالہ نہ لگائیں اس وقت تک اسے قابل اشاعت نہیں سمجھتے لیکن ایسی رنگ آمیزی نے ان کے اخبارات کی قدو قیمت میں اضافہ کرنے کی بجائے الٹا نقصان پہنچایا ہے۔ بہرحال انؔشا نے جب پاکستان اور انگلستان میں شائع ہونے والے اردو اخبارات کے تقابل سے یہ ثابت کیا ہے کہ لندن میں شائع ہونے والے اردو اخبارات خبروں کی صحت، متوازن انداز فکر غرض ہر حوالے سے پاکستان میں شائع ہونے والے اردو اخبارات سے زیادہ بہتر ہیں اور اس حوالے سے ان میں زیادہ تر اختلاف کے پہلو ہی موجود ہیں۔

محنت کش طبقہ

انؔشا نے دوران سیاحت جہاں دیگر باتوں کا مطالعہ و مشاہدہ کیا وہیں وہاں کے محنت کش طبقے کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ انھیں پاکستان، یورپ اور امریکہ کے محنت کش طبقے میں جو اشتراکات اور اختلافات نظر آئے انھیں ذیل میں مختلف محنت کشوں کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے۔

قلی وہ محنت کش ہے جس سے اکثر سیاحوں اور مسافروں کا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ انؔشا بتاتے ہیں کہ یورپ کے سفر کے دوران مجھے اس بات کا پتا چلا کہ وہاں قلی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ وہاں ہر شخص اپنا کام خود کرتا ہے جبکہ ہمارے ہاں نوکروں، ملازموں اور مددگاروں کی کمی نہیں ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ مجھے اور میرے دوست عبدالعزیز کو جرمنی کے سفر کے دوران وہاں کے پورٹر سے واسطہ پڑا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہمارا سامان اتنا زیادہ تو نہ تھا لیکن چونکہ ہم ہوائی اڈے کے غلط دروازے پر اترے تھے اس لئے ہمیں پورٹر کی ضرورت پڑ گئی۔ انھوں نے جیب سے چار روپے نکالے اور پورٹر کے

حوالے کر دیئے اور امید کی کہ یہ روپے لے کر وہ خوش ہو گا لیکن اس نے تکرار شروع کر دی اور چھ روپے لے کر ہی چپ ہوا۔ انشا کو یہ دیکھ کر اپنے ملک کے قلی بہت یاد آئے جو سامان بھی بہت اٹھاتے ہیں اور زیادہ پیسوں کا تقاضا بھی نہیں کرتے تھے۔ یہ محنت کش بخشش کے لئے التجا ضرور کرتے ہیں لیکن چونی یا دونی زیادہ مل جانے پر ہی راضی ہو جاتے ہیں اور نہ ہی مسافروں کو قانون کی دھمکی دیتے ہیں۔ یوں انشا کو پاکستان اور جرمنی کے قلیوں میں اختلاف کا پہلو ہی نظر آیا البتہ اس اختلاف میں انھیں پاکستانی قلی زیادہ بہتر نظر آئے۔

دنیا کی اکثر اقوام میں بالوں کو ترشوانے کا رواج موجود ہے، اس کام کے لئے دنیا کے اکثر ممالک میں حجام موجود ہوتے ہیں۔ انشا نے دوران سیاحت دنیا کے مختلف ممالک کے حجاموں کا تقابل بھی کیا۔ جب وہ پاکستان اور لندن کے حجاموں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں پاکستانی حجام زیادہ بہتر نظر آتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ لندن میں مجھے ایک حجام سے حجامت کرانے کا اتفاق ہوا۔ اس نے ایک کنگھا اور بجلی کی ایک مشین اٹھائی اور مجھے ایک اخبار پڑھنے کے لئے دے دیا، ابھی میں آدھی سرخی بھی نہ پڑھ پایا تھا کہ اس نے چھ شلنگ کا تقاضا کر کے اگلے امیدوار کو آنے کا کہہ دیا۔ وہ کہتے ہیں اس حجام سے حجامت کروانے کا مجھے ذرا بھی مزا نہ آیا۔ کیونکہ کراچی میں جس حجام سے میں بال کٹواتا تھا وہ خلیفہ صاحب مجھے دنیا بھر کے اہم مسائل اور حالات و واقعات کے علاوہ گھریلو استعمال کی اشیاء کے نرخ بھی بتاتے تھے اور پیسے بھی کم لیتے تھے۔ اس کے علاوہ پیسے ملنے پر وہ ہزار بار شکریہ بھی ادا کرتے تھے جبکہ لندن کے اس حجام نے چھ شلنگ لینے کے باوجود شکریہ بھی نہ کیا۔ یوں ان دونوں ممالک کے حجام میں انشا کو اختلاف کا پہلو ہی نظر آیا۔

ایک مسافر یا سیاح کو ٹیکسی ڈرائیوروں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ انشا جب پاکستان اور ہالینڈ کے ٹیکسی ڈرائیوروں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں پاکستان کے ٹیکسی ڈرائیوران سے بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہالینڈ کے ٹیکسی ڈرائیور تو تھوڑے سے فاصلے کا بھی بہت زیادہ معاوضہ مانگتے ہیں اور اگر مسافر کے پاس کھلے پیسے نہ ہوں تو فالتو پیسے بغیر پوچھے ہی بخشش کے طور پر رکھ لیتے ہیں جبکہ پاکستانی ڈرائیور ایسا نہیں کرتے۔

بہر حال انشا کو پاکستان، انگلستان اور جرمنی کے محنت کشوں میں صرف اختلاف کے پہلو ہی نظر آئے۔

حادثات

ہر ملک کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس میں امن وامان کی صورتحال تسلی بخش ہوتا کہ اس کے باشندے امن وسکون سے رہ سکیں۔ انشا جب امن وامان کے حوالے سے پاکستان اور امریکہ کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں پتا چلتا ہے کہ پاکستان میں امن وامان کی صورتحال امریکہ سے کہیں بہتر ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ امریکہ میں تھینکس گیونگ ڈے جیسے مذہبی تہوار کے موقع پر سب سے زیادہ حادثات ہوتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ پورے امریکہ میں سینکڑوں افراد اس دن مارے جاتے

ہوں گے صرف سان فرانسسکو کا حال یہ ہے کہ یہاں ۲۱ افراد صرف ٹریفک کے حادثات کا شکار ہوئے اور اتنے ہی قتل و غارت میں مارے گئے۔ اس دن بہت سے لوگ اغواء بھی ہوئے اور بدمعاشی کے بہت سے واقعات بھی رونما ہوئے۔ انشا کہتے ہیں کہ پاکستان میں بھی امن وامان کی صورتحال گو کہ تسلی بخش نہیں ہے لیکن یہاں پورے سال میں اغواء اور قتل و غارت گری کے اتنے واقعات رونما نہیں ہوتے جتنے امریکہ میں صرف تھینکس گیونگ ڈے کے موقع پر ہوتے ہیں۔

مذہب

انشا نے یورپ اور امریکہ کے سفر کے دوران جہاں دیگر حوالوں سے معلومات اکٹھی کیں وہیں مذہبی حوالے سے معلومات بھی اکٹھی کیں۔ انھوں نے مختلف مذاہب کے لوگوں کے اعتقادات، مذہبی جوش و جذبے اور دیگر حوالوں سے معلومات اکٹھی کیں اور ان کا تقابل پاکستانیوں کی متعلقہ معلومات سے کر کے ان کے درمیان اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کی۔ ذیل میں ان اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کی جاتی ہے۔

انسان اس دنیا میں آتا ہے تو کبھی اس سے اختیاری اور کبھی بے اختیاری طور پر بہت سے گناہ سرزد ہو جاتے ہیں۔ انشا جب گناہوں کی بخشش کے حوالے سے اسلام اور عیسائیت کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں ان دونوں مذاہب میں گناہوں کی بخشش کے طریقۂ کار کے حوالے سے اختلاف نظر آتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ لندن کے رائل ماسیڈن اسپتال میں ہر ہفتے ایک پادری آتا تھا اور وہاں موجود لوگوں سے کہتا تھا کہ جو شخص دل سے معافی مانگے تو میں اسے خداوند سے معافی دلوا سکتا ہوں۔ انشا بتاتے ہیں کہ میں نے بھی گناہوں کے اعتراف کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ یہ آسانی صرف رومن کیتھولک فرقے کے ماننے والوں کے لئے ہے۔ انشا نے سوچا کہ اسلام میں تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ ہمارے گناہوں کو معاف کرے یا نہ کرے جبکہ عیسائیت کے رومن کیتھولک کے فرقے میں ایک پادری کے پاس گناہوں سے معافی کا اختیار بھی ہوتا ہے۔

انشا نے مذہبی عبادت گاہوں کو بھی اپنے تقابل کا حصہ بنایا۔ وہ بتاتے ہیں کہ مجھے مسلمانوں اور عیسائیوں میں یہ اشتراک نظر آیا کہ دونوں اقوام اپنے مذہبی جوش و جذبے کے تحت عبادت گاہیں تعمیر تو کر لیتے ہیں لیکن ان کی عبادت گاہیں زیادہ تر ویران نظر آتی ہیں۔ انشا بتاتے ہیں کہ برطانیہ کی تاریخ پڑھ کر مجھے پتا چلا کہ الفریڈ نامی بادشاہ نے اپنے مذہبی جوش و جذبہ کے تحت بہت سی خانقاہیں تعمیر کروائیں تا کہ زیادہ سے زیادہ افراد راہب بن کر اپنی زندگیاں خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بسر کرسکیں البتہ اس دور کے انگریزوں کا رجحان چونکہ اس طرف نہ تھا اس لیے اس نے پھر فرانس سے راہب منگوا کر اپنی خانقاہیں بسائیں۔ ہمارے ہاں بھی بالکل اسی طرح دولت منداور صاحب ثروت حضرات مساجد تعمیر تو کروا دیتے ہیں لیکن یہ مساجد زیادہ تر ویران ہی نظر آتی ہیں۔ نمازیوں کی تعداد کے بارے میں وہ

بتاتے ہیں کہ کئی علاقے تو ایسے ہیں جہاں ایک ایک نمازی کے لیے تین تین مساجد ہوتی ہیں۔ یوں انشا کو پاکستان کے مسلمانوں اور انگلستان کے عیسائیوں میں یہ اشتراک تو نظر آیا کہ دونوں مذہبی جوش و جذبے کے باعث عبادت گاہیں تعمیر کر دیتے ہیں لیکن خود عبادت کرنے سے کتراتے ہیں۔

مذہب ایسا زاویہ ہے جس کا اثر ہمارے ظاہری حلیے پر بھی پڑتا ہے۔ انشا جب پاکستان اور انگلستان کے لوگوں کے ظاہری حلیے کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں پتا چلتا ہے کہ ہمارے مذہب میں داڑھی رکھنے کو مستحسن سمجھا جاتا ہے جبکہ یورپ میں داڑھی کو جہالت اور آوارگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یوں مذہب کے اختلاف کے باعث انھیں کو ان دونوں ممالک کے لوگوں کے ظاہری حلیے میں بھی اختلاف نظر آیا۔

ہر مذہب کے ماننے والے اپنے مذہبی تہواروں کو بڑے جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ انشا کو پاکستان اور امریکہ میں بسنے والے لوگوں کے طرز عمل میں یہ اشتراک نظر آیا کہ دونوں اپنے مذہبی تہوار کو بڑے جوش و خروش سے مناتے ہیں اور ایسے مواقع پر مخصوص پکوان بھی بناتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ انھیں یوں ہوا کہ جب وہ تھینکس گیونگ ڈے والے دن امریکہ پہنچے تو انھوں نے جہاز میں ٹرکی کھائی۔ اسی شام جب وہ بازار گئے تو وہاں بھی کھانے میں ٹرکی ہی کھائی۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس دن انھوں نے اتنی ٹرکی کھائی کہ زندگی بھر دوبارہ ٹرکی کھانے کو ان کا دل نہ چاہا۔ پاکستان میں بھی عید کے موقع پر صرف سویاں پکائی جاتی ہیں اس لئے تقریباً ہر گھر میں سویاں ہی کھائی جاتی ہیں۔ یوں انشا کو پاکستان اور امریکہ کے لوگوں کے طرز عمل میں یہ اشتراک نظر آیا کہ دونوں ہی اپنے مذہبی تہواروں پر مخصوص پکوان پکاتے ہیں۔

بہر حال انشا کو پاکستان، یورپ اور امریکہ میں مذہبی حوالوں سے اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

تاریخی ورثہ

کسی ملک کا تاریخی ورثہ اس کی پہچان ہوتا ہے۔ انشا جب تاریخی ورثے کے حوالے سے پاکستان اور امریکہ کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ زندگی کے باقی میدانوں میں تو ہم سے آگے ہے لیکن اس کے پاس ایک شاندار ماضی نہیں ہے۔ جبکہ ہم لوگ سائنسی ترقی کے اعتبار سے بہت پیچھے ہیں جس کے باعث نہ تو ہمارا حال بہتر نظر آتا ہے اور نہ ہی مستقبل، لیکن ہمارے پاس ایک شاندار ماضی موجود ہے۔ بہر حال انشا کو پاکستانیوں اور امریکیوں میں یہ اختلاف نظر آیا کہ پاکستانیوں کے پاس ایک شاندار ماضی ہے جبکہ امریکہ ایک ترقی یافتہ قوم ہونے کے باوجود شاندار ماضی سے محروم ہیں۔

آثارِ قدیمہ

عام زندگی میں ہم نئی چیزوں کو اہمیت دیتے ہیں لیکن آثارِ قدیمہ میں جو چیز جتنی پرانی ہوگی اس کی اتنی ہی زیادہ اہمیت ہوگی۔ انؔشا کو لندن کی نیچرل ہسٹری میوزیم جانے کا اتفاق ہوا، وہاں انھوں نے دیگر اشیاء کے ساتھ ساتھ ایک پرانا درخت بھی دیکھا۔ وہ بتاتے ہیں کہ یوں تو ہمارے ہاں بھی بہت پرانے درخت موجود ہیں جن کی عمر کا اندازہ ان کی داڑھیوں سے ہوتا ہے۔ لیکن اس درخت کی قدامت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ چھٹی صدی کے اواخر میں جب سلطنت روم پر زوال آیا تو اس وقت اس درخت کی عمر ۴۳ برس تھی، ہجرت مدینہ کے وقت اس کی عمر ۶۵ برس تھی اور جب برطانیہ کا الفرڈ اعظم بادشاہ بنا تو اس وقت اس درخت کی عمر تین سو سال تھی۔ پھر وہ بتاتے ہیں کہ یہ درخت لندن کے مشہور پل لندن برج سے بھی زیادہ قدیم ہے کیونکہ یہ پل اس درخت سے ۴۵۷ برس چھوٹا ہے۔ ۱۶۱۵ء میں جب میگنا کارٹا کے معاہدے پر دستخط ہوئے تو اس وقت یہ درخت ساڑھے چھ سو برس کا تھا یعنی وہ اسے بہت پرانا درخت سمجھتے ہیں۔

لندن قیام کے دوران انؔشا نے برٹش میوزیم کا سروے بھی کیا۔ اس میوزیم میں مصری تہذیب کے کچھ ماڈل موجود تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس میوزیم میں اس دور کے بادشاہوں اور پروہتوں کی زندگی کو بھی ماڈلوں کی صورت میں پیش کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس میوزیم میں اس تہذیب کے تین ہزار سال قبل کے آلات زراعت اور دیگر ہتھیار بھی دیکھے۔ البتہ انھیں اپنے دور کے آلات زراعت ان سے بہتر معلوم ہوئے کیونکہ یہ ان آلات کی نسبت نئے تھے۔ وہ طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لباس بھی دونوں جگہ تقریباً ایک جیسا تھا البتہ پانی نکالنے کے آلات اور طریقے ہماری نسبت قدرے بہتر تھے۔ یہی نہیں مصریوں نے اگر اہرام بنا دیئے تو کیا ہوا، ان میں اول تو کوئی خاص بات نہیں ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی تعمیر میں بیس بیس، تیس تیس سال کا عرصہ لگ گیا۔ یوں تو ہمارے ہاں بھی مینار پاکستان تقریباً دس سال سے تعمیر ہو رہا ہے اور معلوم نہیں کہ اس کی تعمیر میں کتنا عرصہ لگ جائے۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارے مینار پاکستان کی تکمیل میں اہرام مصر کی تعمیر سے بھی زیادہ عرصہ لگ جانے اور یہ برتری بھی ہمارے حصہ میں ہی آ جائے۔ لباس اور زبان کی بات کی جائے تو یہاں بھی ہم ان سے آگے ہیں کیونکہ ہم انگریزی لباس پہنتے ہیں اور انگریزی زبان بولتے ہیں جبکہ قدیم مصری باشندے نہ تو انگریزی زبان جانتے تھے اور نہ ہی انگریزی لباس پہنتے تھے۔ بہر حال اس سارے تقابل سے انؔشا نے مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں یہ ثابت کیا کہ پاکستانی قوم ترقی کے اعتبار سے قدیم مصریوں سے بھی پیچھے ہے۔

شجرۂ نسب

پاکستان سمیت دنیا کے کئی ملکوں میں بھانڈ موجود ہیں جو لوگوں کا شجرۂ نسب یاد کر کے سناتے ہیں اور انعام و کرام پاتے ہیں۔ انشاؔ جب پاکستان اور افریقہ کے بھانڈوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے بھانڈ افریقہ کے بھانڈوں کے مقابلے میں زیادہ ماہر ہیں۔ اس بات کا اندازہ انھیں اس بات سے ہوا کہ مشہور ناول نگار ایکسن ہیلی نے اپنا شجرۂ نسب افریقہ کے بھانڈوں سے بنوایا۔ ایکسن ہیلی یوں تو ایک سیاہ فام امریکی تھا لیکن اس نے یہ شجرۂ نسب بنوا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ ایک شاندار ماضی رکھتا ہے۔ اس کا یہی خاندانی پس منظر اس کے ناول کی شہرت کا باعث بنا۔ تاہم جلد ہی سنڈے ٹائمز کے ایک مضمون نگار، مارک اٹادے نے خوب چھان بین کی اور یہ ثابت کیا کہ تو کنٹا کنٹے نام کا کوئی شخص ہی نہیں تھا جسے غلام بنا کر بیچا گیا ہو، تو پھر یہ فرضی شخص ایکسن ہیلی کا والد کیسے ہو سکتا ہے۔ انشاؔ نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایکسن ہیلی نے افریقہ کے بھانڈوں سے اپنا شجرۂ نسب تبدیل کروانے کی کوشش کی تھی لیکن یہ بھانڈ چونکہ اپنے کام میں اتنے ماہر نہ تھے اس لئے مارک اٹادے کی تحقیق سے ان کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ایکسن ہیلی کو اپنا شجرۂ نسب تبدیل کروانا ہی تھا تو اس سلسلے میں پاکستانی بھانڈوں کی خدمات حاصل کرتے۔ کیوں کہ ہمارے ہاں کے بھانڈ جھوٹ بولنے اور بے ایمانی کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ یوں مارک اٹادے تو کیا کوئی بھی بڑے سے بڑا محقق ان کی اصلیت تک نہ پہنچ پاتا۔ بہر حال انشاؔ کو پاکستان اور افریقہ کے بھانڈوں میں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

فنونِ لطیفہ

ہر انسان اپنے جذبات و احساسات کا اظہار چاہتا ہے۔ فنونِ لطیفہ درحقیقت انسانی جذبات و احساسات کے اظہار ہی کا ذریعہ ہیں۔ فنونِ لطیفہ میں موسیقی، شاعری، فنِ تعمیر اور ظروف سازی و نقاشی جیسے فنون شامل ہیں۔ انشاؔ نے یورپ اور امریکہ کے سفر کے دوران ان ممالک کے فنونِ لطیفہ کا بڑی باریکی سے مشاہدہ بھی کیا اور ان کا تقابل اپنے ملک کے فنونِ لطیفہ سے کر کے ان کے درمیان موجود اشتراک اور اختلاف کی صورتوں کو واضح کیا۔ انھیں پاکستان، یورپ اور امریکہ کے فنونِ لطیفہ میں اشتراک اور اختلاف کے جو پہلو نظر آئے انھیں ذیل میں الگ الگ بیان کیا جاتا ہے۔

شاعری:

انسانی جذبات کے اظہار کے یوں تو بہت سے ذرائع ہیں لیکن ان میں سب سے موزوں ذریعہ شاعری ہے۔ انشاؔ خود بھی ایک شاعر تھے اس لئے انھوں نے فنونِ لطیفہ کی اس شاخ کا بطورِ خاص جائزہ لیا۔ انھوں نے یورپ اور امریکہ

جیسے ممالک میں اس فن کے مختلف زاویوں کو اپنا موضوع بنا کر قارئین تک کئی طرح کی معلومات پہنچائیں۔

انشا نے انگلستان قیام کے دوران وہاں کی شاعری کو بھی اپنے مطالعے کا موضوع بنایا۔ وہ پاکستانی، ہندی اور انگریزی شاعری کا تقابل کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انگریزی شاعری میں اگر محبوب سے گفتگو کا آغاز کرنا ہو تو پہلے موسم پر بات کی جاتی ہے۔ البتہ ان اشعار کے صرف وہی مطالب سمجھے جاتے ہیں جو ظاہری ماحول اور گردوپیش کے حوالے سے ہوتے ہیں، یوں ان میں معانی کی کوئی اور تہہ پوشیدہ نہیں ہوتی۔ جبکہ ہمارے ہاں کی شاعری میں موسم کا ذکر بھی صرف موسم تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کے کئی مطالب لیے جاتے ہیں۔ فیض جیسے شاعر ہی کو لے لیجئے جن کے ہاں کئی اشعار میں معانی کی کئی تہیں موجود ہوتی ہیں، ان کے ہاں کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جو عشقِ مجازی کے ساتھ ساتھ سیاسی رنگ بھی لیے ہوئے ہیں۔ انشا نے درست فرمایا ہے واقعی فیض دونالی قلم سے شعر لکھتے ہیں جس کی ایک نال کوئے یار کی طرف اور دوسری سوئے دار کی طرف نشانہ لیے رہتی ہے۔

پاکستانی شاعر فیض احمد فیض کی شاعری میں عشق مجازی اور سیاسی رنگ کا امتزاج ملاحظہ کریں۔

"تھم گیا شورِ جنوں، ختم ہوئی بارشِ سنگ
خاکِ راہ آج لئے ہے لبِ دل دار کا رنگ
کوئے جاناں میں کھلا میرے لہو کا پرچم
دیکھیے دیتے ہیں کس کس کو صلا میرے بعد" ۱۷

اس کے بعد وہ ہندی شاعری کی طرف آتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ بچپن میں میں نے ہندی شاعری کے چند اشعار پڑھے جن کے متعلق یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کس شاعر کے ہیں لیکن ان میں بھی موسم کا حوالہ موجود ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

"برس رہی ہیں لہو کی بوندیں
رنگی ہوئی ہے لہو میں چولی
بتاؤ ساون کہ ماس پھاگن؟
ملہار گاؤں کہ گاؤں ہولی" ۱۸

درجہ بالا اشعار کو بغور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اشعار میں موسم کا حوالہ بھی موجود ہے اور ہندوؤں کے مذہبی تہوار ہولی کے تذکرے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ان اشعار میں مذہبی جذبات کا رنگ بھی نمایاں ہے۔

یوں پاکستان، انگلستان اور ہندوستان کی شاعری کے تقابل سے انھیں یہ پتا چلا کہ پاکستان اور ہندوستان کے شعراء میں اس حوالے سے تو اشتراک موجود ہے کہ ان کی شاعری میں معانی کی کئی تہیں ہوتی ہیں۔ پاکستانی شعراء کے

اشعار میں عشق مجازی کے رنگ کے ساتھ ساتھ سیاسی رنگ بھی موجود ہوتا ہے جبکہ ہندو شعراء کے ہاں موسم کے حوالے سے موجود اشعار میں مذہبی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔البتہ انگریز شعراء کے ہاں موسم کے حوالے سے موجود اشعار کے کوئی دوسرے معانی نہیں ہوتے۔انگریزی شاعری میں محبوب کی تعریف سے پہلے صرف رسماً موسم کے حوالے سے بات کی جاتی ہے اس لئے اس قسم کے اشعار کہے جاتے ہیں اس لئے ان کی شاعری میں اس قسم کے اشعار کے صرف وہی معانی مراد لئے جاتے یں جو موسم کے حوالے سے ہوتے ہیں۔

یوں انشا کو پاکستان اور انگلستان کی شاعری کے تقابل میں تو صرف اختلاف کا پہلو نظر آیا البتہ پاکستان اور ہندوستان کی شاعری میں اختلاف کے ساتھ ساتھ اشتراک کا پہلو بھی نظر آیا۔

موسیقی:

موسیقی بھی فنون لطیفہ کی ایک شاخ ہے۔اسے روح کی غذا بھی کہا جاتا ہے۔دنیا کے بیشتر مما لک میں اس فن سے وابستہ افراد اوراسے سراہنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔موسیقی کی طرح کوئی بھی فن اس وقت تک صحیح طور پر نہیں پنپ سکتا جب تک اس فن سے وابستہ فنکاروں کو خاطر خواہ پذیرائی نہ ملے۔انشا جب موسیقی سے وابستہ افراد کی پذیرائی کے حوالے سے پاکستان اور یورپ کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں صرف اختلاف کی صورت ہی نظر آتی ہیں۔ان اختلافات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان میں فنکاروں کی کوئی قدر نہیں کی جاتی جب کہ یورپ میں فن اور فنکار دونوں کو بڑے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔وہ بتاتے ہیں کہ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب ویانا میں سیر وتفریح کے دوران ایک گائیڈ نے مجھے ایک مجسمے کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ موتسارٹ کا مجسمہ ہے، پھر شون برس پیلس میں بھی اس نے مجھے موتسارٹ کی کئی تصویریں دکھائیں۔یوں موتسارٹ کی تصاویر کو جا بجا آویزاں دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ویانا میں اہل فن خصوصاً موسیقی سے وابستہ فنکاروں کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔موتسارٹ کی طرح بیتھوون بھی ایک گویا تھا،انشا کو موتسارٹ کے علاوہ بیتھوون، باخ اور شوبرٹ کے مجسمے بھی ویانا میں جگہ جگہ دکھائی دیئے اور یہ بھی پتا چلا کہ ان کے نام پر سڑکوں کے نام بھی رکھے جاتے ہیں۔یوں یہ لوگ ان تمام طریقوں سے فن اور فنکار دونوں کو خراج تحسین پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں کے لوگ موسیقی سے وابستہ افراد کو نہ تو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور نہ ہی ان کی مالی اعانت کرتے ہیں۔پاکستان میں صرف ریڈیو پاکستان جیسا حکومتی ارادہ اور فلم کمپنیاں ہی بدحالی کے دنوں میں ان فنکاروں کی مالی امداد کرتی ہیں۔جبکہ ویانا جیسا ملک جہاں نہ تو ریڈیو پاکستان جیسا حکومتی ادارہ موجود ہے اور نہ ہی فلم کمپنیاں،لیکن پھر بھی وہاں کے عوام ہی ان فنکاروں کی مالی اعانت کرتے ہیں۔یوں انشا کو اس بات کا اندازہ ہوا کہ ویانا سمیت یورپ کے دیگر مما لک میں فن اور فنکار کی بہت قدر کی جاتی جبکہ پاکستان میں ایسا نہیں کیا جاتا

یوں اس حوالے سے پاکستان اور یورپ میں خاصا اختلاف موجود ہے۔

فن مصوری و نقش نگاری:

نقش نگاری کا شمار بھی فنون لطیفہ میں ہوتا ہے۔ دنیا کے کئی ممالک میں یہ فن موجود ہے۔ انشا بتاتے ہیں کہ ہالینڈ قیام کے دوران میں اپنے ایک دوست سے ملنے ڈیلفٹ گیا۔ وہاں ٹاؤن ہال کے اردگرد کے مناظر سے میں بہت محظوظ ہوا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ ڈیلفٹ کے علاقے میں ظروف اور ٹائلوں پر نقش نگاری کا کام بڑی خوبصورتی اور مہارت سے کیا جاتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ چینی مٹی کی صنعت یہاں بہت پرانی ہے بلکہ یہاں کا خاص فن ہے۔ انھیں ڈیلفٹ میں وہی رنگ نظر آیا جو ہمارے شہر ملتان کی خصوصیت ہے۔ یوں انھیں پاکستان اور ہالینڈ میں اس فن کی موجودگی کے حوالے سے اشتراک کی ایک صورت نظر آئی۔

الغرض، انشا کو پاکستان، یورپ اور کئی دیگر ممالک کے فنون لطیفہ میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

زبان

زبان رابطے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ باہمی لین دین اور تبادلۂ خیال میں اس کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کسی مسافر یا کسی سیاح کو کسی دوسرے ملک جا کر جو مسائل پیش آتے ہیں ان میں سے ایک بڑا مسئلہ زبان سے عدم واقفیت کا بھی ہوتا ہے۔ انشا یوں تو کسی ملک میں جانے سے پہلے وہاں کی زبان کے چند زبان سیکھ لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان زبانوں کی ڈکشنریوں سے اور اشاروں کی زبان سے بھی کام چلا لیا کرتے تھے لیکن پھر بھی زبان سے عدم واقفیت نے انھیں کئی بار مسائل سے دوچار کیا۔ ذیل میں ان مسائل و مشکلات کی تفصیل ملاحظہ کیجئے۔

فرانس قیام کے دوران انشا کو فرانسیسی زبان سے عدم واقفیت نے کئی بار مسائل سے دوچار کر دیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ میرے ایک دوست ہاشم صاحب کو یہ دعویٰ تھا کہ وہ فرانسیسی زبان پر مکمل عبور رکھتے ہیں لہٰذا ایک دن مجھے ریستوران لے گئے اور تین فرانک کی کسی چیز کا آرڈر دے دیا۔ جب بیرا چیز لے آیا تو پتا چلا کہ یہ اکیس فرانک کی تھی۔ بل تو انھیں مجبوراً ادا کرنا پڑا لیکن آئندہ سے وہ اس دعویٰ سے دستبردار ہو گئے بلکہ دوسروں کو تلقین کرتے رہے کہ جب تک کسی زبان پر مکمل عبور نہ ہو اس وقت تک اسے باہمی لین دین میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

انشا نے اردو اور فرانسیسی زبان کا تقابل بھی کیا اور اس تقابل میں انھیں اشتراک کا پہلو ہی نظر آیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان دونوں زبانوں میں یہ مماثلت موجود ہے کہ انھیں پڑھنا تو آسان ہے لیکن بولنا مشکل۔ اس کی وجہ وہ بتاتے ہیں کہ لکھتے ہوئے ان دونوں زبانوں میں حروف کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور پڑھتے ہوئے ان میں سے کچھ حروف حذف کر

لیے جاتے ہیں۔فرانسیسی زبان میں اے سے زیڈ تک کے تمام حروف لکھے تو جاتے ہیں لیکن پڑھتے ہوئے ان میں سے کچھ حروف حذف کر لیے جاتے ہیں۔مثلاً لفظ پیرس ان کے ہاں پاری ہے اور کچھ فرانسیسی اسے بولتے ہوئے پفیہ بھی بنا ڈالتے ہیں۔اسی طرح فرانس کی مشہور سڑک جس کا نام CHAMP ELYSEES ہے، انگریزی میں تو اسے چیمپ الیزے ہی پڑھا جائے گا البتہ فرانسیسی میں اسے شانز الیزے پڑھا جائے گا۔فرانسیسی زبان کی اس خصوصیت کے باعث انشا کو فرانسیسیوں سے باہمی مکالمت کے دوران کافی دشواری پیش آئی کیونکہ وہ فرانسیسی زبان پڑھ تو لیتے تھے تو جب وہ یہ زبان بولتے تو فرانسیسی ان کی فرانسیسی سمجھ نہ پاتے۔یوں انشا کو اردو اور فرانسیسی زبان کے تقابل میں اشتراک کی صورت نظر آئی۔

انشا نے اردو اور جرمن زبان کا تقابل بھی کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان دونوں زبانوں میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو موجود ہیں۔لہجے کے اعتبار سے انھیں ان دونوں زبانوں میں اختلاف کا پہلو نظر آیا کیونکہ ایک ہی لفظ کو جب اردو اور جرمن زبان بولنے والے پڑھتے ہیں تو وہ دو مختلف صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔مثال کے طور پر مغربی برلن کی مرکزی شاہراہ کا نام KURFURSTEN ہے لیکن جب ہم لوگ اس لفظ کو اپنے لہجے سے ادا کریں گے تو یہ لفظ کفرستان کی صورت اختیار کر لے گا۔اس اختلاف کے ساتھ ساتھ انھیں اردو اور جرمن زبان کے رسم الخط میں یہ اشتراک بھی نظر آیا کہ ان دونوں زبانوں میں الفاظ کو ملا کر لکھا جاتا ہے۔جب وہ جرمن زبان کے رسم الخط پر غور کرتے ہیں تو انھیں حیرانی ہوتی ہے کہ اس زبان میں کئی لفظ اٹھارہ حروف سے مل کر بھی بنتے ہیں۔مثلاً کیلے کی گیلی جڑ کو یہاں کے لوگ کیلےکیگیلیجڑ لکھیں گے۔جس طرح ہمارے بھی کئی لوگ آجشبکو لکھتے ہیں اور پڑھنے والے آجش بکو پڑھتے ہیں۔یوں انشا کو اردو اور جرمن زبان میں لہجے کے اعتبار سے تو اختلاف نظر آیا لیکن رسم الخط کے اعتبار سے اشتراک کی صورت بھی نظر آئی۔

بہر حال انشا کو اردو، فرانسیسی اور جرمن زبان کے تقابل میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

الغرض، انشا کو پاکستان، یورپ، امریکہ اور کئی دیگر ممالک کی معاشرت کے تقابل میں اشتراکات کے ساتھ ساتھ اختلافات کے پہلو بھی نظر آئے۔

حوالہ جات

۱۔ ابن انشا،نگری نگری پھرا مسافر،طبع،دہم،لاہور،لاہورا کیڈمی،۲۰۰۹ء،ص،۱۳۴

۲۔ ابن انشا،دنیا گول ہے،طبع بست ویکم،لاہور،لاہورا کیڈمی،۲۰۰۱ء،ص،۲۵۲

۳۔ *His Tears to Thamasis* By Robert Herrick

Http://www.peotryatlas.com/poetry.poem.2760/

Date: 10 MARCH 2013, 4:04 Pm

۴۔ ابن انشا،دنیا گول ہے،طبع بست ویکم،لاہور،لاہورا کیڈمی،۲۰۰۱ء،ص،۳۱۶

۵۔ ایضاً ص،۲۶۸

۶۔ ابن انشا،آوارہ گرد کی ڈائری،طبع،دوازدہم،لاہور،لاہورا کیڈمی،۱۹۸۵ء،ص،۵۱،۵۲

۷۔ ابن انشا،نگری نگری پھرا مسافر،طبع دہم،لاہور،لاہورا کیڈمی،۲۰۰۹ء،ص،۱۶۳

۸۔ ابن انشا،ابن بطوطہ کے تعاقب میں،طبع سیزدہم،لاہور،لاہورا کیڈمی،۱۹۹۱ء،ص،۴۳،۴۴

۹۔ ابن انشا،آوارہ گرد کی ڈائری،طبع دوازدہم،لاہور،لاہورا کیڈمی،۱۹۸۵ء،ص،۱۵۱

۱۰۔ ایضاً ص،۲۲۳،۲۲۵

۱۱۔ ابن انشا،نگری نگری پھرا مسافر،طبع دہم،لاہور،لاہورا کیڈمی،۲۰۰۹ء،ص،۱۸۲،۱۸۳

۱۲۔ ایضاً ص،۱۸۰

۱۳۔ ایضاً ص،۱۶۰

۱۴۔ ابن انشا،دنیا گول ہے،طبع بست ویکم،لاہور،لاہورا کیڈمی،۲۰۰۱ء،ص،۲۵۷

۱۵۔ ابن انشا،آوارہ گرد کی ڈائری،طبع دوازدہم،لاہور،لاہورا کیڈمی،۱۹۸۵ء،ص،۱۳،۱۴

۱۶۔ ایضاً ص،۵۵

۱۷۔ نوازش،علی،ڈاکٹر (مرتب)،پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال،طبع دوم،راولپنڈی،گندھارا اسٹاکسٹ،۲۰۰۲ء،ص،۱۵۵

۱۸۔ ابن انشا،نگری نگری پھرا مسافر،طبع دہم،لاہور،لاہورا کیڈمی،۲۰۰۹ء،ص،۱۵۰

ماحصل

ابن انشا ایک قد آور علمی وادبی شخصیت تھے۔ وہ اپنے دور کے اہم شاعر، کالم نگار، مزاح نگار، مترجم اور سفر نامہ نگار تھے، اس کے علاوہ بچوں کے ادب میں بھی ان کی کوششیں بہت نمایاں رہیں۔ ان کی شخصیت کے یوں تو بہت سے رخ تھے لیکن اس مطالعے میں ہمارے پیش نظر ان کی شخصیت زیادہ تر بطور سفر نامہ نگار ہی رہی۔ انشا کے دور سے پہلے تک فن سفر نامہ کئی مراحل سے گزرا۔ ابن انشا کے عہد تک سفر نامہ ایک ایسی تحریر بن گیا جس میں احوال سفر کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے مقبول رجحانات کو بھی پیش نظر رکھا جانے لگا۔

انشا نے دنیا کے طول وعرض کا سفر اپنی سرکاری مصروفیات کی انجام دہی کی غرض سے کیا اور ان کا احوال اپنے پانچ سفر ناموں، *چلتے ہو تو چین کو چلیے*، *دنیا گول ہے*، *ابن بطوطہ کے تعاقب میں* *اور نگری نگری پھرا مسافر* میں بیان کر دیا۔

انھوں نے پاکستان اور بیرونی ممالک کی معاشرت کا تقابل کر کے ان کے درمیان موجود اشتراکات اور اختلافات کی وضاحت کی تاہم اس تقابلی مطالعے کو راقمہ نے مشرق بعید، مشرق وسطیٰ، یورپ اور امریکہ کی جغرافیائی حد بندی میں تقسیم کر دیا۔ ذیل میں ان تینوں جغرافیائی خطوں کی معاشرت کا تقابلی مطالعہ کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

مشرق بعید کے سفر ناموں میں زیادہ تر چین، جاپان، ہانگ کانگ، سنگاپور، ملائیشیا، انڈونیشیا، بھارت اور کئی دیگر ممالک کے تقابل کا احوال ملتا ہے۔ وقت کے حوالے سے جب وہ اس خطے کے ممالک کا تقابل کرتے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں جاپان کا وقت پاکستان کے وقت سے ۴ گھنٹے آگے ہے، چین کا وقت ۳ گھنٹے اور بنگلہ دیش کا وقت ہم سے ایک گھنٹہ پیچھے ہے۔ الماتا کا وقت ماسکو کے وقت سے تین گھنٹے آگے ہے اور ہمارے وقت سے دو گھنٹے آگے۔ جغرافیائی اعتبار سے پاکستان اور مشرق بعید کے ممالک کے تقابل میں انھیں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔ دریاؤں کے تقابل میں انھیں دریائے سندھ و ستلج، گنگا و جمنا اور دریائے ہوانگ اور ینگسی میں یہ اشتراک نظر آیا کہ یہ سارے دریا ایک وسیع وعریض رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں اور ان میں پانی کی ایک وافر مقدار موجود ہے لیکن یہ دونوں خوبیاں انھیں دریائے کابل میں نظر نہ آئیں۔ چوٹیوں کے تقابل میں انھیں ہانگ کی وکٹوریا چوٹی اور مری کی چوٹیوں میں بل کھاتی سڑکوں اور کیبل ٹرین کی موجودگی کے حوالے سے اشتراک نظر آیا۔ اس کے علاوہ انھیں کراچی کے متصل مقامات منوڑہ اور کیماڑی، ہانگ کانگ کے متصل مقامات جزیزہ ہانگ کانگ اور کولون اور سنگاپور کے متصل مقامات میں اشتراک کی یہ صورت نظر آئی کہ ان تینوں متصل مقامات میں سے ایک مقام خشکی کا قطعہ اور دوسرا پانی کا جزیرہ ہے، البتہ ان تینوں ممالک کی اپنے متصل مقامات سے تعلق کی نوعیت مختلف ہے۔ اس کے علاوہ سنگاپور کے خشکی کے قطعے میں ایک پل اور کولون کے خشکی کے قطعے میں

ایک ہوائی اڈا موجود تھا جبکہ کیماڑی میں پل اور ہوائی اڈے دونوں کی سہولت موجود نہ تھی۔ موسم کے تقابل میں انھیں پاکستان ،چین ،سری لنکا اور افغانستان کے موسم میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو نظر آئے۔چین کے کئی شہروں کے موسم میں انھیں پاکستان کے کئی شہروں کے موسم کی جھلک نظر آئی البتہ افغانستان میں موسم سرما میں پڑنے والی سردی اور اپنے ہاں پڑنے والی سردی میں انھیں کچھ زیادہ فرق محسوس نہیں ہوا۔سری لنکا کے موسم گرما میں پڑنے والی گرمی کراچی میں پڑنے والی گرمی سے انھیں زیادہ شدید لگی لیکن ملتان کے مقابلے میں بہت کم محسوس ہوئی۔اس کے علاوہ انھیں بارش کے حوالے سے پاکستانی اور انگریز قوم کے انداز فکر میں بھی اختلاف نظر آیا۔

اس کے بعد انشا پاکستان اور مشرق بعید کے باشندوں کا تقابل کرتے ہیں۔پاکستان اور چین باشندوں کے تقابل سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ چینی باشندے پاکستانی باشندوں کے مقابلے میں کم عمر کے دکھائی دیتے ہیں۔لباس کے معاملے میں بھی انھیں پاکستانی اور چینی باشندوں میں یہ فرق نظر آیا کہ چین میں عورتوں اور مردوں کے جوتے اور لباس ایک تو ایک جیسے ہوتے ہیں اور دوسرے چینی خواتین آرائش وزیبائش سے کام نہیں لیتیں۔البتہ جوتا پہننے کے آداب،استعمال اور نوعیت کے لحاظ سے انھیں پاکستانی ،جاپانی اور امریکی قوم میں کہیں اشتراک اور کہیں اختلاف کے پہلو نظر آئے۔

لباس کے بعد انشا خوراک کے حوالے سے پاکستان اور مشرق بعید کے لوگوں کا تقابل کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ اناج، دالوں اور سبزیوں کی قیمت اور دستیابی کی صورتحال پاکستان میں جاپان ، ہانگ کانگ اور چین کے مقابلے میں بہتر تھی البتہ چینی کی دستیابی کی صورتحال انھیں پاکستان کے مقابلے میں فلپائن ، ہانگ کانگ اور سنگاپور میں بہتر نظر آئی۔اس کے علاوہ گوشت کی قیمت ،دستیابی،نوعیت ،انتخاب اور لوگوں کی غذائی عادات کے حوالے سے پاکستان ، ہانگ کانگ ،چین اور جاپان میں اختلافی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔پھلوں کی قیمت اور نوعیت کے حوالے سے بھی انھیں ہانگ کانگ ،جرمنی ، انڈونیشیا اور پاکستان میں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

مشروبات کے تقابل میں چائے کے رنگ ، ذائقے ، اجزائے ترکیبی اور پیشکش کے حوالے سے صورتحال انھیں پاکستان کے مقابلے میں چین ، جاپان اور ایران میں زیادہ بہتر نظر آئی۔اس کے علاوہ پاکستانی کھانے مٹن تکہ اور انڈونیشیا کے کھانے سَاتے کے اجزائے ترکیبی ، بنانے کا طریقہ اور پیشکش کا انداز تو انھیں ایک جیسا لگا البتہ دونوں کھانوں کے ذائقے میں اختلاف محسوس ہوا۔

عادات واطوار کے تقابل میں انھیں وقت کی پابندی ، اپنی مدد آپ اور محنت ومشقت جیسی عادات کے حوالے سے چینی باشندے پاکستانی باشندوں سے بہتر نظر آئے۔البتہ بے لحاظی ، قیلولہ ، میانہ روی اور صفائی کے حوالے سے انھیں چین ، جاپان ، کوریا ، انڈونیشیا ، قازقستان ، ایران اور پاکستان میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو نظر آئے۔اس کے علاوہ ادب وآداب کے حوالے سے انھیں پاکستانیوں کے مقابلے میں جاپانی لوگ بہتر نظر آئے۔اخلاقی اعتبار سے جب وہ

پاکستان اوراس خطے کے باقی ممالک کے لوگوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں پتا چلتا ہے کہ جاپانی لوگ زیادہ محنتی، ایماندار، سچ بولنے والے اور صلح جو ہوتے ہیں۔ چینی اور جاپانی لوگ بخشش نہیں لیتے اور نہ ہی چین میں ذات پات کا نظام ہوتا ہے تاہم عفت وحیا کی صورتحال انھیں پاکستان میں بہتر نظر آئی۔ چوری اور اسمگلنگ جیسے جرائم میں انھیں پاکستان، سری لنکا اور جاپان کے لوگ زیادہ ملوث نظر آئے۔

ہوٹلوں اور سراؤں کے تقابل میں انھیں جاپان کے اعلیٰ درجے کے ہوٹل بھی پاکستان کے ادنیٰ درجے کے ہوٹل اور سراؤں سے سہولیات کی فراہمی، اشیائے خوردونوش اور کرائے میں کم قیمت کے حوالے سے کم درجے کے لگے۔ اسی طرح سری لنکا کے مسلم ہوٹل میں کراچی کے ملباری ہوٹل کے ظاہری نقشہ، صفائی کی صورتحال، بیروں کی مہارت اور چرب زبانی تو ایک جیسی لگی البتہ دونوں جگہ کے ہوٹلوں میں پکائے جانے والے کھانوں کے اجزائے ترکیبی میں انھیں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔ اس کے علاوہ صفائی کے ناقص انتظام اور حلال گوشت کی دستیابی کے حوالے سے انھیں پاکستان اور چین کے اسلامی ہوٹل میں اشتراک نظر آیا۔ پاکستان اور ہانگ کانگ کے کانٹی نینٹل ہوٹل میں اشیائے خوردونوش اور خدمات کا معاوضہ انھیں زیادہ لگا، اسی طرح پاکستان اور افغانستان کے ہوٹل میں ماہ رمضان میں چوری چھپے کھانے کا سلسلہ بھی ایک جیسا نظر آیا۔

تفریحی ذرائع کے تقابل میں انھیں کھیلوں کے طریقۂ کار کے حوالے سے پاکستان، جاپان اور انڈونیشیا میں اختلاف کا پہلو نظر آیا اور تفریحی مقامات کے حوالے سے پاکستان، بھارت، انگلستان اور سری لنکا میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔ ٹیلی ویژن پر پیش کیے جانے والے پروگراموں اور فلموں کی نوعیت اور اشتہارات کے حوالے سے اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو نظر آئے۔ اسی طرح جاپانی تھیٹر اور پاکستانی فلموں کے تقابل میں انھیں کہانی، مکالمے، سیٹ اور موسیقی غرض ہر حوالے سے فنی مہارت میں کمی کا احساس ہوا۔ تاریخی فلموں کے تقابل میں انھیں ایک انگریزی تاریخی فلم بائبل اور پاکستانی تاریخی فلم میں فنکاروں کی اداکاری تو ایک جیسی لگی البتہ واقعاتی توجیہہ کے حوالے سے اختلاف نظر آیا۔ پاکستانی، ایرانی اور امریکی ایکشن فلموں کے تقابل میں انھیں پاکستانی اور امریکی فلموں میں اوورایکٹنگ، حب الوطنی اور فحاشی وعریانیت کا مظاہرہ تو ایک جیسا نظر آیا البتہ ایرانی ایکشن فلمیں فحاشی اور عریانی سے پاک نظر آئیں۔ انشا کو یہ بھی پتا چلا کہ پاکستان اور ہانگ کانگ میں مرد اور خواتین کو بھی تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

ذرائع آمدورفت کے تقابل میں انشا پاکستان اور انڈونیشیا کے ذرائع آمدورفت میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔ اس کے علاوہ انھیں پاکستان، افغانستان، ہالینڈ اور فلپائن میں ڈرائیونگ کے طریقۂ کار میں بھی اختلاف کا پہلو نظر آیا۔ ریلوے نظام کے تقابل میں انشا کو پاکستان اور سری لنکا کے ریلوے نظام میں عملے کی تعیناتی اور بڑے اسٹیشن کی موجودگی کے حوالے سے اشتراک نظر آیا۔ ہوائی سفر کی سہولیات اور امور وسائل کے تقابل سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ چیکنگ میں سب سے زیادہ سختی ہانگ کانگ امیگریشن والے کرتے ہیں اور سب سے نرم رویہ پاکستانی اور

روسی امیگریشن والوں کا تھا۔ اس کے علاوہ انھیں فلپائن کے مسلمان مسافروں کا طرزِ عمل پاکستانی مسافروں سے بہتر نظر آیا۔

علاج معالجہ کی سہولتوں، ڈاکٹروں کی اقسام وتشخیص اور معالجین، ڈاکٹروں کے طریقۂ علاج، ڈاکٹری آلات کے طریقۂ استعمال اور ادویات کی اقسام کے حوالے سے انھیں جاپان پاکستان سے بہتر نظر آیا۔

اس کے بعد انشا پاکستان، کوریا، انڈونیشیا، افغانستان، جاپان اور چین کے تعلیمی نظام کا تقابل کرتے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ انڈونیشیا اور جاپان میں خواندگی کی شرح ۱۰۰ فیصد ہے لیکن ہمارے ہاں ۱۷ فیصد ہے، افغانستان میں یہ تناسب اور بھی کم ہے۔ پاکستان اور جاپان کے طالب علموں میں یہ اشتراک نظر آیا کہ دونوں ہی کسی منفی صورتحال میں شدید جذباتی ردِعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں اور پاکستان اور انڈونیشیا کے طالب علموں میں انھیں یہ اشتراک نظر آیا کہ دونوں ہی تعلیم کی بجائے سیاست میں حصہ لیتے ہیں۔ پاکستان اور چین کے نظامِ تعلیم میں انھیں یہ اختلاف نظر آیا کہ چین میں بچوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ فوجی تربیت بھی دی جاتی ہے جبکہ ہمارے ہاں یہ تربیت صرف فوجیوں کو دی جاتی ہے۔ پاکستان، چین، بھارت، انڈونیشیا، جاپان اور ملائیشیا کے سیاسی نظام میں انھیں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔ پاکستان کے مقابلے میں انھیں چین کا عدالتی نظام زیادہ بہتر نظر آیا۔ پاکستانی، جاپانی، امریکی اور افغانی کرنسی کے تقابل سے انھوں نے یہ واضح کیا کہ سب سے زیادہ قدر امریکی کرنسی ڈالر کی ہے پھر جاپانی کرنسی ین کی، اس کے بعد پاکستانی کرنسی روپے کی اور سب سے آخر میں افغانستان کی کرنسی افغانی کی۔ پاکستان اور جاپان کے معاشی نظام میں انھیں یہ اشتراک نظر آیا کہ پاکستان کی طرح جاپان میں بھی لوگ روپوں کی بجائے پیسوں میں کاروبار کرتے ہیں۔ مہنگائی کے حوالے سے انھیں بنگلہ دیش کے مقابلے میں پاکستان میں صورتحال زیادہ بہتر نظر آئی۔

مذہب کے تقابل میں انھیں عقیدے کی پختگی کے اعتبار سے تو پاکستانی جاپانیوں سے بہتر نظر آئے تاہم توہم پرستی، روحانیت، مذہبی تہوار اور تبلیغی طریقوں کے حوالے سے ان میں زیادہ تر اشتراک کے پہلو نظر آئے۔ شہروں کے تقابل میں انھیں لاہور، دہلی، آگرہ، خورجہ، قصور اور کینڈی میں اشتراک نظر آیا کہ یہ شہر کسی نہ کسی خصوصیت کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ سیلون اور لاہور شہر میں انھیں یہ اشتراک بھی نظر آیا کہ ان ثقافتی مراکز میں سیاح صرف قابلِ دید مقامات کی سیر کو جاتے ہیں۔ دیہات کے تقابل میں انھیں پاکستان اور چین کے نواحی علاقے بظاہر دیکھنے میں تو ایک جیسے معلوم ہوئے البتہ چین کے نواحی علاقے میں طرزِ زندگی انھیں نسبتاً پسماندہ نظر آئی۔ سڑکوں کے تقابل میں ناقص معیار کے سبب انھیں پاکستان اور فلپائن کی سڑکوں میں رش اور بھیڑ کے باعث پاکستان اور کوریا کی سڑک میں رونق اور چہل قدمی کے اعتبار سے انگلستان کی الفنسٹن اسٹریٹ، گنز ااسٹریٹ اور لاہور کی انارکلی میں اشتراک نظر آیا۔ بازاروں کے تقابل میں انھیں بازار کی نوعیت، دکانوں کی اقسام اور صفائی کی صورتحال کے حوالے سے پاکستان، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ میں اشتراک اور اختلاف کے پہلو نظر آئے۔

محنت کشوں کے تقابل میں انھیں پاکستان کے محنت کش سری لنکا اور روس کے محنت کشوں سے بہتر نظر آئے۔ آثار

قدیمہ میں وہ پاکستان کی برتری مصر، عراق اور یونان پر واضح کرتے ہیں۔ اسی طرح جانور پرستی کے حوالے سے بھی انھیں پاکستان اور سری لنکا میں اختلاف کی صورت نظر آئی۔ اخبارات کی اشاعت، خبروں کی نوعیت و دائرہ کار، ضخامت، غیر معیاری لٹریچر، کالم نگاروں کی قدر افزائی، اندازِ تحریر اور ستاروں کے علم کے حوالے سے پاکستان، چین، جاپان، امریکہ اور فلپائن میں کہیں اشتراک اور کہیں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

رسم الخط کے تقابل میں انھیں اردو، سنگھالی، ہندی، جاپانی، چینی، ملائیشیا اور انڈونیشیا کی زبان میں اختلاف کے پہلو نظر آئے۔ لہجے کے اعتبار سے بھی انھیں اردو، چینی اور سنگھالی زبان میں اختلاف کی صورت ہی نظر آئی، تاہم جاپانی زبان اور پاکستان کی علاقائی زبان پنجابی میں انھیں اس حوالے اشتراک کا پہلو نظر آیا۔

الغرض انشؔا کو پاکستان اور مشرق بعید کے ممالک کی معاشرت کے تقابل میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو نظر آئے۔

مشرق وسطیٰ کے سفر ناموں میں ایران، عراق، شام، مصر، سعودی عرب، لبنان اور دیگر مشرقی اور مغربی ممالک کا تذکرہ ملتا ہے۔ موسم کے حوالے سے انھیں ایران اور پاکستان کے موسم گرما میں یہ اشتراک نظر آیا کہ کراچی اور طہران میں گرمی کی شدت بالکل ایک جیسی تھی۔ آبادی کے حوالے سے انھیں پاکستان، بھارت اور ایران میں اختلاف کا پہلو نظر آتا ہے کیونکہ لاہور اور دہلی کی آبادی تو زیادہ تھی لیکن اصفہان شہر کی آبادی بہت کم، اس بات کا اندازہ انھیں اصفہان شہر کے بازار دیکھ کر ہوا۔

پاکستانی اور مصری باشندوں میں انھیں یہ اختلاف نظر آیا کہ مصری باشندے پاکستانی باشندوں کے مقابلے میں زیادہ فربہ ہوتے ہیں۔ لباس کے حوالے سے انھیں پاکستان، ترکی اور ایران کے باشندوں میں یہ اختلاف نظر آتا ہے کہ ترکی ٹوپی کو جو مقام پاکستان میں حاصل ہے وہ ترکی میں بھی حاصل نہیں ہے۔ ایران اور پاکستان کے مسلمانوں کے لباس میں انھیں یہ فرق نظر آیا کہ پاکستانی مسلمان تو اسلامی لباس پہنتے ہیں اور داڑھی رکھتے ہیں لیکن ایرانی مسلمان نہ تو اسلامی لباس پہنتے ہیں اور نہ ہی داڑھی رکھتے ہیں۔

خوراک کے حوالے سے انھوں نے پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کا تقابل کیا۔ اس تقابل میں انھیں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔ روٹی کی دستیابی، اقسام، نوعیت، پیشکش، کھانے کے طریقۂ کار اور غذائی عادات کے حوالے سے انھیں پاکستان اور ایران میں اختلاف کے پہلو نظر آئے۔ انھیں یہ بھی پتا چلا کہ ایرانی لوگ رات کا کھانا عموماً باہر کھاتے ہیں جبکہ پاکستانی لوگ گھر میں کھانا کھاتے ہیں۔ مشروبات میں چائے کے حوالے سے انھیں پاکستان اور ایران میں اس مشروب کے ذائقے، اجزائے ترکیبی، پیشکش کے انداز اور قیمت غرض ہر حوالے سے اختلاف کا پہلو ہی نظر آیا۔ البتہ ٹھنڈے مشروب لسی کے نام، دستیابی، پیشکش کے انداز اور طریقۂ استعمال کے لحاظ سے انھیں پاکستان، ایران اور

ترکی میں کہیں اشتراک اور کہیں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔ پھلوں میں انھوں نے پاکستانی سردے اور ایرانی خربوزے کا تقابل کیا اور اس تقابل میں انھیں ان دونوں پھلوں کے نام، ذائقے اور نوعیت کے اعتبار سے صرف اختلاف کے پہلو ہی نظر آئے ۔ انشاؔ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ کئی مٹھائیاں اور کھانے ایسے ہیں جو پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک میں بالکل ایک جیسے ہیں لیکن ان کے نام مختلف ہیں ۔ ایران قیام کے دوران انھوں نے اس بات کا مشاہدہ بھی کیا کہ ہمارے ملک کے بازاروں کی طرح وہاں بھی سڑک کے کنارے پر کباب کی دکانیں ہوتی ہیں البتہ ان دکانوں میں موجود ساز و سامان اور دکانداروں کے لباس میں انھیں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے خطے میں بسنے والے لوگوں کی عادات و اطوار میں انھیں زیادہ تر اختلاف کے پہلو ہی نظر آئے ۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایرانی مسلمان صرف جمعہ کے جمعہ غسل کرتے ہیں جبکہ پاکستانی مسلمان جمعہ کے علاوہ بھی غسل کرتے ہیں ۔ وقت کی پابندی کے حوالے سے انھیں پاکستان اور ایران میں اشتراک نظر آیا۔ اسی طرح مصر کے لوگ انگلی سے اشارہ کرنے کو برا سمجھتے ہیں لیکن پاکستانی لوگ اسے برا نہیں سمجھتے ۔ صفائی ستھرائی کے حوالے سے انھیں ہالینڈ اور بیلجیم میں صورتحال بہتر نظر آیا۔

اخلاقی اعتبار سے انھیں پاکستان کے مقابلے میں مصر، ایران اور ترکی کے باشندے سے زیادہ بہتر نظر آتے ہیں البتہ چوری اور اسمگلنگ جیسے جرائم میں پاکستان، جاپان اور سری لنکا کے باشندے ملوث نظر آئے ۔ سماجی اقدار کے تقابل سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ دوستی نبھانے میں پاکستانی لوگ اپنی مثال آپ ہیں اسی طرح شوہر کی خدمت اور عزت و احترام کے حوالے سے انھیں پاکستان اور بھارت کی خواتین افغانستان، ایران اور دیگر عرب ممالک کی خواتین سے بہتر نظر آتی ہیں ۔ اہل علم کی قدر افزائی کے حوالے سے انھیں مصر میں صورتحال تو بہت تسلی بخش نظر آتی ہے لیکن پاکستان میں اس حوالے سے حالات بہت مایوس کن نظر آتے ہیں ۔

پھر انھوں نے ایران اور پاکستان کے بازاروں کا تقابل بھی کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ لفظ بازار نہ صرف پاکستان اور ایران میں مختلف معانی رکھتا ہے بلکہ ایران کے بازار جدید طرز تعمیر، ظاہری نقشے، صفائی کی صورتحال، اشیاء کی اقسام، تعداد اور پیکنگ غرض ہر حوالے سے انھیں پاکستانی بازاروں سے بہتر نظر آئے ۔ البتہ ایرانی سیلز خواتین کے مقابلے میں انھیں یورپی دکانداروں کا طرز عمل زیادہ بہتر نظر آیا اور بھاؤ تاؤ کرنے میں پاکستانی لوگ انھیں ایرانی لوگوں سے ماہر نظر آئے ۔

انشاؔ نے پاکستان، مصر، لبنان، ایران اور کئی دیگر ممالک کے ہوٹلوں اور بھٹیار خانوں کا تقابل بھی کیا ۔ مصر اور پاکستان کے ہوٹلوں میں انھیں یہ اشتراک نظر آیا کہ ان میں مسافروں اور سیاحوں کو حلال اشیاء کے ساتھ ساتھ حرام اشیاء بھی فراہم کی جاتی ہیں ۔ اسی طرح لبنان کے اسلامی ہوٹل سقفقور الجدید اور کرسچن ہوٹل ساں بعل میں کراچی کے ہوٹلوں کی طرح سہولیات کی عدم دستیابی کی صورتحال نظر آئی البتہ یورپی ممالک کے ہوٹل اس حوالے سے انھیں بہتر نظر آئے ۔ ایران اور

پاکستان میں انھیں یہ اشتراک نظر آیا کہ ان دونوں ممالک میں سڑک کے دونوں طرف درمیانے اور ادنیٰ درجے کے ہوٹل موجود ہوتے ہیں۔ تاہم ایران کے شہر اصفہان کا بھٹیار خانہ انھیں اپنے جدید طرز تعمیر، آرائشی سامان اور فرنیچر غرض ہر حوالے سے پاکستانی سراؤں سے بہتر نظر آیا۔ سڑکوں کے تقابل میں انھیں ایران کی سڑکیں صفائی، کشادگی، فٹ پاتھ اور سایہ دار درختوں کی موجودگی کے حوالے سے پاکستان کی سڑکوں سے بہتر نظر آئیں۔

محکمۂ ڈاک کے تقابل میں انھیں ایران کے ڈاک کا نظام پاکستان کے ڈاک کے نظام سے ڈاک خانوں کی جا بجا موجودگی، لفافوں اور ٹکٹوں کی عام دستیابی اور ڈاکیوں کی انگریزی زبان سے واقفیت کے سبب زیادہ بہتر نظر آیا۔ ایران کے معاشی نظام سے پاکستان کا معاشی نظام بھی انھیں زیادہ بہتر نظر آیا البتہ دونوں ممالک میں استعمال ہونے والی کاروباری زبان انھیں ایک جیسی لگی۔ ذرائع آمدورفت کے تقابل میں انھیں ایران کے ٹیکسی ڈرائیوروں اور پاکستان کے تانگے والوں کے طرز عمل میں یہ اشتراک نظر آیا کہ دونوں ہی سواریوں کو زبردستی اپنی گاڑیوں میں بٹھاتے ہیں۔ پاکستان اور دمشق کے ذرائع آمدورفت کے تقابل میں انھیں یہ اشتراک نظر آیا کہ دونوں ہی ملکوں میں آمدورفت کے لئے ٹرک استعمال کیے جاتے ہیں اور ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی نصیحت یا مقولہ ضرور لکھا ہوتا ہے۔ پاکستان، ایران، انگلستان اور بنگلہ دیش کے ذرائع آمدورفت کی ساخت کا تقابل کرتے ہوئے وہ یہ کہتے ہیں کہ پاکستانی رکشے، ایرانی سواری ورشکہ اور بنگلہ دیشی رکشا سے برطانوی وکٹوریا زیادہ بہتر سواری ہے کیونکہ باقی سواروں میں تو تین پہیے ہوتے ہیں لیکن وکٹوریا میں چار پہیے ہوتے ہیں جو اس سواری کا توازن بہتر طور پر قائم رکھتے ہیں۔

فنون لطیفہ کے تقابل میں وہ موسیقی، فن تعمیر اور شاعری کے حوالے سے پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس تقابل میں بھی اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو نظر آتے ہیں۔ موسیقی کے آلات اور فن کاروں کی اجرت کے حوالے سے جب وہ پاکستان اور یورپی ممالک کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں دونوں حوالوں سے یورپی ممالک میں صورتحال زیادہ بہتر نظر آتی ہے۔ فن تعمیر کے حوالے سے انھیں ایرانی عمارت مدرسہ چہار باغ اور بہاولپور ریلوے اسٹیشن کی عمارت میں قبوں کی موجودگی کے حوالے سے اشتراک نظر آیا۔ اس کے علاوہ دونوں ممالک کی مساجد کی ظاہری وضع میں تو انھیں اختلاف نظر آیا تاہم پاکستان کی مسجد اختر الایمان اور ایران کی جامع مسجد میں بدحالی اور خستگی کے حوالے سے اشتراک کی صورت نظر آئی۔

پاکستان اور بھارت کی شاعری کی تقابل میں انھیں یہ اختلاف نظر آیا کہ بھارت کی شاعری میں زنانہ پن غالب ہے اور پنجاب کی لوک شاعری میں مردانہ پن، پاکستان اور بھارت کی زبان میں انھیں اشتراک کی یہ صورت نظر آئی کہ دونوں ممالک میں قومی زبان کے ساتھ ساتھ کچھ علاقائی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ اردو اور فارسی زبان کے تقابل سے انھیں یہ پتا چلا کہ ان دونوں زبانوں میں عربی، فرانسیسی اور انگریزی زبان کے لفظ موجود ہیں البتہ عربی الفاظ کے معانی ان

دونوں زبانوں میں مختلف ہیں۔ بہرحال انشا کو پاکستان اور مشرق وسطیٰ کی معاشرت میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔

یورپ اور امریکہ کے سفرناموں میں جرمنی، فرانس، ہالینڈ، ڈنمارک اور کئی دیگر ممالک کا تذکرہ ملتا ہے۔ موسم اور آب وہوا کے تقابل میں انھیں پاکستان، جرمنی، فرانس، ہالینڈ اور ڈنمارک کے موسم میں یہ اختلاف نظر آیا کہ ان ممالک کے موسم کی ترتیب میں فرق ہے اور اشتراک کی صورت یہ نظر آئی کہ ان ممالک کے موسم میں غیر متوقع تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ بارش کے حوالے سے انھیں پاکستانی اور انگریز قوم کے اندازِ فکر اور جوش وخروش میں بھی اختلاف کا پہلو نظر آیا اور یہ بھی پتا چلا کہ سوئٹزرلینڈ میں بارش کی مقدار زیادہ ہونے کے سبب وہاں سبزے وہریالی اور جنگلی حیات کی صحت پاکستان کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے۔ وقت کے حوالے سے انھیں پاکستان، انگلستان اور امریکہ میں اختلاف کا پہلو نظر آتا ہے اور اس اختلاف کا اثر انھیں ان ممالک کے لوگوں کی سوچ اور معاملات زندگی پر بھی نظر آتا ہے۔ جغرافیائی عناصر کے تقابل میں وہ انگلستان کے مشہور دریائے ٹیمز کا تقابل لیاری کے ایک نالے سے کرتے ہیں اور دونوں میں گندگی اور غلاظت کے حوالے سے انھیں اشتراک کا پہلو نظر آتا ہے۔

انھوں نے پاکستان، انگلستان، امریکہ اور کئی دیگر ممالک کے لوگوں کا تقابل حسن وخوبصورتی کے حوالے سے بھی کیا۔ اس حوالے سے انھیں پاکستان اور بھارت کے لوگ دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ خوبصورت نظر آتے ہیں۔ پاکستان اور انگلستان کے لوگوں میں انھیں یہ اشتراک نظر آتا ہے کہ دونوں ہی ممالک کے کچھ لوگ عجیب وغریب وضع قطع اختیار کرتے ہیں۔ جرمن لوگ پاکستانی لوگوں سے اس لیے بہتر نظر آتے ہیں کہ وہ حقیقت شناس ہوتے ہیں۔ پاکستان اور ڈنمارک کے لوگوں میں انھیں یہ خامی نظر آتی ہے کہ دونوں ہی اپنے ملک کے قابل دید مقامات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ پاکستان اور ڈنمارک کے لوگوں میں انھیں یہ اختلاف نظر آتا ہے کہ پاکستانی لوگ ڈنمارک کے لوگوں کے مقابلے میں جلد سویرے اٹھتے ہیں۔ جب وہ پاکستان کے پٹھانوں اور جرمن لوگوں کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں پتا چلتا ہے کہ جرمن لوگ پٹھانوں کی طرح سادہ طبیعت ہوتے ہیں۔

اخلاقی اعتبار انھیں پاکستانی باشندے دنیا کے تقریباً تمام لوگوں سے بدتر نظر آتے ہیں۔ ایثار وقربانی کے حوالے سے انھیں پاکستانیوں اور انگریزوں کی نسبت چینی لوگ بہتر نظر آتے ہیں، گداگری کی لعنت میں پاکستان اور ہالینڈ دونوں کے لوگ ملوث نظر آتے ہیں۔ البتہ فرائض سے غفلت، بے ایمانی، رشوت اور جھوٹ جیسے جرائم پاکستان اور انگلستان دونوں کے باشندوں سے سرزد ہوتے ہیں۔ البتہ ملاوٹ کا کاروبار صرف انھیں پاکستان میں ہی نظر آیا۔ سماجی اقدار میں عفت وحیا، رشتوں کا احترام اور خواتین کے عزت واحترام کی صورتحال انھیں پاکستان میں بہتر نظر آئی۔

خوراک کے حوالے سے وہ پاکستان میں پائے جانے والے کیلے کا تقابل پرتگال اور یونان میں پائے جانے

والے کیلوں سے کرتے ہیں تو ذائقے کے اعتبار سے انھیں پاکستانی کیلا ان دونوں ممالک کے کیلوں سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ پھل کے علاوہ انھیں پاکستانی کھانے برگر اور انگلستان کے مشہور کھانے وپھی کے اجزائے ترکیبی، ذائقے، بنانے اور پیشکش کے انداز میں اشتراک کا پہلو نظر آتا ہے۔

پاکستان اور انگلستان کے لوگوں کے طرز زندگی میں انھیں یہ اختلاف نظر آیا کہ یورپ میں ہر شخص اپنا کام خود کرتا ہے اور جدید سہولیات سے استفادہ کرتا ہے جبکہ پاکستان میں ایسا نہیں کیا جاتا۔ صفائی کی صورتحال انھیں پاکستان کے مقابلے میں یورپ میں بہتر نظر آئی۔

پاکستان اور انگلستان کے سیاسی نظام میں انھیں بادشاہت، سلور جوبلی تقریبات، اقتدار کے حصول اور گول میز کانفرنس کے حوالے سے تو اشتراک کا پہلو نظر آیا البتہ اقتدار کے انتقال اور بادشاہوں کے نام کے حوالے سے اختلاف کا پہلو نظر آیا۔ پاکستان کے معاشی نظام سے انگلستان کا معاشی نظام انھیں بہتر نظر آیا۔ اس نظام میں اختلاف کی صورت انھیں ان دونوں ممالک کی کرنسیوں کی قدر و قیمت اور وزن کے حوالے سے نظر آئی تاہم مہنگائی کے حوالے سے انھیں جرمنی، انگلستان اور امریکہ کے مقابلے میں پاکستان میں صورتحال زیادہ بہتر نظر آئی۔ پاکستان اور یورپی ممالک کے نظام تعلیم کے تقابل سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہمارے ہاں زیادہ تر شعر و شاعری پر زور دیا جاتا ہے اور یورپ میں سائنسی علوم پر۔ انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں اوایل ٹیسٹ کے ذریعے بچوں کے فطری رجحان کا اندازہ لگایا جاتا ہے جبکہ ہمارے ہاں ایسا نہیں کیا جاتا۔ وہاں کتابوں کی فہرست بندی کا طریقہ بھی پاکستان کے مقابلے میں زیادہ سادہ اور آسان ہے۔ پاکستان، جرمنی، ہالینڈ اور سوئٹزرلینڈ میں استعمال ہونے والے ذرائع آمدورفت کے تقابل میں انھیں جرمنی، ہالینڈ اور سوئٹزرلینڈ میں استعمال ہونے والے ذرائع آمدورفت کی ساخت زیادہ بہتر معلوم ہوئی۔ پاکستان اور سوئٹزرلینڈ کے لوگوں میں انھیں یہ اشتراک نظر آیا کہ دونوں ہی ریل میں سفر کے دوران بہت گند ڈالتے ہیں اور اختلاف یہ نظر آیا کہ پاکستانی لوگ بغیر ٹکٹ کے بھی سفر کرتے ہیں لیکن سوئٹزرلینڈ کے لوگ ایسا نہیں کرتے۔ علاج معالجہ کے حوالے سے انھیں انگلستان، امریکہ اور جرمنی میں امراض کی تشخیص، علاج کے طریقہ کار اور دستیاب سہولتوں کی صورتحال زیادہ بہتر نظر آتی ہے البتہ ڈاکٹروں کا طرز عمل اور دانتوں کے علاج کی سہولیات انھیں پاکستان میں بہتر نظر آتی ہیں۔

تفریحی ذرائع کے تقابل میں انھیں پاکستان ٹیلی ویژن کا پروگرام نیلام گھر اور لندن ٹیلی ویژن کا پروگرام دی سیل آف دی سنچری اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ دونوں ہی معلوماتی پروگرام ہیں۔ البتہ ان دونوں پروگراموں میں میزبانوں کے کمپیئرنگ کے انداز، مددگار لڑکیوں کے لباس، انعامات کی تعداد و تقسیم، مالیت اور نوعیت کے حوالے سے انھیں اختلاف کا پہلو نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ انھیں یہ اختلاف بھی نظر آتا ہے کہ ان دونوں ممالک کا ناظرین کسی پروگرام کو یا تو بہت پسند کرتے ہیں یا بالکل نہیں کرتے۔ اشتہارات کے حوالے سے انھیں پاکستان اور امریکہ

کے ٹیلی ویژن میں یہ اختلاف نظر آیا کہ ہمارے ہاں تو پروگرام کے دوران اشتہار نشر کیے جاتے ہیں لیکن امریکی ٹیلی ویژن میں خبروں جیسے اہم پروگرام کے دوران بھی اشتہارات پیش کیے جاتے ہیں ۔فلموں کے تقابل میں ان کی تعداد کے حوالے سے انھیں پاکستان، بھارت اور انگلستان میں اختلاف کا پہلو نظر آتا ہے ۔ایکشن فلموں کے تقابل میں اوورایکٹنگ، فحاشی و عریانی، حقیقت سے دوری، حب الوطنی کے جذبے کے اظہار کے حوالے سے پاکستان اور امریکہ کی فلموں میں تو اشتراک نظر آیا البتہ فحاشی اور عریانی کے حوالے سے ایرانی فلموں میں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔

شہروں اور دیہات کے تقابل سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پاکستان میں کسی جگہ کو تلاش کرنا آسان ہے اور انگلستان اور فرانس میں کسی جگہ کو تلاش کرنا مشکل، کیونکہ انگلستان میں کسی جگہ کے نام کے ساتھ گارڈن یا پارک کا اضافہ کر دیا جاتا ہے اور فرانس میں ایک ہی نام کی کئی جگہیں ہوتی ہیں ۔انھوں نے پاکستان، ہالینڈ، جرمنی، ٹوکیو اور فرانس کے ہوٹلوں کا تقابل بھی کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جرمنی اور ٹوکیو کے ہوٹل سب سے اچھے ہیں اور ہالینڈ کے ہوٹل تو پاکستان کے ہوٹلوں سے بھی گئے گزرے ہیں ۔ پاکستانی ہوٹلوں میں کھانے پینے کی اشیاء فرانس کے ہوٹلوں سے بہتر مہیا کی جاتی ہیں ۔ بازاروں کے تقابل میں وہ پاکستان اور انگلستان کے بازاروں کا تقابل کرتے ہیں جس میں انھیں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو ہی نظر آتے ہیں ۔لیسٹر اور برمنگھم کے بازاروں میں گوشت اور مٹھائیوں کی دکانیں زیادہ تر انھیں پاکستانی دکانداروں کی نظر آئیں البتہ ان دکانوں میں صفائی کی صورتحال، گوشت کی نوعیت، انتخاب، پیشکش کا انداز، قیمت، دستیاب سہولیات اور قصائیوں کا طرز عمل انھیں پاکستان کے مقابلے میں زیادہ بہتر نظر آیا۔انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں کریانہ کی دکانوں میں پاکستانی مصالحہ جات اور دیگر خورد و نوش کی اشیاء با آسانی مل جاتی ہیں اور دونوں ممالک کے دکاندار گاہکوں کو سیل یا رعایتی واؤچر کا لالچ دے کر بے وقوف بناتے ہیں ۔

پاکستان اور انگلستان کے اردو اخبارات کے تقابل سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ انگلستان کے اردو اخبارات خبروں کی صحت اور متوازی انداز فکر کے اعتبار سے پاکستانی اخبارات سے بہتر ہیں ۔ پاکستانی محنت کش جس میں قلی ٹیکسی ڈرائیور اور حجام شامل ہیں انگلستان، روس اور ہالینڈ کے محنت کشوں سے بہتر نظر آتے ہیں کیونکہ یہ لوگ کام زیادہ کرتے ہیں، اجرت کم مانگتے ہیں، بخشش کا تقاضا نہیں کرتے اور بدتمیزی کا مظاہرہ بھی نہیں کرتے ۔امن و امان کے حوالے سے انھیں یہ جان کر حیرانی ہوتی ہے کہ پاکستان کے مقابلے میں امریکہ میں زیادہ حادثات ہوتے ہیں ۔ مذہبی اعتبار سے جب وہ اسلام اور عیسائیت کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں گناہوں کو معاف کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور عیسائیت میں پادریوں کے پاس ۔ مذہبی جوش و جذبے کے حوالے سے انھیں پاکستانی مسلمانوں اور امریکی عیسائیوں میں یہ اشتراک نظر آیا کہ یہ لوگ مذہبی عبادت گاہیں تو بڑے شوق سے تعمیر کرتے ہیں لیکن ان میں عبادت نہیں کرتے اس کے علاوہ یہ لوگ اپنے مذہبی تہوار پر مخصوص کھانے بھی پکاتے ہیں ۔ پاکستانی مسلمان عید پر سویاں پکاتے ہیں اور امریکی

عیسائی تھینکس گیونگ ڈے کے موقع پر صرف ٹر کی ہی پکاتے ہیں۔ مذہبی اعتبار سے وضع قطع کے حوال سے انھیں یہ اختلاف نظر آیا کہ داڑھی رکھنے کو ہمارے ہاں مستحسن سمجھا جاتا ہے لیکن یورپ میں آوارگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

تاریخی ورثے کے اعتبار سے بیل گاڑی کو وہ دنیا کی سب سے قدیم اور انوکھی چیز قرار دیتے ہوئے اور اس حوالے سے پاکستان کی برتری ثابت کرتے ہیں۔ تاہم لندن کے نیچرل ہسٹری میوزیم میں موجود درخت کو وہ پاکستان کے تمام درختوں سے قدیم قرار دیتے ہیں۔ دنیا کے اکثر ممالک میں بھانڈ موجود ہوتے ہیں وہ پاکستانی بھانڈوں کو افریقہ کے بھانڈوں سے زیادہ ماہر سمجھتے ہیں کیونکہ وہ جھوٹ بولنے اور بے ایمانی کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

فنون لطیفہ کے تقابل میں شاعری کے حوالے سے انھیں پاکستان، انگلستان اور ہندوستان کی شاعری میں یہ اختلاف نظر آیا کہ پاکستان اور بھارت کی شاعری میں اشعار کے کئی رخ ہوتے ہیں لیکن انگریزی شاعری میں اشعار کے کئی رخ نہیں ہوتے۔ موسیقی کے حوالے سے انھیں پاکستان اور ویانا میں یہ اختلاف نظر آیا کہ ویانا میں موسیقاروں کی بہت قدر افزائی کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موتسارٹ، بیتھوون، باخ اور شوبرت کے مجسمے ویانا میں ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں جبکہ پاکستان میں موسیقاروں کی قدر افزائی نہیں کی جاتی۔ انھیں یہ بھی پتا چلا کہ ویانا میں ریڈیو اور فلم کمپنیوں کے علاوہ لوگ بھی موسیقاروں اور فنکاروں کی مالی اعانت کرتے ہیں جبکہ پاکستان میں صرف ریڈیو اور فلم کمپنیوں ہی کو فنکاروں کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ ظروف سازی، نقش کاری اور چینی مٹی کا کام ملتان کی طرح ڈیلفٹ کے علاقے میں بھی نظر آیا۔

زبان کے حوالے سے انھیں فرانسیسی اور جرمن زبان میں اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو نظر آتے ہیں۔ اردو اور فرانسیسی زبان میں انھیں یہ اشتراک نظر آیا کہ دونوں زبانوں کا لکھنا آسان ہے اور پڑھنا مشکل، کیونکہ لکھتے ہوئے ان دونوں میں کچھ الفاظ زیادہ لکھے جاتے ہیں اور پڑھتے ہوئے کچھ الفاظ حذف کر لیتے جاتے ہیں۔ اردو اور جرمن زبان میں انھیں یہ اختلاف نظر آیا کہ دونوں زبانوں کا لہجہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے اس لئے ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں بالکل ایک نئی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اشتراک انھیں یہ نظر آیا کہ دونوں زبانوں میں الفاظ کو جوڑ کر لکھا جاتا ہے۔ یوں انشا کو پاکستان، انگلستان اور امریکہ کی معاشرت کے تقابلی مطالعے میں بھی اشتراک اور اختلاف کے دونوں پہلو نظر آئے۔

المختصر انشا کو پاکستان اور بیرونی دنیا کی معاشرت کے تقابلی مطالعے میں اشتراکات اور اختلافات کے دونوں پہلو ہی نظر آئے۔ ان اشتراکات اور اختلافات سے آگاہ ہونے سے ہم دنیا میں پھیلے ہوئے معاشروں کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ یہ اشتراکات اور اختلافات انھیں تاریخ، جغرافیہ، وقت، موسم و آب و ہوا، آبادی، مذہب، زبان، لباس، رنگ و نسل، عادات واطوار، خوراک، طرزِ زندگی، تفریحات، فنونِ لطیفہ، اخلاقی وسماجی اقدار، علاج معالجہ، نظام تعلیم، سیاسی ومعاشی نظام، ہوٹل وسرائیں، شہر و دیہات، ذرائع ابلاغ، ذرائع آمدورفت، محکمہ ڈاک، محنت کش طبقہ، سماجی رویوں، رشتوں کے احترام، شکست وریخت، مادی وروحانی زاویہ ہائے نظر کے حوالے سے نظر آئے۔ ان مذکورہ عناصر میں سے کچھ کے در پردہ ہمیں

فطرت کی کارفرمائی نظر آئی اور بعض کا سبب خود انسان ہی معلوم ہوا۔ البتہ ان اشتراکات اور اختلافات کی وجہ یکسانیت اور تنوع کا وہ مادہ ہے جو فطرت کا خاصہ ہے اور اس کی تخلیق انسان کا بھی۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

۱۔ ابن انشا،آوارہ گرد کی ڈائری، طبع دوازدہم، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۸۵ء

۲۔ ابن انشا،ابن بطوطہ کے تعاقب میں، طبع سیزدہم، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۹۱ء

۳۔ ابن انشا،دنیا گول ہے، طبع بست ویکم، ، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۱ء

۴۔ ابن انشا،اس بستی کے اک کوچے میں، ، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۷ء

۵۔ ابن انشا،چاند نگر، طبع ۲۱، ، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۹ء

۶۔ ابن انشا،دل وحشی، طبع ۳۱، ، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۹ء

۷۔ ابن انشا،نگری نگری پھرا مسافر، طبع دہم، ، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۹ء

۸۔ ابن انشا،چلتے ہو تو چین کو چلیئے، طبع سوم، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۲۰۱۰

مصنف کے بارے میں کتب

۱۔ اے حمید،ابن انشا، یادیں باتیں، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء

۲۔ اے حمید،ابن انشا شخصیت اور فن، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۸ء

۳۔ ریاض احمد، ڈاکٹر،ابن انشا احوال وآثار، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۸ء

ثانوی مآخذ

۱۔ فتح محمد، ملک،انداز نظر، لاہور، التحریر، ۱۹۸۰ء

۲۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر،اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، لکھنؤ، نصرت پبلشرز، ۱۹۸۷ء

۳۔ حامد بیگ، مرزا، ڈاکٹر،اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء

۴۔ انور سدید، ڈاکٹر،اردو ادب میں سفر نامہ، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء

۵۔ ہری اودھ (مترجمہ: سرسوتی سرن کیف)بھگت کبیر فلسفہ وشاعری، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۲ء

۶۔ جمال، پانی پتی (انتخاب وترتیب)،عالی کلام، طبع اول، کراچی، اکادمی بازیافت، ۲۰۰۲ء

۷۔ نوازش علی، ڈاکٹر (مرتب)،پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال، طبع دوم، راولپنڈی، گندھارا اسٹاکسٹ، ۲۰۰۲ء

رسائل

۱۔ پرویز پروازی، ڈاکٹر، ''سفرنامہ کی تاریخ اور اس کا فن''، مشمولہ ماہنامہ اوراق، شمارہ جون۔ جولائی، ۱۹۸۹ء مدیر، ڈاکٹر وزیر آغا، لاہور، دفتر اوراق چوک اردو بازار لاہور۔

۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو سفرنامے کے نئے اور پرانے نام''، مشمولہ ماہنامہ اوراق، سالنامہ، جنوری۔ فروری، مدیر، ڈاکٹر وزیر آغا، لاہور، دفتر اوراق چوک اردو بازار، لاہور

انٹرنیٹ

*His Tears to Thamasis*By Robert Herrick

http:/www.poetryatlas.com/poetry.poem.2760

Date, 10 March 2013, 4:04 P.M